۱۹۶۶ء کے منتخب افسانے

سال کے بہترین افسانے

ریاض احمد چودھری

میری لائبریری

۱۹۶۶ء کے منتخب افسانے

میری لائبریری

(۱۴۷)

میری لائبریری میں افسانے کی دوسری کتابیں

۱۹۶۳ء کے منتخب افسانے مرتب ڈاکٹر احراز نقوی

۱۹۶۴ء ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״

۱۹۶۵ء ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״

۱۹۶۶ء ״ ״ ״ ״ ناصر زیدی

۱۹۶۸ء ״ ״ ״ ״ ناصر زیدی

میرزا ادیب کے بہترین افسانے مرتب پروفیسر عرش صدیقی

احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے ״ مظفر علی سید

اُفق سے اُفق تک آغا اشرف

لمحوں کے بھنور ״ ״

ادھ کھایا امرود خان فضل الرحمٰن بمقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی

خوشبو کے گھاؤ نوید انجم

درد آئے گا دبے پاؤں ذکاء الرحمٰن

حریف آدم نصیر احمد ناصر۔ مقدمہ سید وقار عظیم

آگ اور سائے سحر یوسف زئی

فاصلے عفرہ بخاری

شفق کے سائے سید غلام الثقلین نقوی مقدمہ ڈاکٹر وزیر آغا

چنار کی چھاؤں میں لطیف کاشمیری۔ مقدمہ میرزا ادیب

لہریں، پرواز، حقیقتیں، مزید حقیقتیں شفیق الرحمٰن

۱۹۶۶ء کے منتخب افسانے

مرتب : ریاض احمد چودھری

ایم — اے

ایڈیٹر، سویرا لاہور

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

میری لائبریری میں پہلی بار،

ناشر : بشیر احمد چودھری

ڈائریکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع : پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ترتیب

ابتدائیہ

اردو افسانہ ایسا ننھا نادان بھی نہیں۔ اردو نثر کے مقابلے میں کم سہی، لیکن پریم چند سے بھی گنیں تو یہ ستر سال کا ہے۔ زبانوں کی زندگی میں اتنی مدت کسی شمار قطار میں نہ ہو، انسانی زندگی کے حساب سے دیکھیں تو سات دہائیوں پر مشتمل یہ عرصہ کم نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس دوران میں اردو افسانے نے عالمِ طفلی سے پختہ عمری تک کی منزلیں اس تیزی سے طے کی ہیں کہ اردو زبان اپنی اس صنفِ ادب پر ناز کر سکتی ہے، دنیا کے بہترین افسانوی ادب کے مقابلے میں ہم اپنے افسانوں کو بلا پس و پیش لا سکتے ہیں۔

غزل کی طرح افسانے پر بھی پیمبری وقت آتا رہا ہے۔ نئی نظم کے جھکڑوں میں غزل کا شعلۂ تاباں مسلسل فروزاں رہا ہے، اسی طرح اسلامی، تاریخی، رومانی، جاسوسی، جنسی اور بظاہر عورتوں کے لکھے ہوئے زنانہ ناموں والے ناولوں کی یلغار کے سامنے افسانہ ہمیشہ سینہ سپر رہا ہے اور اس کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ رسائل و جرائد کا بازار تو آج بھی اسی کے دم سے گرم ہے۔

۶۶ء میں ہمارے تقریباً تمام بڑے افسانہ نگاروں نے شاندار افسانے لکھے اور اپنا مقام بنائے رکھا، افسانے کی دنیا میں چند نئے ناموں کو بھی اعتبار نصیب

تھا۔ اس طرح ایک ایسا منظر ہمارے سامنے ہے جو دل کو، افسانے کے بارے میں حوصلہ دلاتا ہے۔ پرانے درختوں کے پہلو میں نئے پودے پھل دینے لگے ہیں۔ یہ ہمارے افسانے کی خوش بختی ہے۔

انتخاب میں ذاتی پسند کا دخل بقدرِ ضرورت ہے۔ اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ قارئین کو ان کے پسندیدہ فن کاروں کی معیاری تخلیقات یکجا مہیا کر دی جائیں۔ ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو اس انتخاب سے اختلاف ہو، اسے ان کی مجبوری سمجھنا چاہئے۔ وجہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ سارے سال کے ادب پر نظر رکھتے ہیں۔ جو چند تحریریں ان کی نظر سے گزر جاتی ہیں وہ ان کو حرزِ جان بنائے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں سے انتخاب کی خانہ پُری کر دی جائے۔

یہ امکان بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو انتخاب پسند آ جائے۔ اس کے لئے انہیں افسانہ نگاروں کا ممنون ہونا چاہئے جنہوں نے یہ افسانے لکھے اور ان مدیرانِ جرائد کا جنہوں نے یہ افسانے لکھوائے اور پیش کئے۔

ریاض احمد چودھری

۲۵ را پریل ۱۹۶۷ء

شفیق الرحمان

دجلہ

ایک ویرانے میں ٹامیوں نے بورڈ لگا رکھا تھا۔

بغداد کا راستہ ـــ سو میل تک شمالی مغربی سمت میں جا کر پھر ڈیڑھ دو سو میل مغرب کی طرف نکل جاؤ۔

اس کے آگے پچاس ساٹھ میل تک دائیں بائیں دیکھتے جاؤ، جہاں آبادی نظر آئے یہی بغداد ہو گا۔

بغداد جاتے وقت سفر بالکل اسی قسم کا تھا۔ مجھے بغداد سے زیادہ دجلے کو دیکھنے کا شوق تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے "اُس کے سمندر کی موج دجلہ و ڈینوب و نیل" والا دجلہ عام دریاؤں جیسا ہرگز نہیں ہو گا بڑی ممتاز شخصیت کا مالک ہو گا۔

کافی انتظار کے بعد ایک مجبوری سی ندی نظر آئی۔ روز بولا۔ "آہا دجلہ آگیا"

موٹر ٹھہرا کر اسے قریب سے دیکھا اوپر ٹیلا آسمان تھا، نیچے خشک کناروں کے بیچ میں گارا سا بہہ رہا تھا اور دریاؤں کے قریب پہنچو تو پہلے درختوں کے جھنڈ آتے ہیں اور کچھ نہیں تو نرسل یا سبزہ ہی دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں کناروں پر کچھ بھی نہیں تھا، کنارے بھی پانی کی سطح سے کافی اونچے تھے۔ اگر اندھیرا ہو تو انسان چلتا چلتا سیدھا دجلے میں دھم سے گرے۔ سعدی کا شعر ہے

اگر باراں بہ کوہستاں نہ بارد　　　　به سالے دجلہ گردد خشک رودے

بصرا اور یونٹ کا ساتھ عراق تک تھا، پھر مجھے واپس آنا تھا کئی دنوں کے سفر کے بعد ریت میں آئے ہوئے منزل مقصود پر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ کیمپ ـــــ کمانڈنٹ کی تقریر ہونے والی ہے۔ مجمع میں انگریز، عراقی، ہندوستانی، کرد، آرمینی سب موجود تھے۔ اچھا خاصا بین الاقوامی ہجوم تھا۔ سرخ رنگ کا ایک لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا، پچپن ساٹھ کا ہوگا۔ تبر کی طرح ستا ہوا بے تحاشہ گھنی بھویں اور بڑی بڑی بل کھائی ہوئی مونچھیں جو سفید ہوتی جا رہی تھیں۔ دور سے پتہ چلانا مشکل تھا کہ مونچھیں بڑی ہیں یا بھویں۔ جسم کی ہر جنبش کے ساتھ مونچھیں ہلتیں یا بھویں' یا دونوں۔

"میرا نام برکن ہے اور میں آج صبح آیا ہوں بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ غیر ملکیوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں اور اس نکتے پر میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ آپ میرے لئے اجنبی ہوں تو ہوں لیکن یہ علاقہ اجنبی نہیں ہے۔ چوبیس سال ہوئے جب آپ میں سے بیشتر حضرات چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں یہاں جنگ لڑنے آیا تھا اور کئی برس رہا ـــــ"

ایک وجیہہ شخص نے ان فقروں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

"تب سے میں مشرقِ وسطیٰ میں رہا ہوں اور ان ملکوں کے چپے چپے سے واقف ہوں لہٰذا میرے لئے یہ علاقہ پُراسرار ہرگز نہیں ہے مجھے معلوم ہے کہ بصرے میں نسیم سحری چلتی ہے تو کیا تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ گرد اڑتی ہے بغداد کی بل کھاتی ہوئی سحر انگیز گلیوں میں کیا ہوتا ہے۔ شور و غل مچتا ہے اور مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ موصل کی چاندنی راتوں کے طلسم سے بھی شناسا ہوں ـــ گیارہ بارہ بجے تک گیس گھٹتی

ہیں اور اس کے بعد کتے چاند کی طرف منہ کر کے روتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اپنے ملک کے شہروں سے بھی بخوبی واقف ہوں جب مانچسٹر میں صبح ہوتی ہے تو دھویں اور کہرے کے مارے بھوتے پرندے چہچہانے کی بجائے کھانسنا شروع کر دیتے ہیں اور لندن میں صبح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انگلستان میں سال بھر کے انتظار کے بعد ایک بدھ کو بہار آتی ہے اور پورے دو ہفتوں کے بعد بدھ ہی کے روز موسم بہار ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ مجھے دوسرے اجنبیوں جیسا نہ سمجھیں ——— میں یہاں کچھ عرصے کے لئے ہوں، پھر یہاں گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں میں زندگی گزارنے چلا جاؤں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو آپ کر سکتے ہیں ———"

عربی میں ترجمہ ہوا تو ایک طرف سے آواز آئی ——— "واللہ یا ابو شوارب!"

"یہ کون تھا؟" برٹن نے پوچھا۔

مشکی رنگ کا ایک بدو کھڑا ہو گیا۔

"متشکر یا ابو ملاحت!" برٹن نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔

واللہ واللہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور ہجوم ہنسنے لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جہاں بدو نے برٹن کو مونچھوں کے ابا کہا تھا وہاں اس نے بدو کو نمکینی کے ابا کہہ کر واضح کر دیا کہ وہ یہاں کے رواج سے واقف ہے (کہ انسان کی سب سے نمایاں خصوصیت کے ساتھ ابو لگا کر نام رکھ دیتے ہیں)

اس دن سے برٹن کا نام ابو شوارب پڑ گیا۔

جو شخص ترجمہ کر رہا تھا۔ وہ مقامی باشندوں سے بالکل مختلف تھا۔ ماتھے پر تیوری چڑھائے یوں بیٹھا تھا جیسے ماحول سے بیگانہ ہو۔ بار بار نوک دار مونچھوں کو تاؤ دیتا اور عقاب کی سی آنکھوں سے ہجوم کو دیکھتا یوں لگتا تھا جیسے یہ لاپروا مغرور شخص ابھی کسی سے لڑ پڑے گا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کردستان کا ہے۔ نام بہت طویل تھا — اس میں تین چار ابن کچھ ابو اور چند آل آتے تھے تب جا کر مکمل ہوتا تھا لیکن سب اسے منصور کہتے تھے۔

شام کو دریا کے کنارے کرسیاں بچھائی گئیں۔ آفتاب غروب ہوا تو برٹن اور بوتلیں پہنچ گئیں۔ پہلے نوواردوں کا تعارف کرایا گیا۔ پھر برٹن نے سب کی خیریت پوچھی اور بولا — "حضرات میس (MESS) میں ہر موضوع پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ سوائے خواتین، مذہب اور سیاست کے۔ عورتوں کا ذکر جہاں روایتاً ممنوع ہے وہاں کیمپ میں تو بالکل بیکار ہے۔ یہاں کوئی خاتون ہے ہی نہیں، چنانچہ ویرانے میں بیٹھ کر عورتوں کے متعلق باتیں کرنا بالکل ایسا ہے جیسے ہوا میں تلوار چلانا۔ مذہب کا یہ ہے کہ سارے مذاہب اگرچہ خدا کو مانتے ہیں لیکن ان کے پیرو ہمیشہ ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کرتے رہتے ہیں اور مبلغ پبلک کو اپنے مذہب کے ذریعہ بہشت میں پہنچانا چاہتا ہے رہ گئی سیاست تو سیاہی کو اس کی پیچیدگیوں کی سمجھ ہی نہیں اور پھر سیاست میں یہ خرابی ہے کہ لوگ لیڈر کی پیروی کرتے کرتے دفعتہً اس کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں لیڈر آگے ہوتا ہے اور پبلک پیچھے —"

گلاس سامنے رکھے گئے۔ میرے انکار پر وجہ دریافت کی گئی۔ میں نے بتایا کہ مجھے

کھیل کود کا بہت شوق ہے اور اس چیز سے توانائی کم ہو جاتی ہے۔

"بالکل نو عمروں والی بات کی ہے۔ اس عمر میں طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں"

برٹن ہنسنے لگا "اعتدال ہو تو توانائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بڑے اچھے اچھے اسپورٹسمین پیتے ہیں۔ بہر حال میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔"

کھیلوں کا ذکر شروع ہو گیا۔

برٹن کہنے لگا، "مجھے کرکٹ بالکل پسند نہیں، ایک مرتبہ بلا غلط گھما دو تو آؤٹ۔ ہاکی فٹ بال وغیرہ میں غلطیاں کرنے کے باوجود کم از کم ایک گھنٹہ کھیلنے تو دیتے ہیں اور پہلی ہی غلطی پر میدان سے باہر نکلنے کا حکم نہیں مل جاتا۔"

پھر پولو پر پہنچا ——— "میں رسالے میں تھا۔ اب تک گھوڑے یاد آتے ہیں گھوڑوں کی خوشبو یا بدبو، ٹینکوں کے پٹرول کی بو سے کہیں بہتر تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ مشینوں سے کام لینے کے لئے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ گھوڑے ڈانٹنے چمکارنے سے مان جاتے تھے، مشینوں کو جتنا مروڑو اتنی ہی بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ ویسے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہارس پاور تب تک صحیح تھی جب تک وہ گھوڑوں میں رہی ——" پولو کے بعد نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ، لومڑی کا شکار، شہسواری کے کرتب سے ہوتے ہوئے معاملہ مچھلیوں کے شکار پر اٹک گیا۔

جب لوگ جماہیاں لے رہے تھے تو وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ سامن اور ٹراؤٹ کی عادات و خصلات میں کیا فرق ہے اور کیوں فرق ہے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس ریگستان سے کب چھٹکارا ملے گا۔ اگر پرسوں نجات مل جائے تو اگلے سنیچر کی رات کو اس وقت سٹیمر میں ہوں گا، چاندنی ہوگی

اور سمندر کی لہریں۔

اگلے روز برٹن نے مجھے بلا کر کہا۔ "تمہاری کل شام کی گفتگو مجھے پسند آئی، میں نے بغداد ٹیلیفون کر دیا ہے کہ تمہیں کچھ عرصے کے لئے یہاں رہنے دیا جائے"۔

اس کے بعد بتایا کہ رات کو اس کے خیمے میں چوری ہو گئی اور کوئی سارے سگار، وھسکی کی بوتلیں اور کافی کے ٹین لے گیا۔

"باقی چیزیں تو بچ گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے علاوہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں ——"

گورے سارجنٹ نے آکر سیلوٹ کیا اور اپنے مخصوص انداز میں رپورٹ دی۔

"سر آج صبح جب میں چائے سرو کر رہا تھا مجھے سرکار پورل ڈیوس نے سر بتایا کہ چوری ہو گئی۔ میں نے ملٹری سر پولیس کے سارجنٹ میجر اور کوارٹر ماسٹر کو رپورٹ کی۔ ہم سب اس سر نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سر چور کوئی باشندہ ہے"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے"، برٹن نے اسے بھیج دیا۔

رات کو کیمپ میں بڑا سخت پہرا ہوتا تھا، پھر بھی چور نالی میں سرکتا سرکتا آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔ صبح کو نالی خطوط سے بھری ہوئی تھی جنہیں وہ بیکار سمجھ کر پھینک گیا تھا۔

"کوئی پڑھا لکھا چور ہو گا وہ خط میرے بھتیجوں کے تھے لیکن فقط میری ہی چیزیں کیوں چرائی گئیں۔ آس پاس بھی تو خیمے تھے۔"

"شاید آپ کی کل والی تقریر کو چیلنج سمجھا گیا ہے"

"تمہارا قیاس صحیح ہے۔ پچھلی جنگ میں جب میں یہاں آیا تھا۔ تب بھی میں نے

کیمپ کے مقامی باشندوں کے سامنے کچھ ایسی ہی تقریر کی تھی۔"

"تب کیا ہوا تھا۔۔؟"

"تب بھی چوری ہوئی تھی۔۔۔ اسی رات کو۔۔۔"

اگلے روز کسی نے شکایت کی کہ ڈاک خانے سے ٹکٹ نہیں ملتے۔ پوسٹ ماسٹر سے پوچھا تو اس نے سر پیٹ کر بتایا کہ ٹکٹوں اور نقدی والا مقفل صندوق وزنی زنجیر سمیت غائب ہے۔

پھر اتنی چوریاں ہوئیں کہ ہم نے افسوس کرنا چھوڑ دیا۔

خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ ہمیں بتایا جاتا کہ درجہ حرارت سائے میں ایک سو تیس تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن سایہ ندارد تھا۔ علی الصبح اٹھ کر نو دس بجے تک کام کرتے یا پھر سہ پہر کے بعد، باقی وقت خیموں میں چھپے رہتے۔

برٹن بڑا محنتی اور سخت جان تھا۔ جس تن دہی سے خود کام کرتا اسی کی توقع دوسروں سے رکھتا۔ کام کے اوقات میں وہ ہم پر کڑی نظر رکھتا، نہ کسی کو پہچانتا نہ کوئی فالتو بات کرتا۔ لیکن جہاں شام ہوتی ایسا بدل جاتا کہ حیرت ہوتی کہ یہ وہی تلخ و جابر برٹن ہے بالکل دوستوں کی طرح ملتا۔ مشورے دیتا، قہقہے لگاتا لیکن دن بھر آندھی آئے لو چلے۔ جب دیکھو پسینے میں شرابور سینہ نکالے، کہنیاں پھیلائے چکر لگا رہا ہے۔ اسے قیلولے سے سخت چڑ تھی، کسی پر شبہ ہو جاتا کہ یہ دن میں سوتا ہے تو اسے تنگ کرتا، ذرا ذرا سی دیر کے بعد اردلی آتا۔۔۔۔۔ برٹن صاحب نے سلام بھیجا ہے۔

وہ غریب وردی پہن کر پہنچتا۔

"افوہ تمہیں نہیں روزنہ کو بلایا تھا" برٹن کہتا اور اگر روز ہوتا تو "افوہ تمہیں نہیں رچرڈ کو بلایا تھا۔ اردلی سے غلطی ہوئی۔"

ٹیلیفون پر گفتگو کرنے سے پہلے چیرز ضرور کہتا خواہ کیسا ہی موقع ہو۔ دفتر سے اکثر آواز آتی ہے "رابرٹ! تم سا سست اور نکما انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا اسی وقت واپس کیمپ پہنچو میں تمہاری خبر لوں گا — چیرز!"

"سمتھ! ابھی ابھی موصل سے اطلاع آئی ہے کہ تمہارا سارا سامان چوری ہو گیا اور لندن سے خبر آئی ہے کہ تمہارے مکان پر بم پڑا ہے — چیرز!"

"اور جو حکم ملا ہے اسے فوراً بجا لاؤ۔ بکو مت خاموش رہو — چیرز!"

"میں وطن سے پہلی مرتبہ نکلا تھا، ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتا، ہر بات کو توجہ سے سنتا۔ برٹن کہا کرتا — "لڑکو! جہاں گردی اور قسمت آزمائی کے یہی دن ہیں۔ جگہ جگہ جاؤ دنیا دیکھو، لوگوں سے ملو تجربہ حاصل کرو، تجربہ کا کوئی بدل نہیں ہے غلطیاں اور ان سے سبق سیکھو — یہ کتابیں نصیحتیں اور لیکچر سب زبانی جمع خرچ ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت کم ہوتی جائے گی اور ایک مرتبہ نظریے پختہ ہو گئے تو پھر سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔"

کبھی سمجھاتا کہ جس طرح مقابلوں کے لئے کھلاڑی ٹریننگ لیتے ہیں مشقت کرتے ہیں۔ اسی طرح آفتوں، حادثوں اور غیر متوقع واقعات کے لئے ذہن کی ٹریننگ ہونی چاہئے ڈرنے یا پریشان ہونے کی بجائے ذہنی طور پر اُن سے مقابلے کے لئے تیار رہو۔ مصیبتوں کا مزہ چکھے بغیر لڑکا مرد نہیں بنتا۔"

اس کے دفتر میں حکیم سقراط کا مشہور مقولہ آویزاں تھا۔

زندگی محدود ہے اور علم وہنر لامحدود مواقع تیزی سے گزر رہے جا رہے ہیں تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل۔

"اس میں ضرور صداقت ہو گی ورنہ اتنی صدیوں تک یہ مقولہ زندہ نہ رہتا" وہ کہا کرتا۔

اس کی میز پر مغربی شعرا کا مجموعہ کلام پڑا رہتا۔ کسی نے پوچھا تو بولا "لٹریچر کو میز پہ رکھنا اور نہ پڑھنا فیشن میں شامل ہے تب ہی یہ کتاب یہاں رکھی ہے۔ پتہ نہیں لوگ شعر کس طرح کہہ لیتے ہیں کیونکہ ان کے لیے اَن دیکھی اَن جانی عجیب عجیب باتیں سوچنی پڑتی ہوں گی بار بار فرضی باتیں سوچو تو ان پہ یقین سا ہونے لگتا ہے موجودہ شاعری میں رونے پیٹنے اور زندگی کی بے ثباتی کا بار بار ذکر ہوتا ہے میں جانتا ہوں کہ انسان فانی ہے زندگی میں مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں اور دنیا بڑی بری جگہ ہے — لیکن میں ان باتوں کے بارے میں بار بار یہ تذکرہ پڑھنے نہیں چاہتا۔"

چنانچہ دجلے کے کنارے شام کی محفلیں جمتیں تو میں ان میں بہ طور طالب علم شریک ہوتا۔

روز اور نبیلہ میرے ساتھ آئے تھے۔ کیمپ میں برٹن سے واقفیت ہوئی۔ پھر منصور اور حجاج ملے ۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جس کا دیر سے انتظار تھا۔ ہم بغداد جا رہے تھے۔

آٹھویں صدی میں جب لندن اور پیرس چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے تب

خلافت کا یہ مرکز دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس زمانے کا بغداد، پھر الف لیلہ کا بغداد پھر ہلاکو کا بغداد —— پتہ نہیں اب کیسا ہو گا۔

کھجوروں کے جھنڈ آئے، تہمد پوش حضرات گدھوں پر سوار تھے، عورتیں مٹی کے برتن لئے دجلے کی طرف آ رہی تھیں۔ دجلے کا پانی اور بھی گدلا ہو گیا۔ اب بغداد قریب تھا۔

لیکن جب بغداد آیا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ عمارتیں، سبزہ، درخت —— ہر چیز پر ریت کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی، بغداد کا دجلہ ایسا تھا جیسے چپا بہہ رہی ہو۔ شارع رشید دیکھ کر رسوائے عالم شاعر ابونواس کی سڑک پر پھر سے اسٹد باد ہوٹل کے سامنے سے گزرے۔ کئی بغدادیوں کے چہرے یا بازوؤں پر بغدادی ناسور دیکھے اور پھر دجلے کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔

یہ دریا تو کچھ نہیں ہے ——،، روزن نے بیزاری سے کہا۔

دن میں اس دریا کو پہچاننے کی کوشش کرو گے تو مایوسی ہو گی یہ کسی کو نہیں پہچانتا، یہ اس مغرور اور رنگین بوڑھے کی طرح ہے جس نے کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہوں اور جواب ماحول اور حالات سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہو۔ تھوڑا انتظار کرو، رات ہو لے، پھر دیکھنا ——،، جرجیس نے دجلے کی طرف داد دی کی۔

،، رات کو کیا ہوتا ہے ——؟،،

،، رات کو بوڑھا خوشبو لگا کر رنگین عبا پہنتا ہے۔ جو روشنیوں میں جگمگ جگمگ کرتی ہے ——،،

دجلے میں طرح طرح کی کشتیاں تیر رہی تھیں —— گول، لمبوتری، نوک دار،

مستطیل تھا، چند دخانی کشتیاں اور سٹیمر بھی نظر آئے۔

آخر اس سست رو بھورے سے دریا میں ایسی کیا خوبی ہے؟ سوائے اس کے کہ یہ تپتے ہوئے صحرا میں بہتا ہے۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آگئی۔۔۔ صحرا کا دائمی پیاسا اور کھارے پانی کا عادی بدو بغداد آیا۔ دکان پر روٹیوں کی قیمت چکا کر پہلی روٹی کے ٹکڑے کو دجلے کے پانی میں ڈبو کر چکھا، ایک روٹی کھائی۔ پھر دوسری؛ پھر تیسری۔۔۔ جب آٹھویں پر پہنچا تو دکاندار نے جھنجھلا کر پوچھا۔۔۔ آخر کب تک کھاتے رہو گے۔"

"جب تک دجلہ بہتا رہے گا۔۔۔ بدو نے جواب دیا۔

سائے لمبے ہو گئے، سورج چھپ گیا اور بغداد چمکنے لگا۔ دجلے کے کنارے روشن ہو گئے، پانی پہ نور کی بارش پڑی تو جیسے آگ سی لگ گئی۔ موسیقی کی دلکش تانیں فضا میں مرتعش ہوئیں۔

قہقہے تھے، گہما گہمی تھی اور متعدد حسین چہرے۔۔۔ رنگ رنگ کا طوفان آگیا دجلے کی سطح پر پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

جرجیس کی حالت مخدوش تھی۔ ابھی ساتھ سے ابھی غائب ہو گیا، پھر آملا، ادھر جھانک رہا ہے، ادھر تاڑ رہا ہے۔

"وہ دیکھو۔۔۔" اس نے اشارہ کیا۔ ہم نے دریچے سے دیکھا، اندر رقص ہو رہا تھا۔ ایک طرف منصور بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک شعلہ جوالہ جو مچل رہی تھی، شرما رہی تھی۔ مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں۔

"منصور کتنا خوش نصیب ہے۔" روز نے نہایت لمبی آہ بھری۔

منصور یہاں رہ چکا ہے اور لوگوں کو جانتا ہے۔ اگلی مرتبہ میں بھی کسی کے ساتھ ہوں گا اور تم لوگ دور سے دیکھ دیکھ کر رشک کرو گے ــــ" جرجیس نے بھی اچھی خاصی طویل آہ بھری۔

ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے کیبرے دیکھ رہے تھے۔

" ہائے یہ موسیقی کیسی اداس کن ہے" سنیا لکمہ نے بھی آہ بھری جیسے دیکھو آہ بھر رہا تھا۔

" وھسکی میں پانی ملا ہوا ہے، چوتھے جام پر کچھ نہیں ہوا ــــ" روز بھی غمگین ہو گیا۔

" برٹن یاد آرہا ہے۔ بوڑھے کو ناحق کیمپ میں چھوڑ آئے ــــ" جرجیس بڑبڑایا۔

میں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے کندھا پکڑ کر ہلایا ــــ" لینکی تم چپ کیوں ہو کچھ تو کہو ــــ"

" ناحق رنگ میں بھنگ مت ڈالو، یہاں سب مسکرا رہے ہیں اور تم منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔ نہ موسیقی میں خرابی ہے اور نہ وھسکی میں اور برٹن کا یہاں ہونا نہ ہونا بے معنی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

" تو پھر یہ کیا ہے ــــ ؟"

" جانتے نہیں یہ احساسِ تنہائی ہے ــــ"

" لیکن ہم تنہا تو نہیں ہیں، اکٹھے ہیں ــــ" روز نے نیم مردہ آواز میں کہا اور ہم پھر چپ ہو گئے۔ صبح کو دیکھا تو وہی ٹیلا سا وجہ تھا اور وہی گرد میں اٹا ہوا بغداد۔

وہ حسن و جمال کہاں گیا؟ وہ لطافتیں خوشیوئیں کیا ہوئیں؟ موسیقی کی دلربا تانیں کہاں کھو گئیں؟ رات کی ہر شے سحر زدہ تھی۔ شاید الف لیلہ کے وقتوں کا طلسم اب تک باقی ہے۔ واپسی پر روز کہنے لگا کہ "شہر تو میں نے بھی کئی دیکھے ہیں۔ لیکن دن رات کے سماں میں ایسا نمایاں تضاد کہیں محسوس نہیں کیا۔"

میں ورزش کرتا تو وہ پوچھتے کہ اتنے کام کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں بتاتا کہ زیادہ کام سے تھکاوٹ ہوتی ہے لیکن ورزش سے چستی آتی ہے۔
جرجیس کی طبیعت اچھی نہ ہوتی اور مجھ سے دوائی مانگتا تو میں ورزش تجویز کرتا۔ بیزاری کا علاج ایک میل کی دوڑ، جس کے بعد بھوک لگے گی، نیند آئے گی اور بیزاری یاد تک نہ رہے گی۔ موڈ خراب ہو تو ایک سو بیٹھکیں اور ایک میل کی دوڑ۔ جی نہ لگتا ہو تو سو ڈنڑ اور سو بیٹھکیں۔ عشق ہو جائے تو لگاتار دوڑ، ڈنڑ اور بیٹھکیں۔ جیت تک کہ افاقہ نہیں ہوتا۔
"بس بس بدمذاقی کی انتہا ہو گئی، مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے ___"
وہ ناراض ہو کر کہتا۔
جب کبھی باہر جانے کی ڈیوٹی آتی تو جرجیس خاص طور پر میری سفارش کرتا کہ اسے بھیج دو یہ بھاگ دوڑ میں خوش رہتا ہے۔
برٹن اُسے سمجھاتا "جرجیس خد و خال اور قد تو قدرت تراشتی ہے لیکن جسم انسان خود تراشتا ہے۔ بھدے جسم کے لئے کوئی قدرت کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ لینگی کو دیکھو دن بھر کا تھکا ہارا شام کو شربت انار پی کر ایسا سوتا ہے کہ صبح کو

بگل کی آواز بھی نہیں سنتا۔"

ایک دن علی الصبح دوڑ لگائی تو منصور کے ماتحت نے پکڑ لیا۔ مجھے پہچانا تو معافی مانگی اور تنبیہہ کی۔" واللہ! بابا! پوریا حضرت یہ کیا حرکت ہے؟ اتنے سویرے اور مغرب کے وقت اندھیرے میں اس قسم کی ورزش یہاں مت کیا کریں ورنہ لوگوں کو مغالطہ ہوگا کہ کوئی بدو کیمپ میں چوری کر کے بھاگا جا رہا ہے۔"

چوریوں کا ذکر اکثر ہوا کرتا۔ طرح طرح کے قصے بیان کئے جاتے۔ لوگ آپ بیتیاں سناتے۔" انہیں سفید چادروں کا بہت شوق ہے۔ کوئی سو رہا ہو تو چور چپکے سے آتا ہے۔ بستر کا جو حصہ خالی ہو اس سے چادر تہہ کی جاتی ہے۔ پھر پر یا کسی ملائم چیز سے سونے والے کے گدگدی کی جاتی ہے۔ جوں ہی وہ کروٹ بدلتا ہے بقیہ چادر اس کے نیچے سے نکال لی جاتی ہے۔ صبح اٹھ کر وہ ملازم کو ڈانٹتا ہے کہ رات چادر کیوں نہیں بچھائی۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ لیٹے ہوئے انسان کے نیچے سے چادر نکل گئی۔

پچھلی جنگ میں جب میں یہاں تھا تو عجب تماشہ ہوا۔ ہر شام کو کیمپ سے ایک خچر غائب ہو جاتی۔ پہرا سخت کر دیا گیا۔ سنتریوں کی تعداد بڑھائی گئی لیکن پھر بھی چوتھے پانچویں روز خوش خبری ملتی کہ ایک خچر کم ہے۔ آخر مخبروں سے رجوع کیا اور انھوں نے چور پکڑوایا۔ معلوم ہوا کہ جب شام کو جانور پانی پی کر کیمپ میں آتے تو چور کتے کی کھال اوڑھ کر ان کے ساتھ ساتھ آجاتا۔ اندھیرا ہونے پر ذرا ذرا سی دیر کے بعد خچروں کو چھیڑتا۔ وہ ہنہناتیں۔ دولتیاں جھاڑتیں، فوراً سنتری آتا اور خچروں کو بندھے دیکھ کر واپس چلا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد پھر شور مچتا، سنتری

پھر جاگ کر ہنہناتا اور خچروں کو صحیح سلامت پاکر لوٹ جاتا۔ یہ عمل اتنی مرتبہ دوہرایا جاتا کہ سنتری خچروں کے بلاوجہ شور و غل سے بالکل بیزار ہوجاتے حتیٰ کہ جب چور سچ مچ ایک خچر کو لے کر بھاگتا تو سنتری نہ کسی کے ہنہنانے کی پروا کرتے اور نہ شور و غل کی ——"

"ایک مقامی باشندے کو آملیٹ بہت پسند تھا۔ اس نے مجھ سے پکانے کی ترکیب پوچھی تو میں نے بتایا کہ پہلے چار انڈے چڑاؤ پھر تھوڑا سا مکھن اور نمک مصالحہ چڑاؤ اور پھر چڑائے ہوئے چولہے پر۔"

اور سب ہنسنے لگے۔

برٹن پرانا سپاہی تھا۔ اس کے آٹھ تمغوں میں دو ایسے تھے جو فقط میدان جنگ میں بہادری پر دیے جاتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ "آپ نے کیا کیا تھا؟"

"یہ تمغے ان معرکوں کی یادگار ہیں جن میں میرے رفیقوں کو جو مجھ سے کہیں دلیر اور فرض شناس تھے، کچھ نہ ملا۔ وہ مجھ سے زیادہ حق دار تھے۔"

پھر کسی نے اس کے تمغوں کا ذکر نہیں کیا۔

ہمارے دو ساتھی تبادلے پر چلے گئے لیکن ان کی جگہ کوئی نہ آیا۔ اس سے شکایت کی کہ کام زیادہ ہے۔ بولا "آدمی زیادہ ہونے سے کارکردگی کبھی نہیں بڑھتی۔ وہ سوال یاد ہوگا جو کسی بچے سے پوچھا گیا تھا کہ اگر دو آدمی ایک کام کو دو دن میں کر سکتے ہیں تو چار آدمی کتنے دن میں کریں گے؟ بچے نے جواب دیا تھا چار دن میں! میرے خیال میں یہ جواب بالکل صحیح ہے۔ جتنے زیادہ آدمی

ہوں گے اتنا ہی زیادہ وقت ضائع کریں گے۔"

کیمپ کی بے کیف زندگی سے تنگ آجاتے تو وہ مشورہ دیتا۔" اسی میں خوشیاں تلاش کرو۔ مسرت بھرے لمحے کسی پروگرام کے تحت نہیں ملتے۔ یہ تو ادھر ادھر سے چرانے پڑتے ہیں۔ خوش خبریاں باہر سے نہیں منگوائی جاتیں یہ تو ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ بے کیفی اور جمود کے تالاب سے خود کھینچ کر نکالنی پڑتی ہیں۔ جس طرح لڑائی میں اپنی پسند کا میدان جنگ، موزوں موسم، مطلوبہ نفری اور جنگی سامان ملنے مشکل ہیں اسی طرح موزوں وقت صحیح موقعے اور ساز گار حالات کبھی نہیں آتے۔۔۔ یہ بالکل غلط ترکیبیں ہیں۔ کچھ کرنا چاہتے ہو تو مردوں کی طرح اٹھو اور مستعدی سے جٹ جاؤ۔۔۔ یہی ایک طریقہ ہے جو تمہارے کام آئے گا۔" ایک دن ہم نے پوچھا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟

"شادی کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ جوانی جہاں گردی اور فیلڈ سروس کی نذر ہو گئی، ادھیڑ عمر کا ہوا تو پھر خیال چھوڑ دیا۔ دراصل محبت فقط نو عمروں کے لئے ہے۔ اس عمر میں ہر چیز خواہ مخواہ رنگین معلوم ہوتی ہے ہر جذبے میں بے ساختگی ہوتی ہے اور بلا کا خلوص۔ محبوب ایک دفعہ مسکرا دے تو کئی ہفتے خوشی خوشی گزر جاتے ہیں۔ پورا یقین ہوتا ہے کہ امتحان میں ضرور کامیابی ہوگی، مالی حالت بھی بہتر ہو جائے گی، دوست دشمن سب قدر کرنے لگیں گے اور محبوب کی بے رخی سے سب تہس نہس ہو جائے گا۔ آئرلینڈ کی وہ جھلمل جھلمل کرتی ندیاں، وہ لہلہاتے کھیت، شاداب کنج، گھنے جنگل، مجھے اب تک یاد ہیں اگرچہ ان لڑکیوں کے نام اور چہرے یاد نہیں

جوان دنوں میرے ساتھ ہوا کرتیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب بادل آئے تھے اور کب بوندیں ختم ہوگئیں۔ طلوعِ آفتاب کے بعد اتنی جلدی چاند کیسے نکل آیا۔ ذرا دیر پہلے گھپ اندھیرا تھا، دفعتاً یہ روشنی کہاں سے آگئی۔ وہ جگمگاتی صبحیں۔ وہ رنگین شامیں وہ مستی کے شب و روز۔ محبت کی اصلی عمر یہی ہوتی ہے اس کے بعد بس دکھاوا ہے اگرچہ میں شادی کے قضیے سے بالکل مبرا ہوں اور تم لڑکوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا۔ کہ اپنی کمر پر زین نہ کسوانا لیکن اگر خدانخواستہ کبھی پھنسنے لگو تو جذبات کے دھارے میں ہرگز نہ بہنا۔ ایسا چہرہ چننا جس کی کشش اور دلربائی دیرپا ہو، شاید تم نہیں جانتے کہ گزرتے ہوئے ایام چہروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور محض دس پندرہ سال کا وقفہ چہروں میں کیسی کیسی تبدیلیاں لا سکتا ہے۔"

ہم نے روزی کو اشارہ کیا کہ یہی موقع ہے پوچھ لو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بغداد کا ذکر کیا۔ بوڑھا ترنگ میں تھا کہنے لگا "میں ڈیوٹی کے سلسلے میں سختی برتتا ہوں۔ لیکن تفریح کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتا کیونکہ یہ اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ ڈیوٹی سنیچر کی شام کو جوڑا بغداد جانا چاہے بخوشی جا سکتا ہے، لیکن محتاط رہنا ان شہروں میں آئے دن فساد ہوتے ہیں میں جنگ سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا دنگے فساد سے۔ لڑائی میں دشمن کی تمیز کی جا سکتی ہے لیکن جب کوئی ہجوم مشتعل ہو جائے تو دوست دشمن کا پتہ نہیں چلتا اور ایسی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں فساد، دو تماشائی جو جاپانی تھے ہلاک ہو گئے۔ منچوریا میں فساد، تین فرانسیسی راہ گیروں کی حالت نازک ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میکسیکو میں دو سیاست دان ڈوئل لڑے دونوں کو خراش تک نہ آئی، مگر آٹھ تماشائیوں کا مکمل طور پر انتقال ہو گیا ہے۔

بہ طور تماشائی مرنا بے حد ہونق موت ہے ـــــ"

ہم بغداد جانے لگے۔ سنیچر کی شام کو بغداد پہنچ کر خوش ہوتے اور اتوار کی شام کو واپس کیمپ آکر بھی اتنی ہی خوشی ہوتی کیونکہ شہر بین، دکان دار اور چور ہماری جیبیں خالی کر دیتے۔

برٹن اپنے رشتہ داروں کے ذکر سے ہمیشہ احتراز کرتا تا۔ اُدھر جرجیس کا محبوب موضوع یہی بھی تھا۔ اپنے اور دوسروں کے تایوں، چچوں، بھائی بھتیجوں کے متعلق پوچھتا اور بتاتا تا۔ اسے سمجھایا بھی کہ انگریز ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے پھر بھی برٹن سے پوچھ بیٹھا ـــــ "آپ کے کتنے بھائی ہیں ـــــ؟"

"ایک ہے لیزلی ـــــ بڑا شیطان ہے ـــــ ہم دونوں گھر سے دوست بھی ہیں۔ ۳۳ء میں وہ لندن میں تھا۔ بعد میں آوارہ گرد ہو گیا اور مختلف ملکوں میں پھرتا رہتا ہے۔"

"تو گویا آپ اور وہ دس سال سے نہیں ملے ہیں؟" جرجیس نے ایک اور غلطی کی۔

"دراصل ہم ۲۲ء میں ملے تھے۔ پھر گیارہ برس کے بعد میں چھٹی پر گیا۔ لندن میں کسی نے بتایا کہ لیزلی بھی وہیں ہے۔ کھوج نکال کر اس کے فلیٹ پہ پہنچا آواز دی ـــــ لیزلی! لیزلی!! کون ہے؟ وہ اندر سے چلایا ـــــ میں ہوں ایرک ـــــ ہلو ایرک مشرق وسطیٰ کا کیا حال ہے ـــــ؟ اچھا ہے کوئی تازہ خبر سناؤ، یوس ٹیس کا انتقال ہو گیا ایرک ـــــ کیسے ہوا لیزلی؟ بس ایک دن چلا جا رہا تھا دھڑام سے گر کر مر گیا۔ تمہیں تعجب ہوا ایرک؟ بالکل تعجب نہیں ہوا لیزلی! اس کی صحت گرتی جا رہی تھی جب وہ سکندریہ میں ملا تو میں نے صاف بتایا تھا کہ اولڈ ٹنک تم ڈھیلے ہوتے

جا رہا ہے۔ تمہارا وقت قریب ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے دوست نے یہ چار سال کیسے نکال دیئے اور لیزلی! تم باہر نکلو نا۔۔۔ ایرک! مجھے کچھ دیر لگے گی میں باتھ روم میں حجامت کر رہا ہوں۔ انتظار کرو۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر مجھے پکاڈلی سرکس پہنچنا ہے ۔۔۔ تو پھر ایرک تم فوراً بس پکڑ لو ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔ پھر کبھی ملیں گے ۔۔ گڈ بائی ۔۔ چیرز لیزلی! ۔۔ اگلے روز اسے فون کیا وہ کہیں باہر جا رہا تھا۔ پھر اس نے فون کیا، میں ہوٹل میں نہیں تھا۔۔ پھر میں نے فون کیا تو بولا، گھڑ دوڑ پر جا رہا ہوں۔ چلو گے؟ چند ماہ پہلے میں گھوڑوں کے سلسلے میں چھ سات سو پاؤنڈ ہار چکا تھا۔ لہذا گھڑ دوڑ سے کتراتا تھا اس لئے نہیں گیا۔ میں نے اسے چڑیا گھر کی سیر کے لئے مدعو کیا لیکن اسے جانور اچھے نہیں لگتے۔ چنانچہ وہ نہ آیا۔ اگلے ہفتے وہ سمندر کے کنارے چلا گیا۔ میں بھی مصروف رہا۔ اتنے میں چھٹی ختم ہو گئی اور میں واپس آ گیا۔ لیزلی سے ملاقات ہو جاتی تو اسے آئرلینڈ چلنے کے لئے مجبور کرتا۔ گھر ہو آتے اور یہ بھی دیکھ آتے کہ اولڈ بوائے کا موڈ کیسا ہے ۔۔ اولڈ بوائے بھی اب نوے پچانوے کا ہو گا۔

"اس سے جنگ کے بعد ۱۹ء میں ملاقات ہوئی تھی ۔۔"

"اور پوچھو انگریزوں سے ایسے سوالات ۔۔" منصور نے جیرجیکس کو ڈانٹا

موہن نمبالکر مرہٹا تھا۔ سانولا رنگ، پستہ قد، گٹھا ہوا جسم کبھی نچلا نہ بیٹھتا۔ دن بھر کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا۔ اس کا خیمہ قریب تھا۔ علی الصبح اس کا گانا سنائی دیتا۔ ہوئے ہوئے، تم جاگو موہن پیارے، گاتا جیسے اپنے آپ کو جگا رہا ہو۔

پھر اُٹھ کر دجلے کے کنارے سے طلوعِ آفتاب دیکھنا۔ صبح کے وقت اکثر اُس کے خیمے سے جوگیا۔ بھیرویں اور ساوری کی تانیں سنائی دیتیں، کبھی اداس لے میں کہ اے اُس دن کی تدبیر جیب ترا آوے گا پروانہ، گاتا تو کبھی لہک لہک کر۔

جام گدائی ہاتھ میں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں
پنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

اور آخر میں جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

یں ورزش ختم کرتا تو دریا کے کنارے ملاقات ہوتی ــــ "خاں صاحب، کیسی سہانی صبح ہے۔ دریا میں سونا بہہ رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مغربی کنارے پر ہیں ورنہ طلوعِ آفتاب کا یہ نظارہ نہ دیکھ سکتے۔" اُدھر برٹن روز وغیرہ سب غروبِ آفتاب پر فدا تھے۔

"سورج کا ڈوبنا اداس سا نظارہ ہے لیکن طلوع تخلیق کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اگر انسان صبح صبح مسرور ہو تو سارا دن اچھی طرح گزرتا ہے میں نے آج تک کبھی شام کا انتظار نہیں کیا۔"

محنت مشقت کے علاوہ اسے فقط دو چیزوں کا شوق تھا، موسیقی اور کبھی کبھی ذرا سی وسکی۔

"جوگیا بڑی عبادت ہے خاں صاحب انسان پہاڑ کی چوٹی اور سمندر کی تہہ

ناپ سکتا ہے مگر درباری کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا ــــ جس شام کو وہسکی نہ ملے اِیمن سے نشہ پورا ہو جاتا ہے ــــ دوسری ملہاروں اور میاں کی ملہار میں آپ نے فرق محسوس کیا؟ استاد نے ذراسی ترمیم و اضافے سے سماں باندھ دیا۔ اسے سنتے وقت بارش کی پھلواروں اور جھینگروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں بھیگے خنک جھونکوں کا لمس محسوس ہوتا ہے ــــ اور انسان کتنا ہی اداس ہو۔ اساوری کی چند تانیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں ــ

میں نے زندگی کے پہلے اٹھائیس سالوں میں نہ کبھی غم لگایا نہ شراب کو چھوا پھر والد کا انتقال ہو گیا۔ شمشان میں انہیں جلانے کے فرائض بطور بڑے بیٹے کے مجھ کو سرانجام دینے پڑے۔ اس دن جو کچھ مجھ پر بیتی بیان نہیں کر سکتا۔ شام کو میں نے پہلی مرتبہ پی۔ اس واقعہ کو دس سال گزر چکے ہیں لیکن اس دن اور اس کرب ناک منظر کا ایک ایک منٹ مجھے یاد ہے ــــ خاں صاحب میں نے عجیب عجیب محفلوں میں پی ہے ــ لچوں، شہدوں، لفنگوں کے ساتھ جہاں گلاسوں کی جگہ بوتلوں سے حساب ہوتا تھا، بات بات پر چاقو نکل آتے تھے (اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا سا نشان تھا، یہ زخم ان خرمستیوں کی یادگار ہے پھر جب مہاراجے کی ملازمت میں تھا تو کئی مرتبہ پری جمالوں کے جھرمٹ میں راجا اندر کی طرح پی ــــ ایک ایک حسینہ ایسی تھی کہ اس کے لئے عمر گنوا دی جائے اور ذرا افسوس نہ ہو۔ کچھ شراب کا نشہ کچھ ان متوالی آنکھوں کا خمار کیا کیا کیفیتیں طاری ہوتی تھیں ــ۔ اب یوں لگتا ہے جیسے ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ پھر کبھی کبھی ایسے منحوس مطلب پرست خلیتوں کا بھی ساتھ دیا کہ گھنٹوں کی بادہ

نوشی کے بعد بجائے سرور کے افسردگی ملی اور توبہ کرنے کو جی چاہا۔ شدید صدمے برداشت کرنے کے لئے پی اور ہمیشہ صدمے کو شدید تر محسوس کیا۔ شرط لگا کر پی، بلا نوشوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے فائدے تھوڑے سے ہیں اور نقصان زیادہ ۔۔۔“

اس کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ بیوی ہمیشہ لکھ پتی باپ کے پاس رہتی۔ کبھی کبھار اس کے پاس آتی تو عزیت کے طعنے دیتی۔ لڑنے کے بہانے تلاش کرتی۔ سسرال والے حقارت آمیز سلوک کرتے۔ یہ کہانی اور اپنی زندگی کی دوسری المناک کہانیاں دوہرا کر وہ پوچھتا ۔۔۔ ”دنیا میں کسی چیز کو بھی تو ثبات نہیں، دوست بناتے دیر لگتی ہے لیکن کسی چھوٹی سی بات سے برسوں پرانی دوستی یوں ختم ہو جاتی ہے! یہ بتایئے کہ یہاں ہمیشہ ڈر ڈر کر کیوں رہنا پڑتا ہے، کوئی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو آج دوست بنا ہوا ہے اس کے دل میں کل بھی اتنی ہی محبت ہو گی ۔۔۔ ذرا سی جدائی، معمولی سی غلط فہمی، تخیل کی غلط پرواز، شب و روز کی یکسانیت، کسی تیسرے کی آمد ۔۔۔ بعض اوقات تو کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی اور آناً فاناً میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ۔۔۔ یہ کیا تماشہ ہے؟“ ۔۔۔ میں خاموش رہتا، وہ پوچھتا ۔۔۔ ”اور یہ بتایئے مجھ سا جذباتی اور احساس ہر وقت فکر مند کیوں رہتا ہے؟ وسوسے آتے ہیں، اپنے آپ کو بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ یہ شبہات ہیں غلط ہوں گے، کبھی ایسا نہیں ہو سکتا، پھر بھی فکر کر کے برا حال ہو جاتا ہے مجھے خوش فکروں پر رشک آتا ہے جو کسی چیز کی پروا نہیں کرتے، وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں ۔۔۔“

میں تسلی دیتا کہ اگر انسان فکر نہ کرے تو زندگی کے کام کیوں کر ہوں، موجودہ اور آئندہ مسائل سے کس طرح مقابلہ کیا جائے لیکن وہ سر ہلا کر کہتا۔ "نہیں یہ طفل تسلیاں ہیں ـــــ"

پھر کسی دن کہتا ـــ "زلزلوں، وباؤں اور جنگوں سے انسان کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا کہ چالبازوں، جھوٹوں اور مکاروں سے ـــ اور اس قسم کے لوگ دنیا میں اس قدر کامیاب ہیں، ہر فریب، ہر جرم، ہر خباثت ان کے لئے جائز ہے نہ ان کا ضمیر ہے، نہ ان پر جزا و سزا کا اطلاق ہے اس کے باوجود یہ پھلتے پھولتے ہیں رہ گئی اگلی دنیا ـــــ سو کیا پتہ کہ یہی لوگ اِدھر اُدھر مل ملا اپنا الو سیدھا نہیں کریں گے ـــ"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ـــ"

"کیوں نہیں ہو سکتا جب کہ بارش نیک اور بد دونوں پر پڑتی ہے۔ سورج کی شعاعیں دونوں کے لئے ہیں۔ قدرت کی نعمتیں اور حادثے سب کے لئے یکساں ہیں"

میں خاموش ہو جاتا وہ شکایت کرتا ـــ "آپ جان بوجھ کر ٹال جاتے ہیں"

اس کا رنگ سانولا تھا لیکن جب گوروں کالوں پر بحث ہوتی تو وہ غیر جانب دار رہتا اور کہتا ـــ "جلد کے دونوں رنگ پیانو کے سفید اور سیاہ پردوں کی طرح ہیں، جب تک دونوں ہم آہنگ نہ ہوں نغمہ پیدا نہیں ہوتا ـــ"

برٹن اس سے ہندوستانی موسیقی کے متعلق سوالات پوچھا کرتا ـــ "دیوتاؤں کے سامنے موسیقی، رقص اور پھولوں کی پیش کش سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا

خوشگوار ہوتا ہوگا اور اگر دیوتا کہیں ہیں تو وہ یقیناً اس ٹنگ سے محفوظ ہوتے ہوں گے —"

کیمپ میں ایک گھنی مونچھوں والا ہیبت ناک شخص بھی تھا جس کے بے سرے گانوں سے سب نالاں تھے لیکن موہن اسے ناپسند نہیں کرتا — "یہ بُرا آدمی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے گانے کا شوق ہے۔"

حالانکہ وہ رات کے گیارہ بارہ بجے بھیانک آواز میں ایسے اوٹ پٹانگ گانے گاتا کہ صورِ اسرافیل کا گمان ہوتا۔ آخر تنگ آکر منصور نے سب کے سامنے اسے بتایا کہ "حکیم رازی کو اوائل عمر میں بانسری بجانے اور گانے کا بڑا شوق تھا۔ جب پختگی آئی تو گانا بجانا یک لخت ترک کر دیا اور کہا کہ جو نغمہ داڑھی اور مونچھوں کے درمیان سے نکلے اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔"

منصور کی نصیحت کارگر ثابت ہوئی اور اس کی نغمہ سرائی کم ہوتی گئی۔

جرجیس کا اصل نام جارجیہ تھا اور اصل وطن آرمینیا۔ موٹا تازہ آرام طلب نوجوان تھا۔ پتہ نہیں نوکری کیوں کر رہا تھا کیونکہ اسے کام سے نفرت تھی اور قواعد ضوابط سے چڑ۔ پیدل چلنے سے ہمیشہ گریز کرتا کہیں چلنا پھرنا پڑ جاتا تو — "میں فوجی نہیں ہوں، مجھے کچھ نہ کہو" کہہ کر بیماری کے بہانے سے خیمے میں لیٹ جاتا۔ ویسے ہر روز تقریباً نو دس بجے نہا دھو کر تیار ہوتا اور نعرہ لگاتا — "اب جرجیس ہر چیز کے لئے تیار ہے سوائے کام کے —"

دائمی کاہلی کے باوجود جرجیس نہایت شدید قسم کا عاشق تھا اور تقریباً

ڈیڑھ یا پونے دو عاشقوں کے برابر تھا۔ کسی لڑکی کو مغموم دیکھ کر اس سے رہا نہیں جاتا تھا۔ دراصل جو لڑکی مغموم نہ بھی ہو اسے دیکھ کر بھی بے قابو ہو جاتا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ دنیا کی حسین ترین لڑکی پر عاشق رہتا تھا —— یہ اور بات تھی کہ کبھی لڑکی کا نام امالیا ہوتا، کبھی لوریتا تو کبھی الزبتھ۔ ساتھ ساتھ یہ گلہ بھی رہتا کہ اسے اتنی توجہ نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہے۔

" آج دوتا روزا نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہنریشا نے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا باتیں تو ہوئیں لیکن پھیکی پھیکی سی۔ حالانکہ اسی لڑکی نے پچھلے ہفتے میرا دل اور کیمرا چرا لیا تھا اور تو اور وہ بے وقوف گریس بھی روٹھی ہوئی ہے —— ہائے ہمیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملا ——"

" اور تم نے زندگی کو کیا دیا ہے؟" روز چڑ کر کہتا —— "تم ان لوگوں میں سے ہو جو ہر ایک سے ہر وقت ہر قسم کی توجہ کے طالب رہتے ہیں۔ کسی خوفناک وبا سے بچ جانے پر جنہیں خوشی کی جگہ افسوس ہوتا ہے کہ وبا نے توجہ نہیں دی بلکہ جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے ——"

روز اور جیمس میں اکثر ٹھنی رہتی، روز پوچھتا —— "جیمس جانتے ہو۔ کائنات میں تقریباً دس کروڑ جھرمٹ ہیں، ہر جھرمٹ میں دس لاکھ کے قریب نظام شمسی ہیں۔ ہر نظام شمسی میں کئی سیارے ہیں جن میں سے کچھ آباد بھی ہوں گے۔ ادھر تم ہو کہ ایک چھوٹے سے سیارے کے ننھے سے ملک میں بالکل ذرا ذرا سی باتوں میں غلطاں رہتے ہو ——"

" جو چیزیں دوربینوں سے بھی دکھائی نہ دیتی ہوں، ان پہ میرا کوئی اعتقاد نہیں۔

دنیا کا جو اتنا سا حصہ نظر آتا ہے۔ اسی پر قانع ہوں ـــــ خصوصاً بغداد، یہودنوں، دالاپل اور اس پر یہودنوں کے جھرمٹ۔"

یہ یہودنوں والا پل بڑی پرکشش جگہ تھی۔ شام ہوتے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی۔ دریا کے کناروں سے ساری رونق پل پر سمٹ آتی چہل قدمی کرتے ہوئے کسی نے معطر رومال گرا دیا کہ کوئی اٹھا کر دے تو تعارف ہو، گھڑی باندھ رکھی ہے پھر بھی صحیح وقت پوچھ رہی ہیں، سرخ ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر ماچس مانگنا اور یہ کہہ کر کسی فرضی کیڑے مکوڑے سے ڈر جانا کہ کوئی ڈرنے کی وجہ پوچھے، ایسی قسم کے سینکڑوں حربے۔ سیاہ زلفیں، زیتونی رنگ، بھرے بھرے ہونٹ چست لباس اور بڑی بڑی آنکھیں۔

جرجیس بار بار کہتا ـــــ "یہ یہودی تو کچھ نہیں مگر یہودنیں دیکھی بچا کرم والله!"

اس کے باوجود یہ یہودنیں جرجیس کے لئے سرکس کے جانوروں کی طرح تھیں وہ انہیں بڑے شوق سے دیکھتا۔ بار بار ملنا چاہتا لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔

روز جرجیس سے پوچھتا کہ "تم شادی سے کیوں بھاگتے ہو؟"

"میرے خیال میں شادی فقط شادی شدہ لوگوں کے لئے مفید چیز ہے ـــــ"

"تم عورت کی مستقل رفاقت سے ڈرتے ہو ـــــ"

"عورت کی رفاقت میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن شادی کے بعد جو باقی ماندہ اتنی ساری عورتوں سے دور رہنا پڑتا ہے۔ یہ بہت مشکل ہے یہ کیمپ تو اتنا برا نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں جہاں تھا، وہاں اتنی تنہائی تھی کہ شادی کرتے

کرتے بال بال بچا۔

اس کا عقیدہ تھا کہ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرا دو کہ وہ حسین ہے اس کے بعد وہ تمہارے سارے جھوٹ بالکل سچ مان لے گی لیکن ہم اسے بتاتے کہ وہ اکثر لڑکیوں کو ملتے ہی خفا کر دیتا ہے لہذا اس کی تکنیک میں ضرور کوئی خرابی ہو گی

"یہ تو دل کے معاملے میں جو سوجھتی ہے کہہ دیتا ہوں۔ قوانین و ضوابط سے مجھے سدا کی چڑ ہے۔" جر جلیس کی تکنیک کچھ اس طرح کی تھی۔

کوئی لڑکی کہتی۔ "آج میری سالگرہ ہے ۔۔۔"

"مبارک ہو! آج آپ کتنے سال کی نہیں ہوئیں؟"

وہ چڑ جاتی۔

جر جلیس سرگوشیوں میں کہتا "جانتی ہو دنیا کی سب سے حسین لڑکی کون ہے؟"

"کون ہے ۔۔۔؟" وہ خوش ہو کر پوچھتی۔

"گریٹا گاربو ہے۔"

لڑکی پھر خفا ہو جاتی

جر جلیس پھر ہانکنے لگتا "کل سوزی تمہارے مٹاپے پر فقرے کس رہی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا اور سمجھایا کہ تم موٹی تو نہیں فقط تمہارا وزن تمہارے قد سے مناسبت نہیں رکھتا۔"

اس پر وہ آگ بگولا ہو جاتی "بڑے بدتمیز ہو تمہارے متعلق میں سب کچھ جانتی ہوں کہ تم اول درجے کے جھوٹے ٹھگ اور ہرجائی ہو۔"

"سچ ہو! تم مجھے ترغیب دلا رہی ہو۔"

ظاہر ہے کہ اس قسم کی گفتگو سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا لیکن جرجیس کا جوش و خروش کبھی کم نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ وہ ایک پختہ عمر کی خاتون کے پیچھے ہو گیا اس نے فوراً دھمکایا "جانتے ہو میں تمہارے دوست کی چچی ہوں — ؟"

"چچی جان! آپ کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے اور آپ کی چال خوب ہے۔"

"تمہیں مجھ سے ملنے کی جرأت کیونکہ ہوئی؟"

"اپنے دوستوں کے ہمراہ بابل اطاق کسریٰ اور دیگر آثار قدیمہ دیکھنے آیا تھا سوچا آپ کے درشن بھی کر لوں —"

"خبردار! آئندہ مجھ سے دور رہنا۔ تمہارے اور میرے خیالات بالکل مختلف ہیں۔"

"واقعی ہم دونوں مختلف ہیں۔ آپ کو لڑکے پسند ہیں اور مجھے لڑکیاں —"

جرجیس کی جیب اکثر خالی رہتی۔ ایک شام کو شارع رشید کے مہنگے سے ریسٹوران میں دیکھا کہ جرجیس اور ایک لڑکی ڈنر کھانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی کیونکہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں، تماشہ دیکھنے کے لئے قریب جا بیٹھے۔

جرجیس کہہ رہا تھا — "اب جبکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔ میں یہ بتاتے ہیں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ تم بے حد حسین ہو۔ مجھے اپنی زندگی کی داستان سناؤں اور ضرور سناؤں لیکن مختصراً پچھلے بارہ تیرہ سال بے شک اس میں شامل نہ کرنا کیونکہ تب تم محض بچی تھیں، اس کے بعد کیا ہوا وہ بتا سکتی ہو —"

اتنے میں ویٹر آگیا، لڑکی نے ضرور مہنگے کھانے چنے ہوں گے کیونکہ جرجیس کاغذ پنسل لئے حساب لگا رہا تھا اور جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ جب ویٹر نے اس سے

پوچھا تو آہ بھر کر بولا ــــ "خاتون کا کھانا لے آؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا کیونکہ میں عشق میں مبتلا ہوں اور بھوک سے بالکل مبرا ہوں ــــ"

کام کے اوقات ختم ہوتے تو جرجیس یک لخت چست ہو جاتا خیمے میں داخل ہوتا تو جیسے زلزلہ آ جاتا ــــ" چپ کیوں ہو، گراموفون بجاؤ، ریڈیو لگاؤ، شور مچاؤ، اور کچھ نہیں تو تاش ہی کھیلو، یارو کچھ تو کرو توبہ توبہ کیسے سست الوجود دوستوں سے واسطہ پڑا ہے، زندگی تباہ ہو گئی ہے۔

روز پوچھتا ــــ "جرجیس ہر ملک میں عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں، آرمینیا کوئی ایسی ہستی کبھی وجود میں آئی؟"

"اغیار ہمیں شہرت نہیں پانے دیتے۔ ویسے بھی بڑھاپے سے پہلے عظمت نہیں ملتی اور میں ابھی نو عمر ہوں ــــ دیکھ لینا دوست کسی نہ کسی دن میرا نصیب ضرور جاگے گا۔ حالات خود بخود ساز گار ہوتے چلے جائیں گے، جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا کامیابی ہو گی، یکے بعد دیگرے خوشخبریاں ملیں گی۔ میری جیبیں پُر رہا کریں گی اور ہر شام کو بغداد جا سکوں گا۔ دوسروں سے قرض مانگنے کی بجائے انہیں خوب ادھار دیا کروں گا۔ سب مجھ سے متاثر ہوں گے۔ میری قابلیتوں کا اعتراف کیا کریں گے ــــ"

لیکن حساب وال روز اسے بتاتا ــــ "جرجیس تمہاری حرکتوں اور نظریوں سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ زبوں حال رہو گے، اگر تمہاری ذہنی یا مالی حالت سدھر جائے تو میرا نام بدل دینا، میں نے جو کچھ سیکھا ہے اس پر لعنت بھیجوں گا ــــ"

ایک روز برٹن نے بھی جرجیس کو ڈانٹا "یہ تم ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہو، دنیا میں اور کام بھی تو ہیں"

جناب، لڑکیوں سے نہ ملا جائے تو ان سے محبت کیسے ہو. محبت نہ کی جائے تو ناکامی کیسے ہو اور محبت کی ناکامی کے بغیر غم کرنے کے موقعے کس طرح ملیں ــــ"

جرجیس نے جام خالی کرتے ہوئے بڑے ادب سے جواب دیا۔

اسے دوستوں کی خوشنودی کا ہر وقت خیال رہتا تھا، اکثر کہا کرتا کہ میں دوستوں کو ہمیشہ خوشخبری سنانے کا منتظر رہتا ہوں، بری خبر کبھی نہیں سناتا، بری خبر تو انہیں کسی اور سے بھی مل جائے گی لیکن جرجیس تو اس خبر کا جزو نہیں بنے گا۔

مہینے کی آخری تاریخ کو دجلے کے کنارے جرجیس نے برٹن سے کہا "جناب آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ میں نے لڑکیوں کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے"

برٹن مسکرانے لگا۔ روز جلدی سے بولا ـــ "اب جرجیس ہر وقت عورتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اس کی دائمی بے چینی اور تفکرات کی فقط تین وجوہ ہیں ــــ لڑکیاں، عورتیں اور خواتین ــــــ"

روز پکا ریاضی داں تھا بات بات پر سوال نکالنے بیٹھ جاتا۔ بغداد جانے سے پہلے یہ پوچھتا کہ بل ادا کرنے کا کام کس کے سپرد کیا جائے۔ پھر سب سے برابر برابر چندہ لے کر اس کے حوالے کرتا ــــ جب وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا دیکھیں گے تو ہم سب کو امیر سمجھیں گے، دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اپنی جیب کی حفاظت نہیں کرنی پڑے گی ــــ"

وہ بالکل گنجا تھا۔ اپنی مدافعت میں طرح طرح کی مثالیں پیش کرتا۔ چارلس دوئم گنجا تھا۔ موسم گرما میں سر کے مصنوعی بال اتار کر ٹہل رہا تھا کہ اتفاق سے ملکہ نے دیکھ لیا۔ اس حالت میں پہلی دفعہ دیکھ کر ملکہ نے چیخ ماری۔ بادشاہ بڑے بیار سے بولا، جان من گرمی بہت تھی مجبوراً بال اتارنے پڑے۔ فرانس کے لوئی چہاردہم نے عمر بھر اپنے گنجے پن کو کامیابی سے چھپائے رکھا۔ ملکہ الزبتھ گنجی ہوئی تو محل اور دربار کے سارے آئینے تڑوا دیئے۔ سکاٹ لینڈ کی حسین ملکہ میری اور فرانس کی مشہور میری انتوئنے بالکل گنجی تھیں لیکن یہ راز ان کی موت کے بعد افشا ہوا ــــ میں تو ایک معمولی سا سپاہی ہوں بادشاہوں والی حرکتیں تو کر نہیں سکتا۔ گنجا ہوں تو بس گنجا ہوں چھپاتا تو نہیں۔"

اس کی سالگرہ کی پارٹیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ کوئی لڑکی پارٹی سے گھر جانا چاہتی تو روز فوراً اعلان کر دیتا کہ آج تو اس کی سالگرہ ہے اس لیے جلد گھر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بار بار بلانے پر نہ آتی تو پیغام بھیجتا ــــ آج انگلستان میں عزیز واقارب میری سالگرہ منا رہے ہوں گے۔ میں یہاں بے یار و مددگار ہوں۔ کم از کم آج تو مایوس نہ کیجئے۔ غرضیکہ دوسرے تیسرے ہفتے یہ مبارک دن آ جاتا۔

لڑکیوں کو مدعو کرتے ہوئے بھی وہ ریاضی کے فارمولے استعمال کرتا۔ پیر کو میرے ساتھ چائے پیجئے ــــ نہیں میں پیر کو نہیں آ سکتی، اس دن میری دادی جان آ رہی ہیں ــــ اگلے روز پھر ٹیلیفون کرتا ــــ اچھا تو بدھ کی شام کو رقص پہ چلیں ــــ؟ نہیں بدھ کو نانا جان آ رہے ہیں ــــ تو پھر جمعرات کو پل پہ انتظار کروں؟ آخر تین

چار مرتبہ انکار کر کے وہ سنیچر یا اتوار کے لئے مان جاتی۔

روز بڑی سنجیدگی سے ہمیں سمجھاتا کہ "لڑکی کے چار پانچ انکار ہر مرتبہ برداشت کرنے پڑتے ہیں پھر اسے مجبوراً یا لحاظاً ہاں کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی سنیچر اتوار کے پروگرام مجھے موافق آتے ہیں اس لئے ہر ہفتے پیر کے دن سے پوچھنا شروع کر دیتا ہوں۔"

وہ حساب لگا کر بتاتا کہ دجلہ جن پہاڑوں سے نکلتا ہے وہ فرات کے پہاڑوں سے نیچے ہیں لہذا ان کی برف پہلے پگھلتی ہے تب ہی پہلے دجلے میں سیلاب آتا ہے پھر فرات میں۔ فرات کی سطح مقابلتاً اونچی ہے اس لئے فرات سے نہریں دجلے میں گرتی ہیں، راستے میں آب پاشی کرتی ہیں اور دونوں دریا سال میں پینتالیس لاکھ ٹن مٹی بہا کر لاتے ہیں۔

"اور جو پینتالیس لاکھ ایک ٹن یا چوالیس لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے ٹن لاتے ہوں پھر ــــ؟" جو جیس پوچھتا۔

کوئی کسی ناخوشگوار واقعے سے افسردہ ہو جاتا یا غم لگا لیتا تو روز اپنے فارمولے کے حوالہ سے سمجھاتا ــــ "ایسا واقعہ تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ دن تک بھلا دینا چاہئے رہ گیا یہ فکر کہ لوگ کیا کہیں گے۔ سو لوگوں کو ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس معاملے میں پبلک کا حافظہ بیحد کمزور ہے لہذا بہترین فارمولا یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنے آپ سے سیدھا سا سوال پوچھنا چاہئے۔ کہ کیا آج سے تین مہینے کے بعد آج کا واقعہ سچ مچ یاد رہے گا؟ اور اگر یاد رہا بھی تو میری نظروں میں تب اس کی اہمیت کیا ہوگی؟"

منصور سب میں کم گو تھا۔ الگ تھلگ رہتا۔ بغداد اکیلا جاتا۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ کوئی نئی حسینہ ہوتی لیکن محفلوں میں کبھی لڑکی کا ذکر اس کے ہونٹوں پر نہیں آیا۔ اس کی باتوں سے ہم فقط اتنا اندازہ لگا سکے کہ ایک تو اسے میدان کے باشندے اچھے نہیں لگتے اور دوسرے یہ کہ اسے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بہت شوق ہے اور اپنے وطن کی پہاڑیاں بہت عزیز ہیں۔

"سب سے دلکش اور روح پرور وہ ہوا ہے۔ جو گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان سے گزر کر آتی ہے" وہ کہا کرتا۔

"اسے اپنے گھوڑے سے اتنی محبت تھی کہ کیمپ کی موٹروں لاریوں کے باوجود اسے ساتھ رکھتا، اس کا ذکر اس طرح کرتا جیسے کسی دوست کی باتیں سنا رہا ہو۔ "اگر قصور پر سزا دو تو بے چارہ خاموشی سے برداشت کر لیتا ہے لیکن بلا وجہ مارو یا ڈانٹ دو تو روٹھ جاتا ہے اور کئی کئی دن چارہ نہیں کھاتا اس کی ماں ہمارے گھر میں رہتی ہے اس سے کوئی کام نہیں لیتے اور اس کی اتنی ہی عزت کی جاتی ہے جتنی کہ کنبے میں بڑی بوڑھیوں کی ہوتی ہے۔"

اور مجھے اپنے وطن کے گھوڑے یاد آ جاتے، ان کی زبوں حالی پر افسوس ہوتا آٹھ آٹھ موٹی تازی سواریاں بٹھا کر تانگے والے ہر دو منٹ کے بعد عادتاً چابک رسید کرتے ہیں۔

ایک دن میں نے عربی سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں کچھ نہ کچھ تو سمجھ لیتے ہو گے؟" منصور نے پوچھا۔

"فقط گنے گنائے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کی گردان بہت مشکل ہے۔"

"شہروں میں یقتل، قتلو، تقتل، قتلت، یقتلون ـــــ کے الفاظ تو بار بار سنے ہوں گے ـــــ؟"

"یہ تو میں نے بھی سنے ہیں ـــــ" روز بولا۔

"بس یہ قتل کی گردان ہے جو شہروں میں اکثر ہوتی رہتی ہے ـــــ اسی سے گرامر سیکھنے کی کوشش کرو،" منصور مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

موٹر سے ہرن کا شکار کھیلنے کا پروگرام بنا، برٹن نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہنے لگا کہ مجھے کسی زمانے میں شکار کا بہت شوق تھا لیکن ایک مرتبہ ہندوستان میں مہاراجے کی پارٹی کے ساتھ ہاتھیوں پر چڑھ کر شکار کھیلنے گیا، ہم اتفاق سے ایک دوسری شکاری پارٹی کی زد میں آگئے جو ہاتھیوں کا شکار کھیلنے آئی تھی ـــــ اس روز جو کچھ ہوا میں نے شکار سے توبہ کر لی۔ ان دنوں جیپ نہیں ملی تھی صحرا میں جو موٹریں تھیں اُن سے صحرائی ہرن ذرا تیز دوڑتا ہے، روز نے حساب لگا کر بتایا کہ پانچ میل فی گھنٹے کا فرق ہے، اس کا شکار مجھے اچھا نہیں لگا، اس سے تو یہ بہتر ہوگا کہ ہم ہرن کو دستی بم مشین گن سے ہلاک کر لیا کریں۔" منصور نے بھی موٹر سے کوئی فائر نہیں کیا کیونکہ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ شکار کو بچ کر نکل جانے کا پورا موقع ملنا چاہئے۔

پھر ہم دونوں گھوڑوں پر شکار کھیلنے نکلے۔ وہ کردستان کے جانوروں پرندوں کی باتیں سناتا، شکار کے قصے سناتے وقت اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں ـــــ "گھوم کر نیچے آتی ہوئی مرغابی، پتھر کی طرح دھم سے گرتا ہوا پرندہ لڑکھڑاتا ہوا زخمی ہرن ـــــ کوئی اور نظارہ بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے؟"

ہم لمبی سیر پر نکل جاتے، آبادی سے باہر نکلتے ہی وہ لمبا سانس لے کر ہوا سونگھتا
اب ویرانے کی جان پرور ہوا آئی ہے۔ اس کی تازگی تم نے بھی محسوس کی ہو گی۔
لوگ تنہائی اور ویرانی کا رونا روتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ انسان کے آنے سے
پہلے دنیا اجاڑ ہی تو تھی۔ ساری گہما گہمی اور چہل پہل اسی کے دم سے ہے مرد جس
جگہ خیمہ گاڑ دے وہیں رونق ہو جاتی ہے۔"

آداب و تکلفات کا ذکر چھڑتا تو وہ بتاتا — "شاید تمہیں میری باتیں عجیب
معلوم ہوتی ہوں۔ دراصل اس وقت پڑھا لکھا منصور نہیں بول رہا ایک
دیہاتی کرد تم سے مخاطب ہے — زندگی میں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ
پڑتا ہے۔ ترشی، بد کلامی، دنگے فساد سے مجھے نفرت ہے لیکن بعض اوقات
زندگی کی شاہراہ پر کوئی ایسا خبیث بھی سامنے کھڑا ہو کر راستہ روک لیتا ہے
جو فطرتاً بدگو، بدخو اور بدکردار ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر انسانیت اور شرافت
کے درس دینا اور راستہ چھوڑ دینا نری بزدلی ہے اس سے اسی زبان میں
گفتگو کرنی چاہیئے جسے وہ سمجھتا ہو اور ایسا سبق سکھانا چاہیئے کہ عمر بھر نہ بھولے۔"

میں نے اسے کبھی غمگین نہیں دیکھا — اس کی وجاہت، گستاخ سی مسکراہٹ
اس کے حوصلے اور اولوالعزمی سے سب متاثر ہوتے — "مرد کو ہمیشہ نیوٹرل گیئر
میں رہنا چاہیئے۔ کڑھنا، اپنے اوپر ترس کھانا، ناکامیوں پہ بہانے تراشنا بالکل
بے سود ہے۔ زندگی میں بارہا شکست ہو گی۔ کئی مرتبہ لوٹا جائے گا، بلاوجہ شبہ
کیا جائے گا، بغیر قصور سزا ملے گی، جیسے کیرم کھیلتے وقت اصلی نشانہ کسی اور
رخ میں ہوتا ہے لیکن زد میں کوئی اور آتا ہے اور حساس کسی اور طرف

لگتی ہے ـــــ اسی طرح بغیر کچھ کئے مرد دوسروں کی زد میں کئی مرتبہ آتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر سوچ لینا چاہئے کہ یوں ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہوا کرے گا۔ مرد کبھی ہراساں نہیں ہوتا اور کبھی ہار نہیں مانتا ـــــ"

میں نے ان حسین لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن سے وہ بغداد میں ملا کرتا۔

"ہاں کئی ہیں ـــ" وہ مسکرانے لگا۔

"کوئی منتخب کی؟"

"نہیں! دیر تک کنوارا رہنے میں یہی خرابی ہے ـــ جب شوخ و شنگ موسیقی سنتا ہوں تو چنچل سلامہ یاد آتی ہے جس کی موجودگی راگ رنگ کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے۔ پھیکی مٹیالی سی سہ پہر کو حزن کے مجسمے کیتھرائین سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ جو خنک و بے کیف فضا پر یوں چھا جاتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں بذلہ سنجی میں ناصرہ کا کوئی جواب نہیں۔ جب محض خرافات بکنی ہو تو روزلین جیسا رفیق ملنا محال ہے غضب کی پھکڑ ہے اور واہی تباہی ہانکنے میں بے مثال ہے۔ زندگی کے اداس لمحوں میں جی چاہتا ہے کہ بڑھ کر منیرہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ دلجوئی کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ بہت سے منصوبے باندھ لئے ہوں یا اپنے متعلق غلط فہمی ہونے لگی ہو تو مجیدہ کی تمکنت اور حسن بے پناہ کے سامنے سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے، خود پسندی اور انا کا بھوت اترتے دیر نہیں لگتی۔ اچھی چیزیں کھائے عرصہ گزر چکا ہو تو مستورہ بھلائے نہیں بھولتی جو اتنی نفاست پسندی سے خوش خوراکی پر آمادہ کرتی ہے کہ محض چند ہفتے میں وزن بڑھ جاتا ہے ـــ بتاؤ میں کیا کروں؟ یہ سب خوبیاں یا برائیاں جو مجھے پسند ہیں فقط ایک لڑکی میں

کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں ــــ؟ اور پھر مجھے شادی کا کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ اتنے گھمسان کے ایکشن کے باوجود اب تک کیونکر بچے ہوئے ہو؟"

"تم بخوبی جانتے ہو کہ جنگی چالوں میں حملے کا پلان بناتے وقت پسپائی کا پلان بھی بنایا جاتا ہے ــــ"

۰ سنیچر کی رات تھی۔ ہم رقص گاہ میں موسیقی سن رہے تھے۔ ایک لڑکی قریب سے گزری جرجیس نے اسے ٹھہرا لیا اور پوچھا ــــ"معاف کیجئے آپ کی میز پہ وہ خوبصورت سی لڑکی کون ہے ــــ؟"

"میں ــــ" اس نے جواب دیا۔

"مگر اس کے رخسار پر تو تل تھا ــــ"

"سرمے کا تل تھا۔ رومال سے اتر گیا ہوگا ــــ فرمایئے"

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ــــ شاید ملا بھی ہوں۔"

"آپ نے پتہ نہیں کیا کیا دیکھا ہوگا۔ ویسے میں آج صبح پہلی مرتبہ بغداد آئی ہوں ــــ"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے ــــ"

"اب آپ فرمائیں گے کہ میری شکل جانی پہچانی سی ہے۔ میں آپ کو خوابوں میں نظر آتی ہوں، یا آپ کو مدت سے میرا انتظار رہا ہے وغیرہ وغیرہ ــــ" وہ آناً فاناً غائب ہوگئی۔

جرجیس بہت خفا ہوا "میں نے دیکھا کسی اور کو تھا لیکن یہ خواہ مخواہ ڈانٹ

گئی — اب اس پر باقاعدہ عاشق ہو کر نہ دکھایا تو جر جبیس نام نہیں"
وہی لڑکی سامنے سے پھر بالکل تیر کی طرح گزر گئی اور جر جبیس کی طرف دیکھا تک نہیں۔
وہ کچھ دیر تلملاتا رہا پھر سیدھا لڑکیوں کے جھنڈ پر بیل کی طرح حملہ آور ہوا لیکن فوراً واپس آگیا۔
"رقص کے لئے کہا لیکن نہیں مانی —"
جب موسیقی شروع ہوتی تو جر جبیس تیزی سے اُس طرف جاتا اور انکار کرا کے واپس آجاتا۔
ایک دفعہ جو گیا تو بھاگا بھاگا واپس آیا — "وہ کہتی ہے کہ یہاں اتنے لڑکے بیٹھے ہیں جو تم سے ہزار درجے بہتر ہیں بھلا تم میں ایسی کون سی خوبی ہے جس پر اترا رہے ہو؟ للّٰلہ کوئی منہ توڑ جواب سوچئے تاکہ اسے خاموش کرا سکوں"
میں نے مشورہ دیا کہ اسی موضوع پر فارسی کا ایک شعر ہے کہ گلشن میں صبح صبح بلبل نے گلاب کے پھول سے کہا کہ چاروں طرف کتنے پھول کھلے ہوئے ہیں جو رنگ روپ میں تجھ سے کہیں بہتر ہیں پھر تجھے کس بات پہ ناز ہے؟ گلاب کے پھول نے جواب دیا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے مگر یہ انداز گفتگو کیسا ہے کبھی کوئی اپنے محبوب سے اس طرح کلام کیا کرتا ہے؟
وہ سرپٹ دوڑا گیا — پھر واپس مشورہ لینے آیا، پھر چلا گیا، اس مرتبہ جو آیا تو پیچھے پیچھے وہ آئی — "تو آپ اسے پڑھا پڑھا کر بھیج رہے ہیں خود میدان میں کیوں نہیں آتے —؟"

ہم سب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ فوراً دوسری طرف چلے گئے اتنے میں ایک نہایت پیاری سی لڑکی آئی اور گروہ میں شامل ہوگئی —— اس کے رخسار پر تل تھا۔

"یہ آپ کا تل ——" جرجیس کچھ ہانکنے لگا تھا لیکن ایک دوسرے سے تعارف ہوچکا تھا اس لئے اسے خاموش ہونا پڑا۔

"یہاں آنے سے پہلے آپ نے عراق کا نام سنا تھا —— ؟" ایک لڑکی نے پوچھا

"بچہ بچہ اس نام سے آشنا ہے ——" میں نے تاتریاق از عراق آوردہ شود، مارگزیدہ مردہ شود —— کا ترجمہ سنایا۔

"اور بغداد —— ؟"

"بغدادی چور کو کون نہیں جانتا —— ؟"

"اور بصرہ —— ؟"

"اس پر تو گیت گائے جاتے ہیں —— ایک حسینہ المعروف بہ چھٹی ہند سے فرار ہو کر بصرہ پہنچ گئی ہے۔ سارے نوجوان مل کر ایک لٹھ باز سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کسی طرح چھٹی کو گھیر کر واپس لے آئے۔"

"یہ تو کچھ نہیں ہے ——" تل والی نے منہ بنا کر کہا۔

موہن میرے کان میں بولا "خاں صاحب میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی —— ایک اخبار میں DOG RACE کا ترجمہ کتوں کی گھڑ دوڑ خود میں نے پڑھا تھا ——"

"آپ کے ہاں رومانی گیت بھی تو ہوتے ہوں گے ——"

"پہلے ہوا کرتے تھے لیکن اب فقط فلمی گانے رہ گئے ہیں ۔" میں نے جواب دیا۔

"پرانے گیتوں میں سے کوئی سنائیے ۔"

"سہیلیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی ہیں ۔ ایک کہتی ہے میرے چھیل چھبیلے بانکے سپاہی کو دیکھا، اس رنگ رنگیلے جھوٹے ہرجائی کا کیا پوچھتی ہو۔ اس جیسا زمانے میں کوئی نہیں ہے ۔"

" ہائے اللہ تمہارے ہاں جھوٹے محبوب کو بھی پسند کیا جاتا ہے ۔ ؟"

"من موہنا اور دلچسپ محبوب جھوٹا بھی ہو تو اس محبوب سے کہیں بہتر ہے جو سچ بولتا ہو مگر ہونق اور ٹھس ہو ۔ اور پھر محبوب سے الفت اس کی خوبیوں کی بنا پر تھوڑا ہی کی جاتی ہے، محبت تو اس کی برائیوں کے باوجود بھی ہو جاتی ہے ۔ یہ چھوٹی موٹی چالیں، ذرا سا جھوٹ، تھوڑی سی ہیرا پھیری ۔ ایک دوسرے کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے بھر پور حملہ اور جیتنے پر ساری شرطیں منوانا ۔ محبت اور جنگ دونوں میں جائز ہیں ۔"

"ہوں گی ۔ لیکن نہ ہمیں جنگ پسند ہے اور نہ سپاہی ۔ سپاہیوں سے ہم اس لئے کتراتے ہیں کہ وہ بغیر بتائے کسی دن دور چلے جاتے ہیں ۔"

" اگر وہ چلتے پھرتے نہ رہیں تو ان سے ملاقات کیوں کر ہو ۔ ؟"

"لیکن ایک مشرقی لڑکی کسی ہرجائی کو کیسے پسند کر سکتی ہے ؟" تل والی نے پوچھا۔

"یہ مشرقی لڑکی کیا ہوتی ہے ؟ مشرقی ایشیائی جنوبی مغربی وغیرہ کی صفت محض دُم چھلا ہے ۔ لڑکی ہر جگہ لڑکی ہوتی ہے اور محبوب محبوب ہوتا ہے، ہرجائی ہو یا کچھ اور ۔"

"ہمیں کوئی اچھا سا گیت سنائیے ـــــ" اُس کے نازک ہونٹ ہلے۔
بابا فرید کی کافی ـــ ڈیہنہ سہاگ دے آوندے ہن ـــ کا بالکل آزاد ترجمہ سنایا ـــ "ایک حسینہ سوچ رہی ہے ـــــــ

یہ اچانک زیور کیوں بجانے لگے ہیں؟
کہیں سہاگ کے دن تو نہیں آرہے؟
صحرا میں تتلیاں کہاں سے آ گئیں؟
ویرانوں میں شادابی کون لے آیا؟
ایسی سہانی رُت تو کبھی نہیں آئی۔
میرے اللہ، کیا ہونے والا ہے ـــ؟"

"ہائے یہ تو بے حد لطیف ہے ـــ" اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ تل اور بھی نمایاں ہو گیا ـــــ اس کا نام سعدا تھا۔

جس سے جرجیس کی لڑائی ہوئی تھی وہ بوئی زا تھی جس کے ہاتھ کچھ سرخ تھے۔ شاید مہندی سی لگا رکھی تھی۔ جرجیس کی زبانی اس شعر کا ترجمہ اسے سنوایا۔

کل کے مہندی کبھی دریا میں نہایا نہ کرو ـــ آگ پانی میں مری جان لگایا نہ کرو
(آگ پانی میں ـــ کی جگہ ـــ آگ وچلے ہیں ـــ استعمال کیا گیا)

"ایسی ماڈرن لڑکیاں تو ہر جگہ مل جاتی ہیں ـــ" رودر بولا "یہاں کی اصل لڑکیوں سے بھی ملاقات ہونی چاہیے ـــ"

ہم نے اسے بتایا کہ یہاں کی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی، ملاقات کا وقت تک مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ دن تو آسان ہیں ـــ اتوار یوم الاحد ہے اس سے

آگے انگلیوں پہ گن سکتے ہیں یہ بھی پتہ ہے۔ ایک بجے الساعۃ واحدہ ہوتی ہے الساعۃ خمس پہ پانچ بجتے ہیں لیکن جب کوئی الساعۃ واحدہ و نصف الا خمس و دقائق کہہ کر چل دے تو فرشتوں تک کو خبر نہیں ہوتی کہ اس نے ایک بج کر پچیس منٹ کا وقت دیا ہے یا الساعۃ اثنتان و ثلث سے مراد دو بج کر بیس منٹ ہے۔"

"لیکن زبان تو سیکھنی پڑے گی۔"

میں نے منصور سے کہا کہ مقامی باشندوں سے ملنا چاہیے اس طرح زبان سیکھنے میں آسانی رہے گی۔

"اب تم سے کئی ملیں گے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

چنانچہ سلیم خود ملنے آیا۔ چھوٹے قد کا پلا ہوا چکنا چپڑا سا نوجوان، موٹی ابھری ہوئی ناک۔ بازوؤں، کلائیوں، گردن اور کانوں پہ بال ہی بال تھے۔ مگر سر پہ کچھ بھی نہیں تھا۔

"بزنس کے علاوہ اس سے کسی بھی موضوع پہ بات کرو۔" منصور نے ہمیں مشورہ دیا۔

"مسعودی نے لکھا ہے کہ بغداد میں۔"

"مسعودی کون تھی۔؟" سلیم نے گھبرا کر پوچھا۔

"مسعودی کون تھا۔ اپنے زمانے کا مشہور مورخ۔"

"مورخ تھا؟۔ اچھا!"

"جب ابن بطوطہ بغداد آیا تو اسے یہ شہر پسند نہیں آیا۔"

"کیوں ---؟" وہ چونکا

"یہ اس کے سفرنامے میں پڑھئے ---"

"ابنِ بطوطہ کون تھا --- ؟"

"سیاح تھا ---"

"سیاح تھا؟ --- اچھا!"

بار بار --- کون تھا؟ --- اور اچھا! دوہرائے گئے۔

اس کے جانے کے بعد منصور نے بتایا کہ یہ بغداد میں رہتا ہے --- "میں نے کہا تھا ناکہ شہریوں سے ملنا بیکار ہے ---"

"مگر یہ آیا کس سلسلے میں تھا؟"

"سعدہ کا عاشق ہے تم سے ملنے آیا تھا"

"کہیں خفا تو نہیں ہو گیا؟"

"نہیں --- پھر آئے گا"

اگلی دفعہ آیا تو اپنے ساتھ ایک موٹا تازہ چکنا گنجا دوست لایا جو مدرسہ کا مدرس تھا۔ فوراً منصور نے چوٹ کی --- "یہ بتائیے کہ ہمارے بڑے بڑے عالم الاصفہانی، المصری، البیرونی البلخی، الہندی، الخوارزمی کوئی تھے؟ کوئی العراقی، البغدادی یا الموصلی بھی گزرا ہے؟

"الکروی بھی کوئی نہیں تھا ---" سلیم کا دوست بولا۔

"پہلے میرے سوال کا جواب دیجئے ---"

"عربی ادب کی جامع فہرست کیا البغدادی نے مرتب نہیں کی تھی؟"

"لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ بزرگ یہاں کے تھے یا یہاں کچھ عرصے کے لئے مقیم رہے تھے کیونکہ یہ کتاب قسطنطنیہ میں مرتب ہوئی تھی۔"

"مان لیا کہ بغدادیوں نے کچھ نہیں کیا۔ کردوں نے کون سے تیر مارے تھے؟"

"کردوں نے چنگیز خاں کی فاتح فوج کو پہلی مرتبہ شکست کا مزہ چکھایا۔ اس کے بعد طولی خاں کو خوار کیا، اگر کرد اُسے نہ روکتے تو اُسی ریلے میں منگول شمالی افریقہ تک جا پہنچتے۔ کردوں نے چنگیز کے پوتے ہلاکو کو بغداد جانے والی شاہراہ سے نہیں گذرنے دیا۔ مجبوراً اسے ایران سے ہو کر بغداد آنا پڑا۔ بغداد کو تباہ کرکے اس کی فوجیں ہماری پہاڑیوں کی طرف آئیں تو ہم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔۔۔"

"یہ تو آپ ساری قوم کا ذکر کر رہے ہیں۔۔۔ کسی ایک کرد کا نام لیجئے۔۔۔"

"غازی صلاح الدین ایوبی جیسا عظیم انسان آج تک کسی اور ملک نے پیدا کیا ہے۔۔۔؟"

سلیم کا دوست خاموش ہو گیا لیکن سلیم نے گلا صاف کرتے ہوئے شکایت کی۔۔۔ "جب جانتے ہو کہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر ایسے سوال کیوں پوچھتے ہو۔۔۔ اگر میں پوچھوں کہ چمڑے کا بھاؤ کیا ہے؟ آج کل فولاد خریدا تو نفع ہوگا یا نقصان؟ کپاس اور چاول کے نرخ کس طرف جا رہے ہیں تو پھر؟"

واپسی پر مقصود کہنے لگا کہ ہمارا گاؤں بھی دیکھنے پر ہے لیکن وہاں اور یہاں

کے لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

فرات کی طرح دجلہ بھی ترکی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ کردستانی پہاڑیوں کے بعد جب میدانی علاقہ آتا ہے تو دجلے میں دو دریا گرتے ہیں، جو خاصا لمبا ہے۔ اسے الزاب الاعلیٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو الزاب الاسفل (تقریباً پچاس ساٹھ میل کے فرق پر کسی دریا کو سقلہ کہنا زیادتی ہے) شمال میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں دجلہ و فرات تقریباً آپس میں مل جاتے ہیں، میدانوں میں نہریں انہیں ملاتی ہیں۔ پھر قرنا کے قریب دونوں واقعی مل کر شط العرب بن جاتے ہیں اور بالآخر خلیج فارس میں جا گرتے ہیں۔ شروع سے آخر تک ان کی یہی کوشش رہتی ہے کہ قریب قریب رہیں۔ دونوں میں طغیانی آتی ہے۔ دونوں گدلے ہیں۔ دونوں ویرانے سے گزرتے ہیں، دونوں کے کناروں پر قدیم ترین تہذیبوں کے نشان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرات اور اس کے انگریزی نام یوفریٹیز میں کچھ مطابقت ہے لیکن دجلے کا ٹگرس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح اسی علاقے میں آیا تھا اور یہ کہ باغِ عدن قرنا کے قریب واقع تھا (لیکن عدن والے مصر ہیں کہ ہمارے یہاں تھا) پرانے زمانے میں دونوں دریا علیحدہ علیحدہ سمندر میں گرتے تھے آہستہ آہستہ مٹی سے دہانے اٹتے گئے۔ نئی زمین بنتی گئی اور سمندر دور ہٹتا گیا

ان دریاؤں اور ان کی مٹی نے میسوپوٹیمیا یعنی دوآبے کو ہزاروں سال سے زرخیز بنائے رکھا۔ تقریباً چھ ساڑھے چھ ہزار سال پہلے دنیا کی سب سے

پرانی قوموں کی ملاقات غالباً خلیج فارس کے ساحل پر ہوئی۔ تین مختلف نسلوں کے انسان آپس میں ملے۔ دراوڑ جو شاید ہندوستانی تھا کہ ان کی طرف سے آیا تھا حامی افریقہ سے اور منگول وسط ایشیا سے۔ یہاں سبزہ تھا پانی کی افراط تھی ان دنوں نسل، رنگ اور نیشنلزم وغیرہ کا امتیاز نہیں تھا یہ لوگ متحمل تھے لہذا اکٹھے رہنے لگے اور انسان نے پہلا گاؤں دجلہ وفرات کے کناروں پر آباد کیا لیکن بہت جلد دو آبے کی خوشحالی کی خبر ادھر ادھر پہنچ گئی اور اغیار کشاں کشاں آنے لگے نسل انسانی آہستہ آہستہ مہذب ہو رہی تھی چنانچہ جنگیں شروع ہو گئیں ۳۰۰۰ قبل از مسیح کے لگ بھگ پہیہ ایجاد ہوا تاکہ حملہ کرنے اور بھاگنے میں آسانی رہے تانبے کا استعمال شروع ہوا، آئینہ بنایا گیا اور اس کے ساتھ میک اپ کا سامان۔۔۔ تاکہ خواتین ہر جگہ لیٹ پہنچ سکیں۔

جنوبی علاقے میں سمیرین لوگوں نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور سیلاب عظیم کی کہانی بیان کی (جو طوفانِ نوحؑ کے تذکرے سے ملتی جلتی ہے) پہلے اشیا کا مبادلہ اشیاء سے ہوتا تھا، انہوں نے چاندی رائج کر کے "زر" کا ریکٹ شروع کیا۔ زر کے ساتھ لکھا پڑھی بھی لازمی تھی چنانچہ "میخی رسم الخط" جاری کرنا پڑا اور روپے پیسے کے سلسلے میں انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ان بابلوں کے قصے جہاں جہاں پہنچے حملہ آور ساتھ لائے۔ شمال سے سامی لوگ آدھمکے عکادیوں نے دیکھا دیکھی حملے شروع کئے جو چار سو برس تک جاری رہے (ایک دفعہ پہاڑیوں کی سمت سے حملہ شروع ہو جاتے تو ختم ہونے میں نہیں آتا) حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ تنگ آ کر سمیرین لوگوں کو باقاعدہ جنگِ

آزادی لڑنی پڑی اور غیر ملکیوں کو بھگانا پڑا۔ انھوں نے دوبارہ آزاد ہو کر بابل بسایا۔ بابل کے معنی تھے، دیوتا کا دروازہ۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے بتایا کہ ان کی زبان میں بابل انتشار کو کہتے ہیں (یہودی ہمیشہ الٹا مطلب نکالتے ہیں) بابل کا شہر ہندوستان تک پہنچا تو ہندی حملہ کرنے کی بجائے، بابل کے دیس، اور بابل مور انہیں چھوڑ جائے گا کہ محفوظ ہو گئے۔

سمیرین لوگوں نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے کے لئے پہلی مرتبہ ثالث مقرر کئے (تنازعے چکانے کا یہ طریقہ پانچ ہزار سال سے استعمال کیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ فیل ہوتا ہے)

ان لوگوں کو جنت و جہنم کے بارے میں کوئی علم نہ تھا چنانچہ ان کا مذہب فقط اسی دنیا تک محدود تھا۔ ان کے مشہور بادشاہ حمورابی نے مٹی کی تختیوں پر اپنے ماتحتوں کو خطوط لکھوائے۔ اسے اپنی زندگی میں شبہ تک نہ ہوا کہ مکاتیب حمورابی کے ذریعے وہ دنیا کے اول ترین قوانین وضع کر رہا ہے۔ ان دو سو بیاسی قوانین کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کافی تہذیب یافتہ تھے، کیونکہ ان کے ہاں انکم ٹیکس والے تھے اور رشوت اور سفارشیں قبول کرنے والے افسر بھی۔ حمورابی نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کیا — آزاد لوگ، نیم آزاد اور غلام! (یہ تقسیم مدتوں تک رہی اور اب بھی ہے) ہر چیز کی قیمت مقرر کی گئی اور پبلک سے کہا گیا کہ ایک سے زیادہ شادی نہ کریں۔ قافلوں کا کرایہ نامہ اور ٹائم ٹیبل بنایا گیا۔ قرض کے سلسلے میں سود رائج کیا گیا اور سزائے موت کی قسمیں وضع کی گئیں — مثلاً

زہر دینا، دریا میں ڈبونا وغیرہ۔ ٹھیکیداروں، طبیبوں اور آئینشل کارروائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ یعنی مکان کے قبل از گارنٹی گر جانے سے رہنے والے کا بچہ مر جائے تو مکان تعمیر کرنے والے ٹھیکیدار کے بچے کو مار دیا جاتا تھا۔ بے توجہی یا لالچ کرنے پر طبیب کو فوراً احکام پکڑ کر لے جاتے تھے۔ طبیبوں کے پاس تہریں تھیں جنہیں وہ نسخوں پہ لگاتے تھے اس زمانے کے نسخے نہایت مختصر ہوتے تھے۔ مثلاً دانت کے درد کے لئے سورج مکھی پیس کر لگاؤ، پیٹ میں درد ہو تو دودھ پیو، گنجے پن کے لئے سر پہ شراب اور تیل کی مالش کرو، کسی کے پاس رقم یا جائداد ہو مگر اس کا دفتری ثبوت نہ ہو تو سزائے موت ملتی تھی تہمت لگا کر ثابت نہ کر سکنے پہ بھی سزائے موت جرمانے امیروں کے لئے زیادہ تھے اور غریبوں کے لئے کم۔

آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت ـــــ والا مشہور قانون بھی حمورابی کا ہی تھا۔ ان سخت قوانین نے (جن میں غالباً سب سے نرم سزا موت کی تھی) رعایا کے حقوق اور ان کی ملکیت کی پوری پوری حفاظت کی اور عورتوں کو مردوں کے برابر کھڑا کیا۔ وہ مردوں پر مقدمے دائر کر کے ان سے طلاق لے سکتی تھیں اور جائداد پر قبضہ کر سکتی تھیں۔

ان دنوں ایک خاص وضع کی عمارت بنانے کا عام رواج تھا۔ پختہ اینٹوں میں گھاس اور نرسل کی تہیں جما کر ایک عظیم الشان چبوترہ تعمیر کیا جاتا جس کی سات منزلیں ہوتیں جو بلندی کے رُخ سکڑتی چلی جاتیں ـــــ اسے زگورت کہا جاتا۔ دن کو یہ مندر کہلاتیں اور رات کو اس کی سیڑھیوں سے ستاروں کا

مطالعہ ہوتا۔ بابل کا مینار جو تباہ ہوا تھا اسی قسم کا تھا چند زگرت اب بھی موجود ہیں۔ اور ان کی تہوں میں جمی ہوئی خشک گھاس اونٹ کھاتے ہیں۔

بیسویں صدی قبل از مسیح میں پھر ہڑبونگ مچی۔ شمال سے خانہ بدوشوں نے ہلہ بول دیا، حلبیلی آئے کیستی آئے اور سمیرین حکومت تباہ ہو گئی۔ اس مرتبہ حملہ آور گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ بابل والوں نے پہلی مرتبہ اس جانور کو دیکھا تو اسے پہاڑی گدھا کہا۔ (بابل والے شیر کو بڑا سا کتا اور موتیوں کو مچھلی کی آنکھیں کہا کرتے تھے غالباً انہیں غلط نام رکھنے کا شوق تھا) اس مرتبہ شمال میں دجلے کے کنارے بڑی مشقت پسند اور توانا قوم آباد ہو گئی۔ یہ آشور کو دارالخلافہ بنا کر آشورین کہلانے لگے ان کا مقولہ تھا۔ کہ ہر وقت لڑتے رہنا ہی بہترین دفاع ہے چنانچہ جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ وہ یہ کہ مار مار کر دشمن کا بھرکس نکال دو (قیدیوں کا بھی) پھر مفتوحہ شہروں پر اچھی طرح ہل چلا کر بیان دے دو کہ ہمیں تو دشمن سے خطرہ تھا۔ اسی ڈر سے ہم اپنا دفاع کر رہے تھے۔

شروع شروع میں یہ ڈنڈے مار نظریہ خاصا کامیاب ثابت ہوا۔ بابل کو تلوار سے مطیع کرنے میں دیر لگی تو دریا کا رخ بدل دیا، شہر میں پانی آگیا اور لوگ بھاگ نکلے۔ اس قدیم پایۂ تخت کو تباہ کر کے نئے دارالحکومت کی فکر پڑی۔ افسوس بھی ہوا کہ اگر زیادتی نہ کی ہوتی تو مناسب ترمیم و اضافے کے بعد بابل اچھا بھلا دارالحکومت بن سکتا تھا۔ آخر واپس شمال کی طرف گئے اور دجلے کے کنارے نینوا چنا جو معمولی سا گاؤں تھا نئے شہر کی تعمیر کافی

مہنگی پڑی، جگہ جگہ دیواروں پر لمبی لمبی داڑھیوں والے شیر بنائے گئے۔ جن کے کندھوں پر بڑے بڑے پر تھے (یہ شیر برٹش میوزیم میں رکھے ہیں) داڑھیوں والے بیل بھی نصب کئے گئے آشوریوں کو انسانوں سے زیادہ حیوان پسند تھے)

حمورابی کے قوانین منسوخ کرنے کے بعد انھوں نے دنیا کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ (آشوریوں کے طرفدار کہتے ہیں کہ بے چاروں کو اتنا کڑا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا کہ ادائیگی کے لئے مجبوراً دوسرے ملکوں میں لوٹ مار کرنی پڑتی تھی)، لیکن دوسرے ملکوں کو بھی آشوری فلسفۂ حیات معلوم ہو چکا تھا چنانچہ آشوریوں کی سلطنت سو برس بھی نہ چلی۔ نینوا کی تباہی پر (جو آشوریوں کے پسندیدہ طریق سے شہر پر ہل چلوا کر کی گئی تھی) سارے ملک خوش ہوئے اس واقعے کے دو سو سال بعد یونانی مورخ زینوفن نینوا سے گزرا تو وہاں نہ نینوا تھا نہ کوئی آشوری۔

ویسے آشوری اتنے برُے بھی نہیں تھے، کبھی کبھی جب جنگ و جدل سے فرصت ملتی تو حطیطیوں کی لکھی ہوئی تختیاں اکٹھی کر کے فہرستیں بناتے۔ آخری آشوری بادشاہ آشور بنی پال نے دنیا کی پہلی لائبریری بنائی۔ لائبریری کے کھنڈر سے بائیس ہزار پختہ مٹی کی تختیاں ملی ہیں (جو حسب معمول برٹش میوزیم میں ہیں) فہرست کتب کے علاوہ اس کے مختلف سکشن تھے — مذہب، سائنس، تاریخ، ادب — لیکن مصنف آشوری نہیں تھے) ہر تختی پر شاہی حکم درج تھا کہ اسے لائبریری سے باہر لے جانا منع ہے۔

ویسے بھی ایسی کتابوں کا چرانا کافی مشکل ہوتا ہوگا۔ اتنی وزنی چیز کوئی چھپا کر نہیں لے جا سکتا۔ خصوصاً جب کتاب کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا بھی ڈر ہو۔

اب میدین لوگوں کی باری آئی — یہ بڑی زبردست قوم تھی۔ جب سقتین لوگوں نے ان پر حملہ کیا تو لڑتے رہے ہار نہیں مانی حتیٰ کہ اٹھائیس برس گزر گئے۔ اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ حملہ آور تنگ آ کر واپس لوٹے تو معلوم ہوا کہ عورتوں نے پہلے تو انتظار کیا پھر غلاموں سے شادیاں کر لیں۔ چنانچہ آقاؤں نے اپنے دارالحکومت کو گھیر کر تلواریں نکال لیں۔ غلاموں اور غلام زادوں نے مقابلہ کیا۔ کئی دنوں کی شدید لڑائی کے بعد کسی جہاں دیدہ بزرگ نے مشورہ دیا کہ اپنے غلاموں سے برابر کا سلوک کرنا نری بے وقوفی ہے۔ کل تلوار کی بجائے ڈنڈے، گالیاں اور دُرّے استعمال کرو۔ لہٰذا اگلے روز آقا گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھے اور غلاموں کو ڈنڈوں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا — غلاموں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے اور مشہور ذہنیت کا ثبوت دیا۔

ساتویں صدی قبل از مسیح میں کلدانی آئے۔ کیونکہ کلدانی دستِ خاص سے نینوا پر ہل چلا چکے تھے، اس لئے آتے ہی انہیں دارالحکومت کی فکر پڑی۔ نینوا کو از سرِ نو تعمیر کرنے میں جگ ہنسائی کا ڈر تھا اس لئے مجبوراً پرانے بابل کو چنا۔ بابل جدید میں کلدانی بادشاہ بنوکد نظر نے چالیس برس تک حکومت کی۔ جوانی میں کسی پہاڑی دوشیزہ سے شادی کر بیٹھا تھا جو اُن تپتے ہوئے میدانوں میں پہاڑوں کو یاد کر کے آنسو بہایا کرتی۔ بادشاہ نے بہتیرا سمجھایا بجھایا آخر اُسے

معلق باغات تعمیر کرنے پڑے جو بعد میں زمانہ قدیم کے سات عجائبات میں شامل ہوئے۔ معلق باغات کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی ہیں کہ وہ کس وضع کے تھے۔ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ لاہور کی شملہ پہاڑی سے ملتے جلتے تھے۔ بعد میں حملہ آور جو ایران سے آئے تھے ان معلق باغوں کو دیکھ کر بہت ہنسے کیونکہ ایران میں لاتعداد ایسے باغ تھے جو معلق نہیں تھے۔ انھوں نے ان باغوں کو غیر فطری قرار دے کر تباہ کر دیا۔

شاید ملکہ معلق باغات سے بھی مطمئن نہیں ہوئی کیونکہ ان میں پھول، پرندے درخت وغیرہ تو تھے خنکی نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ بیوی کی دائمی افسردگی سے تنگ آکر بنوکدنظر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اس کے عہد میں علم ہیئت کو بڑی ترقی ہوئی اور دنیا کا پہلا کیلنڈر مرتب ہوا۔ پھر بادشاہ نے بیزار ہو کر دوروں پہ جانا شروع کر دیا اور مصریوں کو شکست دی۔ پھر یروشلم کو تباہ کر کے اتنے سارے یہودی غلام ساتھ لے آیا کہ بغداد میں اب تک یہودی ہیں۔ یہودی ایک دفعہ کہیں آجائیں تو پھر واپس نہیں جاتے، ویسے یہ لوگ آشوریوں سے مختلف تھے اور مقابلتہً صلح پسند تھے اور ان کی ایک کہاوت تھی کہ لوگ لڑ رہے ہوں تو کان دبا کر چپ چاپ ایک طرف نکل جاؤ ورنہ گواہ بننا پڑے گا اور عدالت میں جو درگت گواہ کی بنتی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

بنوکدنظر نے دجلے پہ بند تعمیر کیا۔ نہریں کھدوائیں۔ جہاں اس میں کئی خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا۔ ہر وقت وہ بابل ہی کی توسیع کرتا رہتا تھا بسے بسائے شہر کو تین مرتبہ پھر بسایا۔ نئے محل بن رہے ہیں، سڑکیں چوڑی

کی جا رہی ہیں۔ بلکہ اچھی بھلی سڑکوں کے اوپر بلاوجہ نئی سڑکیں بن رہی ہیں۔ رعایا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا اور شہر کی سطح اونچی ہوتی گئی۔ شاید گمنامی کے ڈر سے اس نے ہر اینٹ پر اس قسم کے فقرے لکھوائے۔

"کیا میرا تعمیر کردہ بابل دنیا کا عظیم ترین شہر نہیں ہے؟"

"میں شاہ بنوپلیسر کا بیٹا شاہ بنوکد نظر والی بابل ہوں"

یہ اینٹیں اب بھی موجود ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے سیاح اور مورخ کافی متاثر ہوئے۔ زینوفن متاثر ہوا۔ پھر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس متاثر ہوا۔ ہیروڈوٹس بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا تب ہی اسے بابائے جھوٹ بھی کہا جاتا ہے مثلاً اس نے جنگ مراتھون میں شکست خوردہ ایرانیوں کی تعداد لاکھوں میں بتائی ہے لیکن چند سال ہوئے وہاں فوجی مشقیں ہوئیں تو مراتھون کے میدانِ جنگ میں ایک برگیڈ بھی پوری طرح نہیں سما سکا۔

لیکن تشہیر سے فاتح کچھ اتنے متاثر نہیں ہوئے۔ ایرانیوں کے طاقِ کسریٰ میں بھی یہی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ عربوں نے بھی تعمیر کے سلسلے میں بنوکد نظر کے شہر کا ملبہ استعمال کیا۔ بہرحال اتنی ساری اینٹوں پر دستخط کرنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کلدانیوں کے بادشاہوں کے پیچیدہ سے ناموں سے لوگ مانوس نہیں ہیں۔ البتہ بنوکد نظر کو سب جانتے ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ اگر آج فرعون مصر بھی آ ئیں تو اپنے اہرام، بت اور مندر دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے لیکن اس دوآبے کے قدیم بادشاہ آئیں اور انہیں سخت مایوسی ہوگی کیونکہ ان کی ایک نشانی بھی تو باقی نہیں رہی۔ مصر میں

پتھر ہے اور یہاں فقط اینٹیں تھیں وہ بھی آدھی کچی آدھی پکی اور ساتھ ساتھ حملہ آوروں اور سیلابوں کی یلغار۔ مصری الگ تھلگ رہتے اس لئے خوش تھے۔ انہیں مذہب اور اگلی زندگی کا شروع سے خیال تھا، مصری بلیوں کو متبرک مانتے تھے، چنانچہ ایک عقل مند حملہ آور آٹھ دس ہزار بلیاں ساتھ لے آئے۔ اور جنگ شروع ہوتے ہی بلیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا تو مصریوں نے فوراً ہار مان لی)

دوآبے کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اب زوال شروع ہو رہا تھا۔ تین ہزار سال قبل دوآبے کے ایک شاعر کی نظم "قنوطیت" سے اس انحطاط کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

آقا اور غلام آپس میں باتیں کر رہے ہیں ــــ

"خادم کچھ کہوں؟"

"ارشاد! آپ جو فرمائیں گے بجا فرمائیں گے!"

"محبت کرنے کو جی چاہتا ہے ــــ"

"ضرور کیجئے حضور! محبت دکھ درد بھلا دیتی ہے"

"نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے ــــ"

"بہت اچھا کیا۔ محبت تو ایک پھندا ہے ایک بھیانک عمیق غار ہے۔ اور عورت ایسی تیز تلوار ہے جو قریب آ جائے تو موت یقینی ہے ــــ"

"خادم کچھ کہوں؟"

"فرمائیے! میں حضور سے متفق ہوں ــــ"

، مقدس پانی لاؤ وضو کر کے عبادت کروں گا،

، ضرور کیجیے حضور، عبادت سے دل صاف اور دیوتا خوش ہوتے ہیں،

، نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے،

، بہت اچھا کیا، بار بار گڑگڑانے سے دیوتا اکڑنے لگتے ہیں،

انہوں نے آپ کے لئے کیا کیا ہے جو آپ احسان مند ہوں —،

، خادم کچھ کہے ؟،

، فرمایئے حضور، میں آپ کا ہم خیال ہوں،

، غریبوں کو خیرات نہ دی جائے ؟،

، ضرور دیجیے حضور، اس سے کئی گنا آپ کو ملے گا،

، نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے —،

، بہت اچھا کیا، سخی کا دیوالہ بھی نکل جائے تب بھی سائل مطمئن نہیں ہوتے،

قبرستان میں جا کر دیکھئے سخی اور کنجوس ایک ہی زمین میں دفن ہیں،

کئی موضوع آتے ہیں لیکن یہ اکتاہٹ یہ بیزاری نہیں جاتی۔ آخر طے ہوتا ہے کہ ہر شئے بے معنی ہے، بیکار ہے آخر تنگ آ کر آقا کہتا ہے —

، خادم کچھ کہوں ؟،

، ارشاد میں حضور سے متفق ہوں،

، اگر یہی زندگی ہے تو کیا کریں ؟ خود کشی کرلیں ؟،

، ہم مجبور بندے ہیں۔ کسی نے دنیا کو بھی محیط کیا ہے ؟ آسمان کو بھی چھوا ہے ؟؟،

، تو پھر آج میں تمہیں مارتا ہوں۔ بعد میں خود مر جاؤں گا؛

"سچا فرمایا جناب نے، لیکن یہ خادم اپنے آقا کو دنیا کی مصیبتیں برداشت کرنے کو کیسے چھوڑ جائے؟"

"کیوں نہ دونوں اکٹھے چلیں؟"

کلدانیوں نے اُر بھی بسایا تھا جو حضرت ابراہیمؑ کا گاؤں تھا اور جہاں انہیں خدا تعالیٰ کی موجودگی کا خیال آیا۔ اُرسے وہ اپنے طویل سفر پہ روانہ ہوئے تھے (مغربی مورخوں نے شام اور دیگر ملکوں کے سفر کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن عرب کے بارے میں جان بوجھ کر خاموش ہیں۔

اس مرتبہ جو حملہ آور آئے نہ اُنہیں کلدانیوں سے کوئی خاص دشمنی تھی۔ اور نہ نئے دارالحکومت کی تلاش۔ چنانچہ اخامینیس (جنہیں ہخامنشی بھی کہا جاتا تھا) بابل کے پندرہ بیس ہزار آدمی مار کر، دس بارہ مندر اور پانچ چھ محل وغیرہ تباہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ دراصل اخامینین لوگوں نے اپنی اصل قوت اور سارا جوش و خروش یونانیوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے (جس کا بدلہ بعد میں سکندر یونانی نے لیا)

ملک کی حالت بُری نہیں تھی، اصلاحات کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ مگر حملہ آور جو ایران کے علاقے سے آئے تھے اہل بابل کی بہتری و بہبودی کے خواہاں تھے (جیسا کہ سب حملہ آور کہا کرتے ہیں)

انہیں جب کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کو نہ ملی تو نا چار دنیا کی پہلی گھوڑا ایکسپرس شروع کی۔ جگہ جگہ گھوڑے بدلے جاتے، ایلچی ڈاک لے کر ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ایک ہفتے میں طے کرتے تھے (ایلچی بھی بدلے جاتے ہوں گے)

ساتھ ساتھ آداب محفل، تکلفات اور مسجع و مقفیٰ عبارت رائج ہوئی۔ بعد میں جب چنگیز نے ایک ایرانی کاتب سے کسی گورنر کے نام مختصر سا حکم نامہ لکھوایا تو کاتب فوراً دوسرے صفحے تک پہنچ گیا۔ چنگیز کو شبہ ہوا۔ بولا پڑھ کر سناؤ۔ کاتب نے بخدمت جناب عالی مآب بلند اقبال حضرت گورنر صاحب سے شروع کیا تھا۔ مزاج، موسم اور کنبے کا حال پوچھنے کے بعد درخواست کی تھی کہ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو حقیر چنگیز کی اس معمولی سی گزارش پر غور فرمایا جائے — چنگیز جو مختصر چنگیزی احکام کا عادی تھا آگ بگولا ہو گیا۔ کاتب کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ کہ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ چنگیز نے آداب والقاب فوراً بند کر دیئے جو اس کے جانے کے بعد فوراً واپس آ گئے۔ چنگیز نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ہر شام لوگ شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مہینے میں تین دفعہ سے زیادہ مدہوش ہونا جرم ہے جو اس کے جانے کے بعد یہ حکم بھی ختم ہو گیا۔

سکندرِ اعظم پہلی مرتبہ بابل آیا تو دارا کا تعاقب کر رہا تھا — یہ وہ دارا نہیں تھا جس کی فتوحات مشہور ہیں۔ "کس لئے دارا مارا" والا بادشاہ دارا سوم تھا جس کے دربار میں بے شمار خواجہ سرا تھے۔

سکندر جلدی میں تھا۔ اگرچہ پریڈ اور سفیروں سے ملاقات کے لئے اس نے وقت نکال لیا تھا۔ البتہ جب ہندوستان سے واپس آیا تو فرصت ہی فرصت تھی لیکن پہلے سے کافی بدل چکا تھا۔ ایرانی لباس پہنتا، بات بات پر بگڑ جاتا۔ وہمی ہو گیا تھا۔ جب اس کے استاد ارسطو کے پوتے کیلستھینز نے اسے سجدہ کرنے سے

انکار کیا تو اسے مروا دیا۔ اس سے پہلے اپنے جگری دوست اور محسن کلائی ٹس کو خود اپنے ہاتھوں قتل کر چکا تھا۔

دجلہ عبور کیا ہی تھا کہ بابل سے وفد آیا اور معروض ہوا کہ دیوتاؤں کا یہ ارشاد ہے کہ آپ مغرب کی جانب نہ آئیں۔ کبھی یونانیوں نے بھی پیشین گوئی کی کہ یہ سفر آخری سفر ہے۔ سکندر بابل پہنچا تو فصیل پر کوے لڑ رہے تھے۔ ایک کوا سکندر پر گر پڑا۔ لوگوں نے شور مچا دیا کہ برا شگون ہے اننا دا ویلا مچا کہ سکندر شہر میں داخل نہیں ہوا۔ کبھی دریا کے کنارے کیمپ لگاتا، کبھی کشتیوں میں اُدھر اُدھر پھرتا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا، ذرا ذرا سی بات منحوس بن جاتی، ہر واقعے میں بدشگونی اخذ کی جاتی۔ شروع شروع میں اس نے ایسے بدگویوں کو مار بھگایا بھی لیکن اس قماش کے لوگ کبھی باز نہیں آتے۔ ان سب نے مل کر سکندر کو یقین دلا دیا کہ آخری وقت قریب ہے۔ پھر جون ۳۲۳ ق م میں بخار چڑھا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ بخار چڑھ جاتا تھا لیکن تب اسے ایسی اوٹ پٹانگ پیشین گوئیوں پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا۔

نقاہت بڑھتی گئی۔ مرنے سے پہلے ساری فوج بسترِ مرگ کے قریب گزری۔ آنکھوں سے ہر سپاہی کے سلام کا جواب دیا پھر ویکاس نے مہر نکالی اور پوچھا۔

"شاہی مہر کسے دی جائے؟"

"جو سب سے دلیر اور قوی ہو۔۔۔اسے" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

مغرب کے وقت سکندر انتقال کر گیا۔ چند روز بابل والے سہمے سہمے رہے

کہ اب کوئی زبردست مصیبت نازل ہو گی لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس جواں مرگ فاتح کو بھول گئے جس نے اس زمانے کی دریافت شدہ ساری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ ان دنوں نہ اخبار تھے نہ ریڈیو پھر بھی سکندر کا نام ہر شہر، ہر قصبے میں بچے بچے کی زبان پر تھا جسے یاد کر کے جولیس سیزر اپنے گنجے سر پہ ہاتھ مار کر کہا کرتا ہے "میں تو کچھ بھی نہ کر سکا — اس عمر میں سکندر دنیا فتح کر چکا تھا"

سکندر کے جانشین سلیوکس نے سکندر کے آباد کیے ہوئے اٹھارہ اُنیس سکندریہ دیکھے تھے۔ وہ مدت سے منتظر تھا کہ کبھی اپنا پرائیویٹ شہر بھی آباد کرے اس نے بابل کو خیرباد کہا اور دجلے کے کنارے اپنا سلوکیا بسایا۔ یہ شہر زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ دراصل سکندر کی عظمت سے سلیوکس کا تحت الشعور بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ یونانیوں نے دجلہ عبور کیا تھا یہ نا ممکن تھا کہ رومن پیچھے رہ جاتے۔ ویسے بھی اپنی تہذیب و تمدن کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں پہ حملہ کرنا رومنوں کی پرانی عادت تھی — یہ ان کی انتہائی شرافت تھی ورنہ پسماندہ ملکوں کو کون پوچھتا ہے۔

لہٰذا مجبوراً انہیں دجلہ و فرات کی وادی میں آنا پڑا!

ییسے ان دنوں چین اور ہند سے دوآبے کے راستے گرم مسالے، ریشم اور خوشبوئیں روم بھیجی جاتی تھیں۔ پلائنی PLINY نے لکھا ہے — "آج کل روم میں لونگ، جائفل، دارچینی، کالی مرچوں کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ عورتیں ریشمی کپڑوں اور سامان آرائش کی منتظر رہتی ہیں۔" سلطنت روما کے اس رپورٹر نے اس رقم کا بھی ذکر کیا ہے جو رومن ان چیزوں کی خریداری پر

صرف کرتے تھے ___ تقریباً دس لاکھ پاؤنڈ جتنی رومن کرنسی سالانہ ___ (ان دنوں بھی اتنا ہی خرچ ہوتا ہے)

کہتے ہیں کہ رومن بادشاہ تراجن کو سکندرِ ثانی کہلانے کا بڑا شوق تھا۔ (یوسف ثانی بننے کی خواہش نے بھی بہتیروں کو خوار کیا ہے) تراجن اسی راستے سے آیا۔ جس سے سکندر آیا تھا۔ بالکل اسی سٹائل سے لڑتا ہوا وہ آیلے میں داخل ہوا۔ وہاں اسے یاد آیا کہ سکندرِ ثانی بننے کے لئے ہندوستان پر بھی حملہ کرنا ہوگا۔ بیماریوں اور گرمی سے فوج کی بری حالت تھی لیکن تراجن کے حکم پر چلنے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ آخر وہی تراجن جس نے ڈینیوب کے کنارے چٹانوں پر یہ الفاظ کھدوائے تھے " اس کٹھن علاقے کے سرکش اور جنگجو قبیلوں کو شہنشاہ تراجن نے اپنی تلوار سے زیر کیا ___ (یہ چٹانیں اور الفاظ اب تک موجود ہیں) ___ وہ تراجن خلیج فارس کے ساحل پر پھوٹ پھوٹ کر کے رو دیا۔ (بادشاہ کے رونے کا ذکر مورخین نے بڑی وضاحت سے کیا ہے) واپس جاتے وقت تراجن کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ پہلا رومن بادشاہ تھا جو اس علاقے میں تہذیب پھیلانے گیا تھا۔

ساسانی اپنے عروج کے لئے کافی عرصے سے منتظر بیٹھے تھے۔ دجلے کے کنارے خسرو اعظم اپنے محل طاق کسریٰ میں سارے غیر ملکی سفیروں کو اکٹھا کر کے اپنی موجودہ اور گذشتہ عظمت کے قصے سناتا۔ سفیروں نے یہ کہانیاں اتنی مرتبہ سنی تھیں کہ انہیں یقین سا ہو گیا تھا کہ سچی ہیں۔

طاقِ کسریٰ کی محراب اتنی اونچی تھی کہ آج تک اسے دنیا کی بلند ترین

محراب سمجھا جاتا ہے (نہ جانے طاقِ کسریٰ کی عظیم محراب میں ایسی کیا کشش تھی کہ ہر ایک کا ہی جی چاہتا تھا کہ اسے ڈھا کر برابر کر دے فتح کے بعد عربوں نے اسے مسمار کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن کسی نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ بعد میں جب منصور نے قریب ہی بغداد آباد کیا تو اینٹوں کے لئے محراب کو تڑوانا شروع کرا دیا۔ لیکن محکمہ مالیات نے بتایا کہ اس طرح توڑ پھوڑ کر یہاں سے اینٹیں منگانے کی بجائے بغداد میں اینٹیں بنانا سستا رہے گا۔ لہٰذا یہ محراب بچ گئی)

ساسانی بادشاہ سردیاں یہاں گزارتے اور گرمیاں ایران کے پہاڑوں میں۔ جب بادشاہ موسم کے الٹ پھیر میں دارالحکومت بدلنے لگیں تو ضرور کچھ ہو کے رہتا ہے ـــــ چنانچہ عرب آ گئے۔ خالد بن ولید نے تیرہ مہینوں میں پندرہ جنگیں لڑیں اور ہر مرتبہ فتح پائی۔ کچھ ساسانیوں کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور خوش فہمی انہیں لے ڈوبی۔ ہرمز خالدؓ سے لڑنے آیا تو بے شمار زنجیریں ساتھ لایا تاکہ عرب قیدیوں کو گرفتار کر کے لے جانے میں آسانی رہے۔ دجلے کے کنارے ابلہ کے مقام پر نہ صرف ہرمز کو شکست ہوئی بلکہ انہی زنجیروں سے ساسانی باندھے گئے (جنگ قادسیہ میں ساسانیوں کا کمانڈر مشہور پہلوان رستم تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اکھاڑے کی پہلوانی اور چیز ہے اور جنگ اور چیز)

دلیری اور شجاعت کا زمانہ تھا۔ اصلی جنگ سے پہلے "سنگلز" ہوا کرتے کوئی سورما نکل کر مخالف لشکر کو للکارتا ـــــ ہَل مِن مُبارِز مِنکُم! (کوئی ہے جو

سامنے آتے، پھر دونوں فوجوں کے سامنے مقابلے ہوتے۔

یورپ نے نقل شروع کی تو ڈوئل رائج ہوئی۔ لیکن بعد میں انہوں نے ڈوئل کا مذاق بنا لیا اور جرمنی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نکلنے لگے —— "بہادرو! چہرے پر ڈوئل کے نشان لگوانا چاہتے ہو تو فلاں جراح کی خدمات حاضر ہیں، جو آپ کے ماتھے یا رخسار پر تلوار کے زخم نہایت چابکدستی سے بنا دے گا۔"

اُس زمانے میں بادشاہ لڑتا تو اگلی صف میں ہوتا تا کہ سپاہیوں کے حوصلے بلند رہیں۔ بادشاہ کے زندہ رہنے یا مر جانے سے جنگ پر فیصلہ کن اثر پڑتا تھا لیکن بعد میں بادشاہ اس لئے پیچھے رہنے لگے کہ کہیں اُن کی موت پر لشکر بددل ہو کر بھاگ نہ نکلے۔

عرب فاتح جلدی میں تھے۔ دو آبے کو عراق عرب اور عراق عجم میں بانٹ کر، بصرے اور کوفے میں نئی چھاؤنیاں بنا کر شمال کی طرف تیزی سے نکل گئے۔ آرمینیا اور کاکیشیا میں سپاہیوں نے پہلی مرتبہ سنہرے اور سرخ بالوں والی لڑکیاں دیکھیں —— بعد میں کاکیشیا کے پہاڑ کوہِ قاف اور یہ لڑکیاں کوہ قاف کی پریاں مشہور ہوئیں۔

عربوں کی سلطنت پھیلتی گئی اور پرانی رومن سلطنت سے بڑھ گئی۔

عرب خانہ بدوش تھے۔ اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا خیمہ ان کے لئے بہترین عمارت تھی۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ اپنے خیموں کے لئے نفیس ترین عمارتوں کے شہتیر کھینچ لیا کرتے تھے۔ ابن خلدون نے بڑی مفید باتیں

لکھی ہیں — اس نے کہا ہے کہ آرٹ کبھی تخلیق نہیں ہوتا جب تک کہ آرٹسٹ نہ ہوں اور یہ کہ قوم بننے میں تین پشتوں کا عرصہ یعنی تقریباً اسی سو برس لگتے ہیں اور یہ کہ فقط جفاکش اور جنگجو قوم حکومت کر سکتی ہے۔ فتح کے بعد جب جاہ و حشمت اور مال و دولت اس قوم کو تن آسانی اور آداب و تکلفات کی طرف لے جاتے ہیں تو فوراً کوئی توانا اور جیالی قوم ان سے حکومت چھین لیتی ہے اور مفتوح قوم فاتحین کی ہر بات کی نقل کرتی ہے۔ ہارے ہوئے لوگ فاتحین کا لباس، ان کی غذا، رسمیں، آداب — ہر چیز غیر شعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں کہ شاید انہی کی بدولت فاتحین نے انہیں شکست دی تھی۔

فتوحات کھلی ہوا میں رہنے والے عربوں کو شہروں اور قصبوں میں لے آئیں تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ پریشانی بجا تھی کیونکہ آبادیوں میں کاشتکاری ہوتی تھی۔ پانی کی وجہ سے مچھر تھے جن سے بخار چڑھتا تھا اور شہروں میں طرح طرح کی بیماریاں تھیں۔

خلفائے بنی امیہ دمشق میں رہے لیکن صحرا اور نخلستانوں کی محبت دل سے نہ گئی۔ شکار یا دورے کے بہانے صحرا میں نکل جاتے۔ ان کے صحرائی محلوں کے کھنڈر اب تک موجود ہیں لیکن عباسیوں نے بغداد بسا کر شہری سکونت اختیار کی۔ آہستہ آہستہ بود و باش، طرزِ تعمیر، ہر چیز پر ساسانی رنگ آ گیا۔ دیوان عام کی جگہ دیوان خاص نے لے لی۔ افسروں سے ملنے سے پہلے درخواست دینی پڑتی تھی اور اُن کے سامنے درباری آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔

بغداد بین الاقوامی شہر بن گیا۔ ہارون الرشید نے شاہ لمین کو ایک کلاک

اور ہاتھی بھجوایا (مورخ کہتے ہیں کہ ہاتھی نے سن ۸۱۰ء میں جرمنی میں انتقال کیا ـــ شارلمین کا انتقال بعد میں ہوا)

نہر سویز کا خیال سب سے پہلے ہارون الرشید کو سوجھا تھا موجودہ نہر کی کھدائی سے ہزار سال پہلے اس نے متعلقہ علاقے کی پیمائش کرائی تھی۔ ویسے اُن دنوں بھی بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم چند نہروں کے ذریعہ آپس میں ملے ہوئے تھے

ہارون نے بازنطینیوں سے جنگیں لڑیں بازنطینی ہر بار صلح کر لیتے اور اور عرب فوج کے واپس بغداد پہنچنے سے پہلے صلح نامہ منسوخ کر کے پرانی حرکتوں پر اُتر آتے (شاید اس لئے کہ یہ فاصلہ کئی مہینوں میں طے ہوتا تھا) عرب پھر حملہ کرتے، ایک اور صلح نامہ ظہور میں آتا اور فوراً بازنطینی لڑکیوں کی شادیاں عربوں سے کی جاتیں (یہ موقع شناس لڑکیاں بڑے سلیقے سے سسرال والوں کو رواداری کی تلقین کرتیں) عربوں کی تاریخ پر مغربی بیویوں نے بھی اچھا خاصا اثر ڈالا ہے۔

ایرانی سول عہدوں پر تھے۔ عراقی یا تجار تھے۔ یا طالب علم اس لئے خلیفہ معتصم نے مجبوراً غیر ملکیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ اس نئی فوج کے لئے جو مملوکوں اور وسط ایشیا کے قبائلیوں پر مشتمل تھی، ساٹھ میل اوپر دجلے کے کنارے سامرہ آباد کیا گیا۔ جو دارالخلافہ بن گیا۔

ریت سے اٹا ہوا سامرہ ہوائی جہاز سے اب بھی ایک ماڈرن شہر دکھائی دیتا ہے ـــ اس میں RACECOURSE ہے شاپنگ سنٹر ہیں اور ماڈل ٹاؤن بھی ادھر مستطیل، اُدھر مربعہ، یہاں دائرہ، وہاں تکون ـــ ہر جگہ جیومیٹری کے خطوط

دکھائی دیتے ہیں۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ سامرہ کے بسنے کے ساتھ ہی خلافت کا زوال شروع ہو گیا ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن آج تک جتنی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں۔ دو تین سو برس سے زیادہ نہیں رہیں۔ شاید قدرت نے یہی عمر مقرر کر رکھی ہے اس کے بعد اقتدار کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہانے سینکڑوں بن جاتے ہیں — باہمی خانہ جنگی، کسی نئی قوم یا فرقے کا عروج، بعض اوقات کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی سلطنت روما کے زوال پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل ہوا کیا تھا۔ کئی سلطنتیں تو بڑی بڑی جنگیں جیتتے جیتتے ختم ہو جاتی ہیں۔

تیرھویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے سولہ لاکھ کو قتل کیا۔ دریا رواں رہے۔ نہریں بہتی رہیں لیکن ہل چلانے والا کوئی نہ رہا۔ زرخیز زمین دوبارہ بنجر ہو گئی (بیسویں صدی کے شروع میں سر ولیم ولکاکس نے حکومت ترکیہ کو رپورٹ بھیجی کہ عراق میں نئی نہریں کھودنے کی بجائے اٹی ہوئی قدیم نہروں کو ٹھیک کر لیا جائے)

تین سال تک کوئی خلیفہ نہ تھا۔ آخر خلافت بغداد سے قاہرہ منتقل کی گئی۔ اور وہاں سے قسطنطنیہ، اور پھر خلافت بالکل ختم ہو گئی۔

خلافت بغداد کو تباہ کرنے ہلاکو کی اولاد نے پچاس سال کے اندر اندر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی آ گئے۔ پھر ترک آئے جو کئی سو برس رہے پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بصرے میں دفتر کھول لیا۔ ایک جہاز SEAHORSE بصرے میں آیا۔ اس کا ایک جہازراں گرمی کی شدت سے اس قدر نڈھال رہنے لگا کہ ڈاکٹروں کو مجبوراً اسے انگلستان واپس بھجوانا پڑا — یہ نیلسن NELSON تھا۔

پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو لڑے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ ترکوں کے خلاف لڑے جب جنرل ایلنبی ALLENBY دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو خوش فہم باشندوں نے "آل نبی!!" کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں برطانوی ایجنٹ GERTRUDE BELL نے بغداد سے اپنے رشتہ داروں کو خط لکھا کہ "آپ حیران ہوں گے کہ بغداد میں میں اتنی مقبول ہوں کہ سب مجھے اُم المومنین کہتے ہیں۔ لہٰذا میرا یہاں قیام بے حد ضروری ہے، میں انگلینڈ نہیں آسکتی۔"

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی وقفے کے حالات ذرا پیچیدہ ہیں اور انہیں فقط سیاست دان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بغداد کا شہر دجلے کے ساتھ ساتھ یوں چلا گیا ہے کہ عرض و طول میں ایک اور تیرہ کی نسبت ہے۔ فقط شمالی حصے (کاظمین شریف) میں قدیم بغداد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ورنہ بالکل بغداد الجدید بن چکا ہے۔ پرانی عظمت کی نشانیاں گنی گنائی رہ گئی ہیں منہدم محل، چند مینارے یا وہ زمین دوز لائبریری جس میں ہلاکو نے دریا کا پانی چھوڑ دیا تھا۔

مشہور جغرافیہ داں یعقوبی نے لکھا ہے۔ خلیفہ منصور دورے پر تھا کہ ایک گاؤں کے پاس رکا اور اپنے ہمراہیوں سے گویا ہوا۔ "یہ گاؤں بہت بڑی تجارتی منڈی بن سکتا ہے۔ دجلے کے ذریعے آرمینیا اور آذربائیجان سے سامان آئے گا اور فرات کے ذریعے شام، مصر اور شمالی افریقہ سے ہند اور چین کے

جہاز یہاں لنگر انداز ہوں گے۔ اصفہانی اور خراسانی تجار سڑکوں سے پہنچیں گے خدا کا شکر ہے کہ ایسے شہر کا بسانا میرے سپرد ہوا ہے ورنہ مجھ سے پہلے کتنے یہاں سے گزرے اور کسی کو خیال تک نہ ہوا۔"

منصور نے دجلے کے مغربی کنارے پر مدینۃ السلام کی بنیاد رکھی۔ شہر آباد ہوا تو لوگ اسے منصوریہ کہنے لگے (منصور کا شہر تھا۔ تو دجلے پر لیکن پانی فرات سے آتا تھا) پبلک نے فوراً اسٹلائٹ ٹاؤن بنائے مشرقی کنارے پر مہدیہ آباد ہوا پھر رصافہ۔۔۔ دیکھتے دیکھتے منصور کا اصلی شہر بالکل گم ہو گیا۔

لفظ بغداد کو کچھ لوگ نوشیرواں کے پرانے شہر باغ داد سے ملاتے ہیں۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ بابل کے وقتوں میں یہاں ایک گاؤں بغداؤ و آباد تھا۔

جب معتصم نے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے لیے (جن میں بیشتر غیر ملکی تھے) سامرہ آباد کیا تو بغداد کی اہمیت کم ہو گئی (معتصم کے زمانے میں ہندوستان سے ستره ہزار جاٹ بغیر بلائے یا اطلاع دیئے آ گئے تھے۔ عربوں نے انہیں الزّط کہا اور ان کی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے تنگ آ کر انہیں سلیشیا کی سرحد پر بھیج دیا۔ جہاں وہ خانہ بدوشوں میں خلط ملط ہو گئے۔۔۔ یا خانہ بدوش اُن میں خلط ملط ہو گئے ہوں گے۔

المتوکل نے سامرہ میں پونے تین سو گز لمبی پونے دو سو گز چوڑی مسجد تعمیر کی جسے دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہا جاتا ہے۔ مسجد سے کہیں خوشنما اس کا مینار تھا جو بابل کے مینار کی نقل تھی۔ دو سو فٹ اونچے مینار کی چوٹی پر پہنچنے

کے لئے سیڑھیوں کی جگہ ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تھی اور سوار گھوڑے سمیت مینار پر چڑھ سکتا تھا۔ یہ مینار اب بھی ہے لیکن کٹہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر چڑھتے وقت چکر آتے ہیں۔

لیکن پھر متوکل نے شمالی سمت میں ایک نیا دارالخلافہ الجعفریہ تعمیر کر لیا تو سامرہ یکایک سنسان ہو گیا نئی جگہ دنگے فساد رہتے تھے۔ سال بھی نہ گزرا تھا کہ متوکل کو پھر سامرہ آنا پڑا۔ وہاں سے پچاس سال اور آٹھ حکمرانوں کے بعد سب واپس بغداد آ گئے۔

بغداد نے بڑی ترقی کی۔ عرب ملاح دور تک نکل گئے (چند سال ہوئے روس، سویڈن اور جرمنی میں قدیم عربی سکے ملے)

یونیورسٹیاں اور دارالحکماء قائم ہوئے۔ یونانی علماء کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ بغداد علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ اس عہدِ زریں کے علماء اور ماہرین کے نام تاریخ کی دھند میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں! بیسویں صدی میں سارٹن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ سائنس" میں الفارابی کو دنیا کا سب سے بڑا فلسفی، ابو کامل (جنہوں نے الخوارزمی کے الجبرے کی تکمیل کی)، اور ابراہیم بن سنان کو سب سے بڑے ریاضی داں، المسعودی کو عظیم ترین جغرافیہ داں اور طبری کو سب سے ممتاز مورخ قرار دیا ہے۔ عربوں کا ایجاد کردہ موتیے کا آپریشن اٹھارویں صدی تک جرمنی اور انگلستان میں رائج رہا۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترھویں صدی تک بو علی سینا اور رازی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ بو علی سینا کی معرکتہ الآرا کتاب "القانون فی الطب"، کو ڈاکٹر اوسلر

نے طبی انجیل کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کسی اور طبی کتاب نے دنیا پر اس قدر اثر نہیں ڈالا جتنا کہ اس نے۔

اس زمانے کے جینیئس بڑے عظیم انسان ہوتے تھے بیک وقت سائنسداں مہندس، فلسفی بھی ہوتے تھے۔ شاعری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ پر بھی عبور ہوتا تھا (آج کل کے انٹلکچوئل حضرات کی طرح نہیں کہ پندرہ بیس بیسر کتابیں پڑھ کر عینک لگائی، بال بڑھائے اور چڑچڑے بن کر ہر چیز کی مخالفت شروع کر دی)

بغداد کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی۔ یہاں سے حکم نامے جاری ہوتے تھے، خطابات عطا ہوتے تھے۔ شمس الدین التتمش نے ہندوستان سے اپنا نمائندہ بغداد بھیجا اور حکومت کرنے کی اجازت مانگی، جب خلیفے نے سیاہ عبا، انگوٹھی اور عصا بھیجے تب التتمش نے اپنے نام کے ساتھ سلطان لگایا، محمود نے خراسان فتح کیا تو خلیفے نے مبارک باد بھیجی اور یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابات عطا فرمائے بعد میں۔ طغرل بیگ کو ملک المشرق والمغرب، کا اعزاز دیا (کبھی پتہ نہیں پبلک کو کیوں شبہ ہے کہ اعزازات و خطابات محض انگریزوں نے شروع کئے تھے۔ مسلمانوں نے بھی تاج پہنے لیکن لوگ CROWN سے اب تک خفا ہیں) کئی سیاح بغداد سے گزرے۔ بارہویں صدی میں ابن جبیر آیا تو اسے گرد و نواح میں جگہ جگہ نہریں اور پل ملے لیکن بغداد میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ باشندے بھی خشک لگے لیکن وہ بغداد کے حسن سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے ”بغداد میں

حسن کی وہ فراوانی ہے کہ خوفِ خدا نہ ہو تو انسان فوراً غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔"

مارکوپولو نے موصل کے تاجروں کو موسیلینی لکھا ہے (جو مسولینی سے کافی ملتا ہے) اور بغداد کو بوداتہ، بصرے کو بصرہ اور بلا کو کو الاؤ۔

افواہ ہے کہ مارکوپولو نے اس علاقے کے بارے میں محض سنی سنائی باتیں لکھی تھیں۔ مثلاً اس نے بغداد کے بالکل سامنے ایک بڑے پہاڑ کا ذکر کیا ہے حالانکہ وہاں اتنی سی پہاڑی بھی نہیں ہے اور جو الاؤ کے حملے اور بوداتہ کی تباہی کی داستان لکھی ہے وہ سنسنی خیز جاسوسی ناولوں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ مارکوپولو نے یہ وقائع نویسی تیرہویں صدی میں کی تھی لیکن اس کے باوجود مغرب میں ابنِ بطوطہ کے سفر نامے کو شک و شبہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ابنِ بطوطہ چودہویں صدی کے شروع میں آیا۔ پہلے بصرہ پہنچا، پھر خلیج فارس کے ساحل پر۔ وہاں سے بغداد کا پروگرام بنا تو معلوم ہوا کہ اسی بصرے والے راستے سے دوبارہ گزرنا ہوگا۔ لہٰذا مجبوراً ایران کی طرف سے سینکڑوں میل کا فالتو چکر لگا کر بغداد پہنچا۔

"جس راستے سے ایک دفعہ گزر جاؤں اُس پر دوبارہ قدم نہیں رکھتا"

اس نے سفر نامے میں لکھا ہے۔ بغداد پہنچ کر دیکھا کہ قدیم عمارات منہدم ہو چکی ہیں اور لوگوں نے غلط عربی بولنی شروع کر دی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا کہ تاتاری اور حکمران فرمان جاری کرتے ہیں تو اس طرح شروع کرتے ہیں "سلطان فلاں اور خاتونوں (بیویوں) کے حکم سے جاری ہوا ہے۔" (جیسا کہ دورِ جدید میں ہوتا ہے) ابنِ بطوطہ جیسا سیاح آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس نے

جو سیاحت چودھویں صدی میں کی تھی اس پہ بیسویں صدی میں بھی رشک آتا ہے ایک دن گھر سے نکلا تو لگاتار بیس سال سیر کرتا رہا۔ مشرق وسطیٰ ہندوستان لنکا، چین، وسط ایشیا اور قسطنطنیہ دیکھ کر واپس گھر پہنچا تو یاد آیا کہ اسپین اور افریقہ کے اندرونی علاقے رہ گئے ہیں چھ برس کے لئے پھر نکل گیا۔

بغداد میں ان دنوں دو سلطان دورے پر آئے ہوئے تھے ابن بطوطہ نے بغداد کے قیام کا اتنا ذکر نہیں کیا جتنا کہ ان سلطانوں اور ان کی چپقلش کا

آخر ایک دن وہ سلطان ابو سعید (جس کی بیوی کا نام بغداد خاتون تھا) کے محلے کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ محلہ ان دنوں چلتے پھرتے کیمپ کو کہا جاتا تھا

سیاحت کے دوران میں اس نے لیکچر دیئے، ملازمتیں کیں، بادشاہوں کا سفیر بنا جگہ جگہ شادیاں کیں لیکن جہاں کوئی باہر جانے والا جہاز یا قافلہ نظر آ جاتا۔ رتبہ دولت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ساتھ ہو لیتا۔ سیاحت اسے سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھی۔

بصرے سے سندباد نکلتا اور خلیج فارس کا رخ کرتا۔ ان دنوں سندھ آشنا تھا، ہندالہند اور قلات، کیکان یہاں تک کہ دریائے اٹک نہر مہران تھا مگر زرمبادلہ کی بندشیں تھیں اور غالباً CUSTOMS والے بھی اچھی طرح پیش آتے ہوں گے تب ہی سندباد اتنی مرتبہ سفر کر سکا ہو گا۔

منصور ایک مصنف جعفر کی کتاب لایا جو الف لیلہ کی پیروڈی تھی بعد میں پتہ چلا کہ یہ وہی جعفر ہے جو ہمارے ہاں جعفر زٹلی کے نام سے مشہور ہے ہمیں علم نہ تھا کہ الف لیلہ کی بھی پیروڈی ہوئی ہے لیکن جعفر زٹلی

کی تحریروں میں وہی جانے پہچانے الف لیلوی واقعات اور کردار ملے۔ مثلاً ایک باغ میں کچھ لوگ پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ دفعتہً ایک بیل بھاگا بھاگا آتا ہے جس کے تعاقب میں ایک بوڑھا لگا ہوا ہے۔ باغیچے کو دیکھ کر تھکا ہارا بوڑھا ایک طرف بیٹھ کر پسینا پونچھنے لگتا ہے اور بیل اگلے قطعے میں گھاس چرنا شروع کر دیتا ہے۔

لوگوں نے بوڑھے سے علیک سلیک کی کوشش کی اس نے منہ پھیر لیا۔ پھر کھانے کی دعوت دی اس پر بھی خاموش رہا۔ آخر انہوں نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ بوڑھے نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ اس کی کہانی اس قدر غمناک ہے کہ خاموش رہنا بہتر ہو گا۔

سب نے اصرار کیا تو بوڑھے نے بتایا کہ ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ تینوں وزیر کی حسین و جمیل لڑکی پر عاشق تھے لیکن لڑکی اتنی رحمدل تھی کہ کسی ایک سے شادی کر کے بقیہ دو شہزادوں کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی چنانچہ وہ تینوں لگاتار شادی کے طلب گار رہے اور لڑکی خاموش رہی۔ اتفاق سے تینوں شہزادے حسن و جمال، تعلیم شہسواری، تیر اندازی اور دیگر فنون سپہ گری میں ایک دوسرے کے ہمسر تھے۔ جب شہزادوں نے کام کاج چھوڑ کر آہ و بکا میں وقت صرف کرنا شروع کر دیا تو بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اب شادی کا فیصلہ فوراً ہو جانا چاہیے۔ لیکن لڑکی بدستور خاموش رہی۔ ادھر شہزادوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی گئی۔ آخر بادشاہ کو طیش آیا۔ اور اس نے وزیر کو خبردار کیا کہ اگر کل شام تک فیصلہ نہیں ہوا تو ایک نیا وزیر

اس سے چارج لے لے گا۔ وزیر شہزادوں کو باہر لے گیا ان کا تحریری اور زبانی امتحان لیا۔ تینوں برابر نکلے۔ پھر نیزہ بازی کرائی۔ چھلانگیں لگوائیں، دریا میں تیرایا، سارے جتن کئے لیکن اگلے سہ پہر تک تینوں کے نمبر یکساں تھے۔ ڈوبتے سورج کو دیکھ کر وزیر بہت گھبرایا، پریشانی میں ادھر ادھر دیکھا تو ایک بچھڑا نظر آیا۔

وزیر نے فوراً نعرہ لگایا — "جو اس بچھڑے کو پکڑلے وہ جیت گیا۔"

تینوں شہزادے سرپٹ بھاگے۔ ادھر بچھڑے نے زقند بھری اور تعاقب شروع ہوگیا۔ آگے گیلا کھیت تھا جس میں ایک کا پاؤں پھسلا اور وہ پیچھے رہ گیا، پھر جنگل آیا جس میں بچھڑے نے دونوں شہزادوں کو خوب چکر دیئے۔ اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک شہزادہ کسی اور رخ میں نکل لیا۔ اب ایک شہزادہ رہ گیا جو پوری مستعدی سے تعاقب کر رہا تھا، ادھر بچھڑا تھا کہ قریب نہ آنے دیتا تھا — وہ دن اور آج کا دن — مدتیں گزر چکی ہیں — وہ بچھڑا پورا بیل بن چکا ہے اور آپ کے سامنے گھاس چر رہا ہے — میں بھی بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں لیکن تعاقب جاری ہے

سب نے دیکھا کہ بیل گھاس چر کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"اچھا تو حضرات خدا حافظ" کہہ کر بوڑھا بیل کے پیچھے ہولیا۔

یہ اور ایسی کئی اور کہانیاں ہم نے پڑھیں۔ اگلے روز میں اور دو مقامی حضرات باہر سے واپس کیمپ آ رہے تھے۔ یکایک انہوں نے گھبرا کر بتایا کہ ہم سب خطرے میں ہیں، بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ میں نے لاری کی رفتار تیز کرنی چاہی تو انہوں نے چلتی لاری سے کودنے کی دھمکی دی۔ آخر رکنا پڑا۔ چاروں طرف دیکھا

کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپ چکے تھے۔ میں نے ایک ٹیلے کے اوپر لاری چڑھانی چاہی تاکہ اونچی جگہ سے دیکھ سکیں۔

"مت جاؤ۔ خطرہ ہے!" وہ دونوں چلائے۔

ٹیلے کے اوپر سے ایک طرف وادی سی دکھائی دی جہاں کچھ درخت اور خیمے تھے۔ ایک طرف سے غبار اُٹھا۔ نعروں کی آوازیں آئیں اور گولیاں چلنے لگیں۔ پھر ریت کے بادلوں میں سب کچھ چھپ گیا۔ چند سوار بندوقیں لئے تیزی سے ایک طرف نکل گئے اور غدر سا مچ گیا۔ پھر اونٹ اور سوار دوسری طرف جاتے دکھائی دیتے۔ چند گولیاں چلیں اور سوار اور بھیڑیں دکھائی دیں۔ کبھی اونٹ اور آدمی سامنے آجاتے، کبھی بھیڑیں اور آدمی تو کبھی اونٹ اور بھیڑیں ـــــ ساتھ ساتھ نعرے اور گولیوں کی آواز ـــــ پھر یہ سب آپس میں خلط ملط ہو گئے۔

جب گرد صاف ہوئی تو ایک طرف اونٹ کھڑے تھے، دوسری طرف بھیڑیں اور آدمی گھوڑوں کو تھپتھپا رہے تھے نہ کوئی زخمی نظر آیا، نہ کسی کا انتقال ہوا تھا۔

اپنے دونوں ساتھیوں کو سنبھالا جو ابھی تک تھر تھر کانپ رہے تھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جان بچ گئی ـــــ ابھی دو فریقوں میں خونریز لڑائی ہوئی تھی۔

کیمپ پہنچ کر یہ واقعہ منصور کو سنایا، وہ حقارت سے بولا ـــــ "شہری بودے ہو گئے۔ یہ لوگ ڈینگیں مارنے کی غرض سے بوگس لڑائیاں سیج کرتے ہیں

جو درحقیقت لڑائی کی پیروڈی ہوتی ہے۔ کبھی تمہیں پہاڑ والوں کی اصلی لڑائی دکھائیں گے، تم یقیناً خوش ہو گے۔

روز بولا ــــ "عجیب اتفاق ہے ــــ کل ہم نے ایک پیروڈی پڑھی تھی اور آج تم نے ایک اور پیروڈی کا نظارہ کیا ــــ"

"یہ فقط بغداد کے گرد و نواح ہی میں ہو سکتا ہے ــــ" منصور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

سینیچر کی شام کو منصور بھی ہمارے ساتھ بغداد گیا۔ آج خاص پروگرام تھا۔ پبلک کے پُرزور اصرار پر مغنیہ مجیدہ اپنے مقبول اور ہر دلعزیز نغمے سنانے والی تھی۔

وہ مائکروفون کے سامنے آئی تو خوب تالیاں بجیں لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس میں گانا کم تھا اور مٹکنا تھرکنا زیادہ۔ مجیدہ کی صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی اور لباس ضرورت سے زیادہ چست۔ بازو تھرکتے، گردن ہلتی، کمر لچکتی۔ سارا جسم بل کھاتا ــــ کبھی کبھی چھوٹا سا مصرع زبان پر آجاتا ــــ

"کیا جذبات ہیں! ــــ کیا اظہار ہے ــــ!! ــــ واللہ ــــ" جبیں جھوم جھوم جاتا۔

"کون سے جذبات؟ اور کون سا اظہار؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دجلے کا رقص ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہو رہا ہے ــــ واللہ!" جوجبیں نے جواب دیا۔

گانا ختم ہوا تو خاموشی طاری ہو گئی۔ مجیدہ ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاباش ملے گی لیکن ہجوم ایک اور فربہ و توانا خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا

جس نے پہنا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور جو کسی موزوں جگہ کی تلاش کے بہانے ادھر سے ادھر جا رہی تھی اور ادھر سے ادھر۔

جب خاتون بیٹھ گئی تو ہجوم مجیدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ یکایک مجیدہ کی سامنے والی میز سے ایک نہایت شگفتہ ڈکار بلند ہوئی جو اس امر کا زندہ ثبوت تھی کہ کوئی صاحب دل آرٹ کو خراج تحسین پیش کرنے میں پیچھے نہیں رہ سکتا

مجیدہ نے ایک اور لَے چھیڑی۔ ہم نے دیکھا کہ باہر دو شیخ اونٹوں سے اترے۔ اندر آکر گانے والی کو کچھ دیر بغور دیکھا۔ ہاتھ ہلا کر عربی میں نعرہ لگایا اور واپس چلے گئے۔

"انھوں نے آپس میں کیا کہا تھا؟" رضا نے پوچھا۔

"انھوں نے اطمنان کا اظہار کیا تھا کہ الحمدللہ عفیفہ مجیدہ ابھی تک فربہ ہے" منصور نے بتایا۔

"ضرور دیہاتی ہوں گے ——— " ایک طرف سے آواز آئی۔

پیچھے مڑ کر دیکھا، سلیم چند چکنے چپڑے نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا ۔ علیک سلیک کے بعد وہ ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے

سلیم کہنے لگا — "اس پہاڑی کا قصہ تو سنا ہو گا جس کو عبادت کرتے کرتے اچانک کوئی مسافر نظر آگیا۔ فوراً عبادت ملتوی کی، بندوق سنبھالی اور مسافر کو لوٹ کر پھر عبادت شروع کر دی۔ کوئی مہذب شخص دیکھ رہا تھا، اس نے بُرا بھلا کہا تو پہاڑی خفا ہو کر بولا ——— "یہ دین کا کام ہے وہ دنیا کا ——— دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

سلیم کے دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

منصور نے جواب دیا —— "جی ہاں یہ قصہ میں نے سنا ہے۔ ادیشہروں میں یہ قتل، تاتلون، مقتول والی گردان بھی رہتی ہے۔ ایک سچا واقعہ آپ بھی سن لیجئے۔ ایک شہری اور دیہاتی چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ دفعتاً شہری کچھ دیکھ کر چونکا اور دیہاتی کو بتایا کہ دوسرے کونے میں اس کا جانی دشمن چار آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ دیہاتی کے تجسس پر اس نے اشارے سے بتایا کہ میرا دشمن وہ ہے جس کی مونچھیں سیاہ ہیں۔ اتفاق سے ان پانچوں کی مونچھیں سیاہ تھیں۔ وہ جو موٹا اور گنجا ہے —— لیکن وہ پانچوں موٹے اور گنجے تھے۔ وہ جس کی توند نکلی ہوئی ہے —— اتفاق سے پانچوں کی توندیں نکلی ہوئی تھیں آخر دیہاتی کو دشمن دکھانے کے لیے شہری نے پستول نکالا —— ٹھنڈ ٹھنڈ کی چار آوازیں آئیں چشم زدن میں چار آدمی مرے پڑے تھے —— وہ جو رہ گیا ہے وہ میرا دشمن ہے —— اب سمجھے! —— امید ہے کہ یہ قصہ آپ پہلے سن چکے ہوں گے۔"

اب قہقہہ لگانے کی ہماری باری تھی لیکن کچھ بدمزگی سی ہو گئی۔

مجیدہ کا گانا ختم ہو چکا تھا۔ اندر ہال میں آرکسٹرا بج رہا تھا اور لوگ رقص کے لیے جا رہے تھے۔ منصور اور سعدہ کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر چلے گئے۔

جرجلیس تین معمر بنی ٹھنی خواتین کو لیے آ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکی تھی یہ جرجلیس کی نئی مجبوبہ تھی جو تین مہینے کی پریم بلیٹن پر تھی۔

روزنر نے فوراً حساب لگا کر جرجلیس کا کندھا ہلایا —— "جانتے ہو کہ ان تینوں کی مجموعی عمر تقریباً سوا سو برس ہو گی۔ اور تم صرف پچیس سال کے ہو ——"

"میں ان چاروں میں سے تین سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔"
روزینہ نے جلدی سے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور رقص کرنے چلا گیا۔
"جس لڑکی کو دیکھو کسی یورپین پر فریفتہ ہے ـــــ" جرجیس نے جھلا کر کہا
"اتنی دیر کسی اور کے ساتھ ناچ لو" میں نے مشورہ دیا لیکن وہ بار کی طرف چلا گیا۔ غم غلط کر کے واپس آیا تو لڑکی برس پڑی ـــــ " یہ کیا حرکت تھی؟"
"حرکت ورکت کچھ نہیں تھی ـــــ ناچنا ہے تو چلو ناچنے ہیں، ورنہ اپنا راستہ لو ـــــ" وہ بولی۔
وہ پچھلی شام کو اُسے چند قیمتی تحفے دے چکا تھا۔ اس لئے اپنا لہجہ بدلنا پڑا اور خوشامد شروع کر دی ـــــ "کاش تمہیں علم ہوتا کہ میں ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔"
"قاسم بھی یہی کہتا ہے ـــــ" وہ بولی
لیکن میں قاسم سے کہیں پہلے اٹھتا ہوں اور آدھی رات تک جاگتا رہتا ہوں۔ تمہیں یاد کرنے کے گھنٹوں کا میزان کیا جائے تو میرے زیادہ نہیں گے۔
اور یہ قاسم کون ہے ـــــ؟"
"یہ دیکھو ـــــ یہ آج ہی ملی ہے ـــــ" اس نے ہاتھ سامنے کر دیا
ایک انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔
"درمیانی انگلی میں انگوٹھی؟" روزینہ حیران رہ گیا "یہ انگوٹھی تو غلط انگلی میں ہے۔"

"منگنی بھی تو غلط آدمی سے ہوئی ہے ـــــ لیکن اگر یہی بات تھی تو تم نے مجھے غلط امیدیں کیوں دلائیں؟ اور دو ہفتے اور تین دن سے میرے ساتھ کیوں پھرتی رہی ہو؟"

"میں قاسم کی محبت آزما رہی تھی ـــــ"

"اس وقت تم دو انسانوں کو بے وقوف بنا رہی ہو اور ان میں سے ایک نام خود ہو ـــــ"

"بجر جیتس تمہیں کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا ـــــ"

وہ اسے تعریف سمجھ کر مسکرانے لگا۔ لیکن لڑکی نے بات جاری رکھی ـــــ"کیونکہ تم پہلے ہی سے بے وقوف ہو۔"

ان کی تو تو، میں میں شروع ہو گئی اور ہم باہر نکل آئے۔

منصور ابھی تک بحث میں مشغول تھا۔ سعدہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔

منصور ایک واقعہ سنا رہا تھا ـــــ "شام کو شہر میں انقلاب آیا اور کافی غدر مچا۔ اسی افراتفری میں آدھی رات کے بعد تین آدمی جیل کی کوٹھڑی میں بند کر دیئے گئے۔ رات گزری تو صبح کے اجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور گرفتاری کی وجہ دریافت کی ـــــ ایک نے بتایا کہ مجھے اس لئے پکڑا گیا ہے کہ میں عطار بن جبّار کا سب سے بڑا دشمن ہوں ـــــ دوسرے نے کہا کہ مجھے اس لئے قید کیا گیا ہے کہ میں عطار بن جبّار کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ اب دونوں نے تیسرے سے پوچھا کہ آپ کی تعریف ـــــ "میں عطار بن جبّار ہوں" تیسرا آہستہ سے بولا۔ سو حضرات

یہ ہے شہریوں کی سیاست ـــــ اگر اسے سیاست کہا جاتا ہے۔"

"لیکن دیہاتی ان پڑھ ہیں ـــــ" سلیم بھنا اٹھا "ان پڑھوں کو نہ اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے نہ سچ جھوٹ کی ـــــ"

"نہ ہمارے ہاں پولیس ہے نہ انواع و اقسام کے محکمے، پھر بھی انصاف ہے اور ایمان داری ہے۔ شہری عدالت میں کوئی قسم کھا کر صریحاً جھوٹ بول سکتا ہے لیکن اپنے گاؤں میں عزیزوں دوستوں کے سامنے کسی کی کیا مجال جو غلط بیانی کر جائے ـــــ تبھی ہمارے ہاں پنچایت منٹوں میں صحیح فیصلہ کر دیتی ہے۔ تمہاری خفیہ پولیس کی طرح نہیں کہ دو تین سال تفتیش ہوتی رہی، کیس ایک محکمے سے دوسرے اور تیسرے کے پاس جاتا رہا آخر میں فائل میں لکھ دیا کہ پوری تحقیقات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے ـــــ"

"تمہارے امن و انصاف کے کیا کہنے؟ کسی پہاڑی نے اپنے ہمسایوں کی رحم دلی اور ایمان داری کی تعریفیں کیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ہر وقت بندوق کیوں لئے پھرتے ہو ـــــ تو بولا کہ اپنے ہمسایوں کو رحم دل اور ایمان دار رکھنے کے لئے ـــــ یہ بتاؤ کہ پہاڑی ہر وقت بندوق کیوں لٹکائے پھرتے ہیں؟"

"اور شہری ہر وقت پستول کیوں چھپائے پھرتے ہیں ـــــ؟"

اتنے میں لوئی زا آگئی۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جرجیس اسے دیکھ کر بھاگا بھاگا آیا لیکن تب تک تروزا اسے رقص کے لئے لے جا چکا تھا۔

جرجیس کو اور کوئی نہ ملا تو مجھ پر خفا ہونے لگا ـــــ "دیکھا تم نے؟ یہ

انگریز ہر موقع پر من مانی کرتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ رہ گئے تم تو تم میں مشرقیت نام تک کو نہیں —"

"کیا ہوا —؟"

"انگلش منہ مروڑ کر انگریزوں کی طرح بولتے ہو۔ ایک لفظ پلے نہیں پڑتا۔ چا انگریزوں کی طرح پیتے ہو۔ چھوٹی سی پیالی سے آدھ گھنٹے تک کھیلتے رہتے ہو۔ ناچتے بھی ان ہی کی طرح ہو رقص نہیں پریڈ کرتے ہو اور اپنے مشرقی بھائیوں کا کوئی لحاظ نہیں —— اس لئے کہ تمہارا نظریۂ حیات بھی ان ہی سے ملتا جلتا ہے —"

"یعنی ——؟"

"یعنی یہ کہ میں خوبصورت، بد شکل، نوعمر، بوڑھی یہاں تک کہ کالے چور کو بھی لا کر، روز اسے چھین کر لے جاتا ہے اور تم کچھ نہیں کہتے ——"

"جرجیس تمہارے نام سے نسوانیت ٹپکتی ہے اور ویسے بھی تم میں مردوں والی کوئی خاص بات نہیں ہے ہمارے یہاں برجیس جرجیس جیسے نام لڑکیوں کے ہوتے ہیں —"

اوتی لا پاؤڈر روم کی طرف جا رہی تھی جرجیس سرپٹ بھاگا۔

ادھر منصور اور سلیم اینڈ کمپنی کی بحث جاری تھی۔

منصور کہہ رہا تھا —" ہر ملک میں دو قسم کے باشندے ہوتے ہیں۔ شہری اور دیہاتی۔ کسی بھی ملک میں ایک قوم نہیں در اصل دو قوم میں رہتی ہیں ——" مجھے دیکھ کر سلیم بولا —" آپ بھی تو کچھ کہئے —" ہندکا

کیا حال ہے ؟"

ہند میں کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے میں کم ازکم چار پانچ دریا ہیں، جو آپ کے دونوں دریاؤں سے کہیں چوڑے اور تیز رو ہیں ـــــ" میں نے بتایا

"لیکن آپ کے یہاں نہ دجلہ ہے نہ فرات۔"

"انہیں یہ بھی بتاؤ۔" منصور نے لقمہ دیا ـــــ "کہ ہند میں جب لوگوں کو جوش آتا ہے تو جلوس نکالتے ہیں۔ کھلے میدان میں تقریریں ہوتی ہیں۔ نعرے لگا کر اور پیدل چل کر لوگ اتنے تھک جاتے ہیں کہ گھروں میں جا کر سو رہتے ہیں یہاں کے شہروں کی طرح نہیں کہ جب کچھ ہونا ہو تو پہلے سناٹا چھا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں پھر مکمل خاموشی میں دفعتہً ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ مدتوں پچھتاتے ہیں ـــــ صدیوں سے یہاں یہی ہوتا رہتا ہے ـــــ"

اچانک سب کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ جرجیس کو چڑھ رہی تھی۔ وہ سلیم سے دو تین مرتبہ اس طرح مل چکا تھا جیسے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو اب وہ سلیم سے چوتھی دفعہ بڑے تپاک سے مل رہا تھا ـــــ "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ میرا نام جرجیس ہے۔ آپ کی تعریف ؟"

پھر جرجیس نے ہم سب سے پہلی مرتبہ ملنا شروع کیا اور اپنا تعارف کرا کے رسمی گفتگو شروع کر دی۔ جرجیس آؤٹ ہو چکا تھا۔ محفل برخاست ہوئی اور لاری تیزی سے کیمپ کی طرف جا رہی تھی۔

موہن اور میں باتیں کر رہے تھے ـــــ "خاں صاحب ایک مشورہ دوں

یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور یہیں رہیں گے - ہم پردیسیوں کو محبت یا نفرت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیئے - یہ سعدہ وغیرہ مّن موہنی لڑکیاں ہیں لیکن آپ مسافر ہیں میں کافی اونچ نیچ دیکھ چکا ہوں، جہاں ایک ہستی سے محبت ہوتی ہے وہاں دس بارہ آدمیوں سے خواہ نخواہ نفرت کرنی پڑتی ہے، اور یہ نفرت سے بالکل منحوس جذبہ ہے —— اس سے سیدھی سادی زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں دوسری بات یہ ہے کہ کسی انوکھے مشاہدے یا حیرت انگیز واقعے پر کم از کم پردیس میں متعجب نہ ہوا کریں، غیر ملک میں جو اوٹ پٹانگ چیز نظر آئے یوں منہ پھیر لیا کریں جیسے نظر ہی نہیں آئی - مجھے دیکھیں میں اہنسا، شانتی - عدم تشدد، بھوک ہڑتال، آواگون، پرمودھرما - یا شاید دھرمو پرما کا قائل —— انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر عراق میں لڑنے مرنے کے لئے تیار بیٹھا ہوں —— آپ سمجھئے؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ نشہ آور چیزیں سب استعمال کرتے ہیں ہندوستان میں تاڑی گانجا، افیم ٹھرا، بھنگ وغیرہ کھلم کھلا بکتی ہیں، نسوار بھی اتنی ہی مقبول ہے - تمباکو جیسی مضر چیز کو عوام پان کے بہانے کھاتے ہیں - یہ سب نشے معاف ہیں لیکن جہاں شراب کا نام آجائے لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں حالانکہ دیگر منشیات غیر سائنٹیفک ہیں اس لئے کہیں زیادہ نقصان دہ ہیں -

لیکن پبلک کا نزلہ شراب پر ہی گرتا ہے —— تان ہمیشہ یہیں ٹوٹتی ہے بتایئے ایسا کیوں ہے ——؟"

موہن بھی تقریباً آؤٹ ہو چکا تھا -

اگلے دن ہم خیمے میں تاش کھیل رہے تھے باہر ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں خیمے کا پردہ ہلا اور جبرجلیس جھانکنے لگا اس کے ہاتھوں میں تصویروں کا پلندا تھا ــــ چال میں لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں میں خمار ــــ

"اس تصویر میں ہم چاروں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا رہے ہیں ــــ لیکن یہ تصویر کیمپ میں لی گئی تھی۔ اگر بغداد میں اتاری جاتی تو ایک دوسرے کی کمر میں خنجر چبھوتے ہوئے نظر آتے ــــ"

"کیا ہوا ــــ؟" سب حیران رہ گئے۔

"میں ابھی ابھی بغداد سے آ رہا ہوں جو جو باتیں سُنی ہیں تم سب سے نفرت ہو گئی ہے ــــ"

"کس سے سنی ہیں ــــ؟"

"لڑکیوں سے ــــ"

اسے بہتیرا چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ بکے گیا۔

آخر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے وہ رقص گاہوں ہوٹلوں میں لی ہوئی تصویریں باہر پھینک دیں۔

اس نے ہر ایک کو باری باری گھورا اور باہر نکل گیا۔

پردے سے جھانک کر دیکھا تو وہ تصویریں اکٹھی کر رہا تھا۔ ایک ایک تصویر کو جھک کر اٹھاتا۔ رومال سے پونچھتا اور جیب میں رکھ لیتا۔

اس واقعے کے بعد جبرجلیس سے بول چال ختم ہو گئی۔ ہم اسے دیکھ کر راستہ کترا جاتے۔

ایک ہفتہ گزرا، دوسرا، پھر تیسرا ـــــ

پھر وہ خود آیا، ہمیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر بڑے عجز سے کہنے لگا ـــ "آئندہ میں کبھی دوستوں کو نہیں آزماؤں گا۔ اتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ شاید دوستوں کو میری کمی محسوس ہو گی اور وہ مجھے منالیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب میں معافی مانگنے آیا ہوں ـــــ"

شاید اس واقعے کی اطلاع برٹن کو پہنچ گئی تھی سنیچر کی شام کو جب ہم بغداد کے دجلے کی بجائے کیمپ کے دجلے کو دیکھ رہے تھے تو اس نے ہمیں ڈانٹا ـــــ تم دو تین ہفتوں سے منہ کھلائے بیٹھے رہتے ہو اگر اوروں کی بہبودی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تو لاالاقل کم از کم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا ہی لیا کرو۔

پھر اس نے مشورہ دیا کہ ــــ "ایک لڑکی کے لئے چند مرد آپس میں لڑیں تو جائز ہے۔ لیکن اگر تین چار لڑکیاں ایک دوسری سے مل کر تین چار مردوں میں ناچاقی کرا دیں تو قصور مردوں کا ہے بعد میں یہی لڑکیاں آپس میں ملیں گی تو فوراً شیر و شکر ہو جائیں گی۔ اور مرد بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ جائیں گے۔ لہذا آئندہ لڑکیوں سے فالتو باتیں مت کیا کرو"

اگلے دن سے موسم بہتر ہو جانے کے بہانے برٹن نے سب کو ڈرل اور پریڈوں میں جوت دیا۔ شام کو تھکے ہاروں کے سامنے ورزش کی تعریفیں کرتا ـــــ "اضطراب دور کرنے والی، سکون و طمانیت پیدا کرنے والی اور

کوئی شے نہیں ہے۔ ورزش دنیا میں بہترین "ٹرانکولائزر" ہے۔ پرانی مثل ہے کہ جو کھاؤ پیو اُسے جلاؤ بھی ___"

ایک روز برٹن نے پوچھا ___ "ریگستان کی ڈیوٹی نکلی ہے۔ کون جائے گا ؟"

جو جیتیں میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہاں کہہ دی اور اگلے روز نئی جگہ پہنچ گیا ___ چلنے سے پہلے منصور بولا "تمہارے جانے پر افسوس تو ہے لیکن یہ اطمینان ہے نئے نئے تجربے ہوں گے۔ فوجی زندگی کا یہ پہلو مجھے بہت پسند ہے سپاہی کا بستر ہمیشہ گول رہنا چاہئے بلکہ سپاہی اور بستر دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کچھ عرصہ رہنے کے بعد معمولی سے معمولی جگہ سے بھی اُنس ہو جاتا ہے اور جب کسی بہتر جگہ جانے کا موقع ملے تو انسان ٹال مٹول کرتا ہے۔ جامد رہنے کے لئے بہانے تلاش کرتا ہے۔ بیشتر لوگوں کو جمود پسند ہے۔ یہاں تک کہ میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنہیں ترقی کے زینے پر گھسیٹ کر زبردستی چڑھانا پڑتا ہے۔"

یہ اصلی صحرا تھا جہاں دُور دُور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اوپر نیلا آسمان، نیچے ریت، اِکادُکا جھلسے ہوئے درخت اور جھاڑیاں اور ہُو کا عالم!

میرے ساتھ جو چند آدمی تھے وہ کئی کئی دن کام پر باہر رہتے۔ جب لاری راشن اور دیگر چیزیں لاتی تو کچھ رونق ہو جاتی ورنہ چاروں طرف ہیبت ناک سناٹا تھا اور دلدوز خاموشی ___ جو میرے لئے بالکل نئی تھی۔

آہستہ آہستہ میں تنہائی اور صحرا سے مانوس ہوتا گیا، دُور دُور بستیاں

تھیں وہاں جانے لگا۔ صحرا کے اصلی باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تب معلوم ہوا کہ جسے میں اجاڑ ویرانہ سمجھتا رہا تھا، وہاں روئیدگی اور زندگی کی کمی نہ تھی، جہاں ریت تھا وہاں چند فیٹ نیچے اچھی بھلی زمین تھی کہیں سُرخ چٹانیں تھیں تو کہیں بھُوری اور سیاہ۔ کہیں لاٹ کے تودے تھے تو کہیں سوکھے ہوئے نالوں کی گذرگاہ۔

سراب دیکھ دیکھ کر ہر نظارے سے اعتقاد اُٹھ جاتا ــــ کبھی بہتے ہوئے دریا سامنے آجاتے، جھیلوں کی سطح پر درختوں کا عکس نظر آتا، لیکن یہ سب دُور دُور رہتے قریب جاؤ تو آگے چلے جاتے میلوں تک یہ دوڑ جاری رہتی۔

صحرا کی لڑائیوں کو سراب اس قدر پیچیدہ بنا دیتا ہے کہ کبھی کبھی پانچ چھ جھاڑیوں دشمن کی پلاٹون معلوم ہوتی ہیں، کبھی چرتی ہوئی بھیڑوں پر دشمن کے سوار "پٹرول" کا گمان ہوتا ہے جہاں محض تیس چالیس آدمی کئی سو کا جتھا دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں بعض اوقات دشمن کی پوری بٹالین ہزار گز سے بھی نظر نہیں آتی۔ کبھی افق سے سیاہ بادل اٹھتا۔ اس سے پہلے کہ آندھی کا شبہ ہو نصف سے زیادہ آسمان تاریک ہو جاتا۔ سیاہ بادل اٹھلاتے کھیلتے یوں آتے جیسے لاتعداد غبارے ہوا میں چھوڑ دیئے گئے ہوں ان کے نیچے ٹیلوں سے بگولے اُٹھتے اور چاروں طرف ستون ہی ستون اُگ آتے۔ سیٹیاں بجاتے ہوئے تیز جھکڑ چلتے۔ ان ستونوں کو منہدم کرتے۔ پھر ان ٹیلوں کو بھی اڑا لے جاتے یہاں سے وہاں تک تیرہ و تاریک پردہ پھیل جاتا بھورے بھورے ذرات سے

ابلتے اور ریت کی پھواریں پڑتیں۔ پردہ ہٹتا تو جیسے متلاطم سمندر میں سورج کی ٹکیا تیرتی ہوئی نظر آتی۔ طرح طرح کی شبیہیں اور ہیولے نظر آتے ـــ ایک سمت میں بھاگتا ہوا ہجوم ـــ کانپتی ہوئی عمارتیں ـــ تھرتھراتا جنگل ـــ کبھی یوں لگتا جیسے زلزلے سے کائنات کانپ رہی ہے ـــ کبھی ذرا سی دھند رہ جاتی۔ ابھی کچھ نظر آیا ابھی غائب ہو گیا۔

یہ شدید طوفان جس تیزی سے آتا اسی طرح اتر جاتا ٹیلے، افق، آسمان نظر آنے لگتے اور ذرا سی دیر کے بعد سب کچھ ساکن ہو جاتا۔ یقین نہ آتا کہ ابھی ابھی آندھی آئی تھی۔

ریگستان میں درجہ حرارت ایک سو تیس ہنیس ہو جائے لیکن راتیں بیحد خوش گوار ہوتی ہیں۔ دن بھر جانور غاروں اور بلوں میں چھپے رہتے ہیں۔ سہ پہر کے بعد جب دھوپ پیلی پڑتی ہے تو ہلچل مچ جاتی ہے۔ گلہریاں جھانکتی ہیں پرندے نکل آتے ہیں پھر سب کچھ سنہرا ہو جاتا ہے ـــ ریت کے ٹیلے آسمان اور سورج کی کرنیں ـــ ہر طرف سونا برسنے لگتا ہے۔ غروب آفتاب اپنی تمام سادگی کے باوجود بے حد حسین ہوتا ہے۔ پہلے بڑی ساری چمکیلی گیند کسی جھاڑی میں الجھ جاتی ہے پھر یک لخت کوئی اسے نیچے کھینچ لیتا ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا بادل مغرب سے گزر رہا ہو تو شفق پھولتی ہے۔

تارے نکلتے ہیں ـــ لرزتے، ٹمٹماتے، سہمے سہمے سے، پھر ایسا وقفہ آتا ہے جس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شام کا دھندلکا ہے یا صبح کا اجالا ہے۔

کچھ دیر کے بعد زمین و آسمان روشن ہو جاتے ہیں پہلے بڑے بڑے تارے مشعلوں کی مانند ہالہ بناتے ہیں، پھر لاتعداد ننھے منے تارے خود رَو پھولوں کی طرح ہر طرف سے نکل آتے ہیں۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے یہ جگمگ جگمگ کرتا چراغاں زمین سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ جیسے ہاتھ بڑھاؤ اور تاروں کو چھو لو۔

سب تارے روپہلے نہیں ہوتے۔ کئی نیلے ہوتے ہیں، کئی سبز، تو کئیوں سے سرخ رنگ جھلکتا ہے۔ سارا صحرا آباد ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی ہوتی ہے۔ آسمانوں کا نور چکنے پتھروں اور ریت کے ذرّوں سے منعکس ہوتا ہے تو چاروں طرف روشنیاں نظر آتی ہیں۔ ساکن روشنیاں، ٹمٹماتی، جھلملاتی روشنیاں۔ کچھ ایسی قندیلیں جو بجھ بجھ کر روشن ہوتی ہیں۔

اگر چاند ہو تو چاندنی طرح طرح کے روپ دھارتی ہے۔ آج کی مخروطی پھیکی چاندنی نے تاروں کو بھی اداس کر دیا تو کل چمکیلی، شوخ چاندنی تاروں سمیت نظارے پر اس طرح چھائے گی کہ اُفق کی تمیز رہے گی نہ زمین و آسمان کی۔ سب ایک ہو جائیں گے۔ کسی دن چنچل سی مست چاندنی فضاؤں کو مخمور کر دے گی، جامد و بے حس چیزیں رقصاں ہو جائیں گی۔ اُفق پہ تنہا کھجور کا درخت۔ بادل کا ٹکڑا، ڈوبتا یا ابھرتا چاند۔ مٹیالی اجڑی اجڑی سی رات اور اس کے بے نور تارے ۔۔۔ کئی تصویریں ذہن میں یوں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ مدتوں نہیں بھولتیں۔

پھر پچھلے پہر ایک دھند سی چھا جاتی ہے۔ آنکھیں پھر سراب دیکھتی ہیں ـــــ اسی دھند کے پیچھے کبھی برسنے والی گھٹا جھومتی ہے، کبھی پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے تو کبھی آبادیاں۔ صبح کاذب کی آمد پر مشرق میں مدھم سی روشنی یوں پھیلتی ہے کہ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ اجالا ہے یا اندھیرا، کچھ دیر کے لئے کم ہو گیا ہے۔ فوراً یہ جھلک غائب ہو جاتی ہے اور تاریکی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ستارہ صبح طلوع ہونے پر جو نور کل مغرب میں جا سمایا تھا۔ مشرق سے ہویدا ہوتا ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ کبھی ریت پہ جمی ہوئی شبنم کی خوشبو لاتے ہیں، کبھی گیلے کانٹوں کی خوشبو۔ نسیم سحری آہستہ آہستہ سارے ستاروں کو بجھا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر صحرا میں ہلچل مچتی ہے۔ پرندے فضاؤں میں زقندیں بھرتے ہیں۔ ہرن اوس چاٹتے ہیں۔ جاندار دن بھر کی قید کی تیاریاں کرتے ہیں۔

ایک ٹیلے کے پیچھے سے سورج جھانکنے لگتا ہے۔ بے حد دلکش اور سہانی صبح جلوہ گر ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا تھا وہ دیکھ رہا ہے۔

جب جنگلوں پہاڑوں اور آبادیوں میں دن چڑھتا ہے اور مخلوق جاگتی ہے تو صحراؤں میں خاموشی طاری ہونے لگتی ہے، تپش بڑھتی جاتی ہے اور سب پہ ایک سا جمود طاری رہتا ہے۔

لیکن دن بھر کی کلفتوں کا انعام صحرا کی رات ہے ـــــ ایسی رات اور کہیں نہیں آتی۔

ویرانے کو البادیہ کہتے ہیں اور جو وہاں گھومتا ہوا نظر آئے وہ لازمی طور پر
اباً عن جداً البدوی ہوگا۔ لیکن بدوؤں کو یہ نام پسند نہیں۔ وہ اپنے آپ کو عرب
کہتے ہیں۔ بدو کی زندگی کافی کٹھن ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ اس کی
غذا نہایت قوت بخش ہے (اگر ماہرین کو عمر بھر اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں
پر گزارا کرنا پڑے تو یقیناً اپنی رائے بدل دیں گے)

گرمیوں میں جب صحرا تنور کی طرح دہکتا ہے تو بدو کو اتنی پرواہ نہیں
ہوتی لیکن سردیوں میں جب منجمد کر دینے والی ہوا چلتی ہے تو وہ بہت
گھبراتا ہے کیونکہ اس کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے۔ تب ہی وہ مضبوط اور سخت
جان ہوتا ہے۔ کوئی بدو کمزور یا وہمی ہو تو صحرا میں نہ وٹامن کی گولیاں ملتی ہیں
نہ مقوی معجون —— چنانچہ جو بدو بچپن میں بیماریوں کے حملوں کا مقابلہ کر لیں
وہ واقعی توانا ہوتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بدو محض تفریحاً خانہ بدوشی
پر تلے رہتے ہیں۔ حالانکہ گرمیوں میں سارے قبیلوں کو کنوؤں، چشموں اور
نخلستانوں کے گرد محض ضرورتاً جمع ہونا پڑتا ہے اور سردیوں میں بھیڑوں اور
اونٹوں کی خاطر چراگاہوں کا طواف کرنا پڑتا ہے۔

لڑائی جھگڑا عموماً گرمیوں میں ہوتا ہے کیونکہ ہر قبیلہ جانتا ہے کہ دوسرے
قبیلے کہاں سے پانی لیتے ہیں، لہٰذا اس موسم میں سردیوں کے تنازعے چکانے
کا موقع ملتا ہے۔

موسم بے شک تبدیل ہو جائے لیکن بدوؤں کے لئے گرمیاں آفیشلی
تب ختم ہوتی ہیں جب علی الصبح آسمان پر سہیل نظر آنے لگتا ہے۔ سب ایک

دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ایک اور گرمی بخیر و عافیت گزر گئی۔
نومبر سے اپریل تک چراگاہوں کے چکر لگتے ہیں۔ عموماً دس دن سے زیادہ
ایک جگہ نہیں رہتے۔

بدوؤں کی شاعری اور موسیقی عموماً جنگ کے متعلق ہوتی ہے:
مثلاً ——— "آدھی رات کی ہوائیں، چمکتے ہوئے ستارے مجھے
جانتے ہیں۔
صبح کاذب کا اجالا، تپتا ہوا سورج اور بادِ سموم مجھ
سے آشنا ہیں۔
جلتی چٹانیں، اڑتا ریت اور نخلستان کا سبزہ میرے
گھوڑوں کے سموں کو پہچانتے ہیں۔"

اس گیت سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ اشعار کسی جنگ جو نے کہے ہیں
یا بے قرار صحرا نورد عاشق نے (اگرچہ عشق کے سلسلے میں بھی کافی خون خرابا ہوتا ہے)
صحرا میں تحریری ریکارڈ یا رجسٹر نہیں رکھے جاتے۔ اس لئے اپنے نام کے ساتھ بزرگوں
کا اور اولاد کا ذکر ابن ابو وغیرہ لگا کر کیا جاتا ہے، تبھی نام لمبے ہو جاتے ہیں۔

بدو کافی پی کر بہت خوش ہوتے ہیں اور بے حد گاڑھا تلخ اور رقیق مادہ NES
CAFE سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دو تین گھونٹ سے چودہ طبق روشن ہو
جاتے ہیں اور پھر بھوک نہیں لگتی۔ (اور یہی دونوں کیفیتیں بدوؤں کو پسند ہیں
——— چنانچہ جب موقع مل جائے کافی کا دور شروع ہو جاتا ہے)

ان کے ہاں کہاوتوں کا استعمال بہت ہوتا ہے، ان کہاوتوں میں بے ساختگی

ہے۔۔۔۔ "کتے کو پٹیو تو شیر دم ہلانے لگتا ہے"۔۔۔۔ "میرے دشمن کا دشمن میرا عزیز دوست ہے"۔۔۔۔ "دشمن کو مَیں کے قریب کھڑا ہو تو اسے اندر دھکیل دو"۔۔۔۔ "بابل کا مینار اس لیے تباہ ہُوا تھا کہ اس کے گرد شہر آباد تھا"۔۔۔۔ "دشمن کو ہمیشہ خوار کرو، اگر ابھی نہیں کر سکتے تو حالات سازگار ہوتے ہی ذلیل کرو"۔۔۔۔

کسی بات پر زور ڈالنا ہو تو پہلے آدھہ قصہ مزید بیان کریں گے ۔۔۔ مثلاً کسی نے اونٹ کو یہ دعا دی کہ خدا کرے تجھے چرنے جائیں۔ اونٹ بولا بیشک لے جائیں کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے ہر جگہ محنت کرنی ہے" اور چارہ کھانا ہے۔ یہی حالت میری بھی ہے ۔۔۔

دورانِ گفتگو انکساری دکھاتے ہیں اور اپنے آپ کو الفقیر کہتے ہیں، ایسے موقعوں پر انہیں ہمنا کلم کہنا پڑتا ہے۔

کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہو تو لوگ ملنے آجاتے ہیں اور فقط ایک فقرہ کہتے ہیں ۔۔۔ "اللہ تعالیٰ اگلی مرتبہ آپ پر کرم فرمائے"

دوسرے ملکوں کے متعلق ان کی معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ مجھ سے خوش ہو کر اکثر دعا دیتے ۔۔۔ "خدا کرے تمہارا قبیلہ فتح یاب ہو۔ دشمن قبیلے غارت ہوں۔ تمہاری چراگاہیں اور چشمے بسے رہیں اور تمہاری بھیڑوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔۔۔"

بدو اور اونٹ کی محبت بہت پرانی ہے لیکن اونٹ پاگل ہو جائے، دسمبر دوں میں اونٹ تھوڑے بہت پاگل ضرور ہو جاتے ہیں، تو سارا بان اور اح

خبیثہ کا اثر سمجھ کر اُسے زد وکوب کرتے ہیں (جو بالکل غلط علاج ہے)

طویل سفر سے پہلے جیسے موٹر کا تیل پٹرول وغیرہ چیک کیا جاتا ہے، اسی طرح اونٹ کی بھی چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں ٹٹولے جاتے ہیں۔ منہ کا معائنہ ہوتا ہے، جلد پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اونٹ میں پچیس چھبیس گیلن پانی سما سکتا ہے لیکن وہ اتنا سارا پانی کبھی خوشی سے نہیں پیتا، لہٰذا خشک صحرا کو عبور کرنے سے پہلے اونٹ کو ڈھا کر بالٹیوں سے منہ میں ڈالا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس سے نشر تمروں کی توقع بھی کی جاتی ہے (رات کا سفر تاروں کی مدد سے ہوتا ہے، حدی خوانی بھی کی جاتی ہے (کہا جاتا ہے کہ رات کو جب ساربان اونٹ کے کانوں کے قریب بلند آواز میں گاتا ہے تو اونٹ خوش ہوتا ہے اور غالباً۔ اُگتا بھی رہتا ہے)

اونٹ چلتے چلتے دفعتہً چست ہو کر بھاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ نخلستان قریب ہے کیونکہ نخلستان تلاش کرنے میں اونٹ سے اچھا گائڈ نہیں مل سکتا۔ تبھی وہ خود صحرا عبور کر لیتا ہے۔

ایک دفعہ رات کے سفر پر میں نے ساربان سے پوچھا کہ کون سا ستارہ چمکتا ہے؟

اس نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ——" ستارہ کیا اونٹ، سانپ اور منزل ... مجھے کچھ پتہ نہیں ——"

آسمان صاف ہو تو رات کو قطبی ستارے سے سمت معلوم ہو سکتی ہے لیکن گرد و غبار میں کچھ پتہ نہیں چلتا اگر اونٹ ساتھ نہ ہو

صحرا میں انسان دن کو بھی راستہ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ناک کی سیدھ میں چلے تب بھی۔ بدوؤں کی تھیوری ہے کہ جیسے دونوں بازوؤں کی لمبائی بالکل یکساں نہیں ہوتی۔ اسی طرح دونوں ٹانگوں میں بھی ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ خواہ تہائی یا چھ تہائی انچ ہی کیوں نہ ہو۔ چلتے وقت انسان مقابلتہً چھوٹی ٹانگ کے رُخ میں گھوم جاتا ہے۔ اگر پانچ چھ میل میں نصف فرلانگ کا فرق بھی پڑے تب بھی منزل پہ پہنچنا مشکل ہے۔

صحرا میں جگہ جگہ کھنڈر ملتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی دریا نے رُخ بدل لیا، کبھی گزرتی ہوئی فوج کچھ عرصہ ٹھہر گئی۔ کبھی چشمے سوکھ گئے اور صحرا کا ایک اور قصبہ اجڑ گیا۔ پھر آندھیاں اور ریت کھنڈرات کو یوں دفن کر دیتے ہیں کہ پاس سے گزرنے والے کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کبھی آبادی تھی۔ البتہ صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوتے ہو جائیں تو ہوائی جہاز سے اُجڑے شہروں، قصبوں کے نقشے جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اب تو بستے ہوئے گاؤں اور کھنڈرات اس قدر خلط ملط ہو چکے ہیں کہ ایک پہ دوسرے کا گمان ہوتا ہے گزشتہ صدی میں ایک کشتی اشوریوں کے زمانے کی برآمد شدہ چیزیں لئے جا رہی تھی کہ دجلے میں ڈوب گئی۔ قریب کے گاؤں والوں نے دریا سے سب کچھ نکال کر ہزاروں سال پرانے ہل، سہاگے کلہاڑیاں، بیلچے مدتوں استعمال کئے اور انہیں آج کل کے بنے ہوئے سامان سے کہیں مضبوط پایا۔

بارشوں کا مختصر سا موسم آتا ہے۔ کتنی دفعہ نیلے نیلے بادل برسا کر چلے

جاتے ہیں۔ آخر بوندیں پڑتی ہیں اور ایسی بارش ہوتی ہے کہ خشک جھلسی
ہوئی وادیوں میں ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ مدتوں کے پیاسے درخت گرد و غبار
اتار کر تروتازہ ہو جاتے ہیں۔ سوکھی زمین سے قسم قسم کی خوشبوئیں آتی ہیں
پانی طرح طرح کے تماشے کرتا ہے۔ کہیں مچلتے ہوئے بھنور بنائے
کہیں تالاب بن کر ساکن ہو گیا۔ چٹانوں پر پھواریں بکھیریں۔ خاردار جھاڑیوں
سے موتی ٹپکائے — یہاں آبشار گرایا، وہاں دلدل بنائی — اور غائب
ہو گیا۔ لیکن نگاہیں سراب کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں۔ پانی کے وجود پہ
یقین نہیں آتا۔

بہار آتی ہے تو میدان تک رنگ و بو کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ رنگ
رنگ کے خودرو پھول کھلتے ہیں۔ کہیں سے بے شمار تتلیاں آجاتی ہیں۔ نیلے
پھولوں پر گلابی تتلیاں، زرد کلیوں پر قرمزی تتلیاں — رنگوں میں اضافہ
ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ رونق صرف چند ہفتوں تک رہتی ہے، پھر بھی اس مختصر سے
وقفے میں جو کچھ نظر آجاتا ہے وہ سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔

لیکن بدوؤں کو ساری نباتات میں فقط کھجور سے الفت ہے —
اس کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں — کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ بہشت
سے زمین پر تین پودے آئے تھے — چنا، گیہوں اور کھجور۔ اور کھجور سارے
پودوں اور پھلوں سے افضل ہے! کھجور کا درخت تب خوش رہتا ہے اگر اس
کی چوٹی جہنم میں ہو اور جڑیں بہشت میں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس علاقے

میں جتنے درخت تھے سب برباد ہو گئے کھجور اس لئے رہ سکی کہ یہ بکریوں اور اونٹوں کے لئے ذرا اونچی تھی۔ چھ ہزار برس سے کھجور سے شکر، آٹا، سرکہ اور نبیذ بنائے جاتے ہیں ——— نبیذ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں لیکن مقامی حضرات کا اصرار ہے کہ یہ قطعاً بے ضرر ہے اگر اسی دن پیو تو کچھ نہیں کہتی لیکن چوبیس گھنٹے پڑی رہے تو پینے سے کچھ ہوتا ہے)

ایک دن لاری سے خط آیا، جس میں میرے تبادے کا ذکر تھا۔

واپس کیمپ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک یونٹ کے ساتھ محاذ پر جاؤں گا روانگی سے متعلق اطلاع بغداد سے آئے گی۔ موہن نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے دسویں جماعت پاس کر لی ہے اور بڑا اچھا خط لکھا ہے اس نے لڑکے کی تصویر دکھائی "والد صاحب مجھے بہت چاہتے تھے۔ مگر جب یہ پیدا ہوا تو انہوں نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ ہر وقت پوتے کو اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ——— کہتے ہیں کہ سود اصل سے زیادہ پیارا ہوتا ہے ——— کاش کہ یہ لڑکا مجھ سے بہتر ثابت ہو ———"

منصور اور میں لمبی سیروں پر جاتے۔ وہ کہتا ہے مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ محاذ پر جا رہے ہو۔ میں اپنی پر امن زندگی سے مطمئن نہیں ہوں خطروں اور حریفوں سے نبرد آزمائی کئے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ ایسے دوریاتین تجربے کافی نہیں ہوتے۔ جب موقع ملے الجھ جانا چاہیے، ورنہ نہ اپنی خامیوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے نہ خوبیوں کا۔ جہاں تم جا رہے ہو وہاں انتظار اور تشویش سب سے بڑے دشمن ثابت ہوں گے لیکن جب پہلی گولی چلے گی تو سب کچھ

بھول جاؤ گے، نہ ماضی یاد رہے گا نہ مستقبل۔ بس ایک دھن سوار ہوگی کہ اگر اس وقت ذرا سی چوک ہوئی تو تمہیں خود اپنی نظروں میں نہ گر جاؤ۔ اگلی آزمائش مقابلۃً آسان ہوگی اور ماحول کے اتنے عادی ہو جاؤ گے کہ خطرہ، خطرہ نہیں رہے گا۔

اس نے ایک واقعہ سنایا ―― "کردستان کی پہاڑیوں میں سات گڈریے طوفان میں گھر گئے۔ وہ سب ایک وادی میں تھے اور باہر نکلنے کا فقط ایک راستہ تھا جو درے سے باہر جاتا تھا۔ دوپہر سے لے کر شام تک درے پر بجلی کڑکتی رہی لیکن طوفان کی تیزی میں کمی نہ ہوئی۔ ایک بوڑھے گڈریے نے کہا کہ یہ آج ہم میں سے کسی کی جان لے کر ٹلے گی۔ یہاں انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ باری باری وادی سے نکلیں، جو درہ عبور کر گیا بچ جائے گا۔ قرعہ اندازی ہوئی ―― پہلا گڈریا ڈرتا ڈرتا نکلا اور وادی عبور کر کے درّے سے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسرا گڈریا بھی کانپتا ہوا گزر گیا لیکن بجلی نہیں گری۔ تیسرا، چوتھا، پانچواں سب نکل گئے۔ پھر چھٹا لرزتا ہوا نکلنے لگا۔ روانگی سے پہلے اس نے ساتویں کو خدا حافظ کہا، وہ بھی درّے سے گزر گیا ―― بجلی پھر بھی نہیں گری۔ جب درّے کو عبور کر کے وہ چھ کے چھ قہقہے لگا رہے تھے تو ساتواں موت کا انتظار کر رہا تھا۔ یک لخت بجلی کڑکی، زور کا دھماکا ہوا ―― درّے کے اس طرف چھ گڈریے مرے پڑے تھے، ساتواں بچ گیا تھا ―― جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہ نہ تو ایک دن پہلے ہوتا ہے نہ ایک دن بعد میں ―― یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا ――"

بغداد سے اطلاع آگئی اور میں لیوٹنٹ کے ساتھ ایک طویل سفر کے بعد

محاذ پر پہنچا۔

محاذ کا پہلا تجربہ نہایت عجیب تھا

جب بٹالین کو چلنے کا حکم ملا تو میں اور دوسرے ناتجربہ کار رات بھر جاگتے رہے اور خندقیں رات بھر پرانے سپاہیوں کے خراٹوں سے گونجتی رہیں۔ صبح کے پانچ بجے بتایا گیا کہ حملہ دو گھنٹے کے لئے ملتوی ہو گیا ہے۔ ذراسی دیر میں رابرٹسن کے چلانے کی آواز آئی، دیکھا تو وہ خندق میں بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اُسے شکایت تھی کہ چائے میں شکر کم ہے۔

دوپہر تک لڑائی ہوئی۔ پھر سہ پہر کو دشمن کی توپوں نے ایسی شدید گولا باری کی زمین ہلنے لگی۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے اور بیچ میں کمانڈنگ افسر ایک ٹیکری پر کھڑا اطمینان سے پائپ پی رہا تھا۔ کبھی کبھی دوربین لگا کر ادھر اُدھر دیکھتا پھر بڑے مزے سے کش لگاتا۔ گولا باری ہلکی ہوئی تو زخمیوں کو دیکھنے آیا۔ بار بار گلہ کرتا کہ آج کل اچھی دیا سلائیاں نہیں ملتیں۔ پائپ سلگاتے سلگاتے آدھی ڈبیا ختم ہو جاتی ہے۔ شروع شروع میں بڑی حیرت ہوتی۔ دشمن کی توپوں یا ہوائی جہازوں سے گولا باری ہو رہی ہے اور خندق میں ہم بڑے انہماک سے اڈنبرا والی جائداد کے انکم ٹیکس کا حساب لگا رہا ہے۔ تاہم ایک لڑکی کو رومان انگیز خط لکھ رہا ہے کہ تین ماہ کے بعد پھر چھٹی ملے گی تب ملاقات شیلانگ میں ہونی چاہیئے یا دارجیلنگ میں ——— شیلانگ بہتر ہے کیونکہ وہاں ہجوم کم ہوتا ہے۔

لڑائی کی شدت اور شور و غل میں لیفٹیننٹ ایک ایک RETURN کو غور

سے پڑھتا سجن اور گرامر کی غلطیاں درست کر کے انہیں دوبارہ ٹائپ کراتا۔ میرے تجسس سے وہ مسکراتے اور کہتے کہ بہت جلد تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔

چنانچہ چند ہی دنوں میں میں لڑائی کے میدان اور لڑائی کی آوازوں سے مانوس ہو گیا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک یونٹ کے ساتھ بغداد جانے کا موقع ملا۔

بغداد پہنچ کر یوں لگا جیسے چھوٹی سی بستی میں آگیا ہوں اور کیمپ تو بالکل ہی سنسان جگہ معلوم ہوئی۔ پرانے رفیق اب تک وہیں تھے۔ محفلیں بھی اسی طرح جمی تھیں لیکن اس کی نوعیت میں فرق آگیا تھا۔ ان میں شریک ہوتا مگر طالب علم کی حیثیت سے نہیں۔

منصور کہتا ——— "اب تمہیں بھی لڑائی کا تجربہ ہو چکا ہے، تم بھی کچھ بتایا کرو ———"

لیکن میں دوسروں کی باتیں سنتا رہتا۔

کیمپ میں ایک نیا چہرہ نظر آیا ——— سارجنٹ (جس کا ہندوستانی اردلی اُسے سر سٹھ صاحب کہا کرتا)، یہ بیزار شخص ہر وقت منہ لٹکائے چپ چاپ اپنے خیمہ میں بیٹھا رہتا۔ کوئی تقریب ہو یا شام کی محفل، اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ کبھی بولتا تو اپنے ماتحتوں کی شکایت کرنے کے لئے۔ ایک دن اپنے لفٹیننٹ کے خلاف رپورٹ لکھ کر برٹن کے پاس لایا کہ یہ لڑکا اکثر گستاخی کرتا ہے؛ قدرے کام چور بھی ہے اور ہر شام کو بہانہ بنا کر بغداد بھاگ جاتا ہے بڑا فضول خرچ ہے، تب ہی ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔

برٹن نے ہنس کر ٹالنا چاہا لیکن وہ پیچھے لگ گیا کہ لڑکے کو ضرور سزا ملنی چاہیئے۔ برٹن بولا ـــــ "میں اسے زبانی سمجھا دوں گا۔ سزا کیا دوں جبکہ اس کی عمر میں میں خود یہی حرکتیں کیا کرتا تھا۔ بڑا ہوگا تو زمانہ خود سیدھا کر دے گا۔"

برٹن نے سامرسٹ سے اس کی گہری اداسی اور خاموشی کی وجہ پوچھی۔ اس پر اس کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے ایسی کیفیت طاری ہوئی جو کچھ کچھ مسکراہٹ سے ملتی تھی۔

اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ چند سال پہلے وہ بالکل مختلف تھا ـــــ پینے پلانے کا شوقین، جوئے کا دلدادہ، ناچ گانے کا رسیا اور گھوڑ دوڑ کا عاشق۔ ان مشغلوں میں ساری تنخواہ ضائع ہو جاتی۔ آخر ایک دن اس نے ہمت کر کے توبہ کر لی اور سب کچھ ترک کر دیا۔ "اب آپ ایک بالکل نئے سامرسٹ کو دیکھ رہے ہیں جس میں ایک بھی برائی نہیں ہے ـــــ"

"سوائے ایک کے ـــــ کہ اب تم مکمل طور پر نیم مردہ ہو، تقریباً ختم ہو چکے ہو۔ ایسی توبہ کس کام کی جس کے بعد انسان میں زندگی کی اتنی سی رمق بھی باقی نہ رہے۔ میرے خیال میں توبہ سے پہلے تم یقیناً بہتر انسان ہو گے۔ اور یہ تمہیں کس نے بتایا کہ فوج میں امیر ہونے کے لئے بھرتی ہوتے ہیں؟"

سنیچر کی شام کو بغداد جاتے تو ڈڈ سے ملاقات ہوتی۔ ورنہ ہفتے بھر کسی شام کو کوئی پوچھ بیٹھتا کہ ڈڈ نہیں آیا تو برٹن کہتا ـــــ "وہ اپنے آپ کو سکاٹ مین بتاتا ہے تب ہی سنیچر کی شام کی خاطر بقیہ چھ دن کنجوسی کرتا ہے ـــــ"

وڈ کے الگ تھلگ رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کیمپ میں بیشتر افسروں کا کمیشن عارضی تھا اور وہ "ریگولر" تھا۔ لہٰذا ترقی کا مستقل خواہش مند۔ اکثر کہا کرتا کہ جب میں بریگیڈ کمانڈ کروں گا تو یوں ہوگا۔ جب ڈویژن کمانڈ کروں گا تو یہ ہوگا۔ اس کی گفتگو کا آغاز سکاٹ لینڈ سے ہوتا۔ بڑے فخر سے کہتا کہ سکاٹ لوگ اتنے زندہ دل ہیں کہ اپنی شہرہ آفاق کنجوسی کے قصے خود ہی گھڑتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ شروع ہوتی — "نپولین کا قول ہے کہ بار بار دشمن سے مت لڑو ورنہ وہ تمہاری ساری چالیں سمجھ جائے گا۔" یا "دشمن کے بارے میں برنارڈ شا نے کہا کہ — اس کی ہمیشہ قدر کرو۔ کیونکہ وہ تمہیں چست رکھتا ہے، نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔"

اتنی دیر میں نشہ چڑھنے لگتا، مخمور ہو کر اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا اور بڑی طنز آمیز باتیں کرتا — "مشرق ہی ہے — یہاں کے باشندے غلط محبت، شاعری، منشیات اور قدیم عظمت کے سہارے زندہ ہیں۔ میں پہلی مرتبہ ہندوستان گیا تو سونے چاندی میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور پان دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ یہ لوگ اپنا سارا سونا چاندی تو اس طرح کھا جاتے ہیں غربت کیوں نہ ہو۔ انگریز جب ہندوستان پہنچے تو باشندوں کو خون تھوکتے دیکھ کر بہت گھبرائے کہ کیسا ملک فتح کیا ہے، جہاں کا بچہ بچہ تپ دق میں مبتلا ہے، بعد میں پتہ چلا کہ وہ پان کی پیک تھوکتے تھے۔"

اس کی گستاخ باتیں دہریہ پن کی غمازی کرتی تھیں — "بیشتر لوگ کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور اس زندگی میں نیک کام کر کے اگلی دنیا

میں صدا چلاتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہم سب جاندار یعنی درخت پودے کیڑے مکوڑے، جانور، پرندے، انسان ـــــ بالکل ایک جیسے ہیں۔ ہمیں اپنے وجود سے پہلے کا کوئی علم نہ تھا۔ پیدائش بھی اتفاقاً ہوئی۔ ہم سب کی زندگی کی میعاد مقرر کی جا چکی ہے۔ فنا ہوتے ہی ہم جسمانی طور پر مفقود ہو جاتے ہیں لیکن اگلی دنیا میں فقط انسان ہی کو کیوں جلایا جائے گا؟ سارے درندے پرند، کیڑے۔ نباتات ـــــ یہ کیوں نہیں جلائے جائیں گے۔ خصوصاً وہ جن کو حادثوں، قحط سالی۔ وباؤں، شکاریوں نے عمر طبیعی سے پہلے ختم کر دیا تھا۔ انسان اپنے لئے قبرستان بنا کر کیسے لگا کر یہ توقع کرتا ہے کہ فقط وہی اگلی زندگی کا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ وہ سب بھی زندہ ہونے چاہئیں جو دنیا میں ایک مرتبہ سانس لے چکے ہیں ـــــ"

"بہت اچھا ـــــ" برٹن ہنس کر کہتا۔ "وہاں ووڈ کے پیچھے لگنے کے لئے ایک دو شیر چند چیتے اور تین چار سانپ ضرور پھر سے زندہ ہوں گے۔"

برٹن کو اس کی باتیں ذرا نہ بھاتیں۔ اس سے کہتا ـــــ "ووڈ تمہارے چہرے پر ہر وقت بیرنگ لفافے والا اظہار رہتا ہے۔ تم اس نکمے باورچی کی طرح ہو۔ جو ہر کھانا خراب کر دیتا ہو۔ یہاں تک کہ "کارن فلیک" اور دودھ کو بھی بگاڑ کر رکھ دے۔ بر ہفتے تم سے دور گزارے ہوئے یہ چند دن اتنے خوش گوار ہوتے ہیں جیسے بحیرۂ روم کی کسی تفریح گاہ پر گزارے ہوئے کئی مہینے ـــــ خدا تمہارے گناہ معاف کر دے تو کر دے لیکن تمہارا نروس سسٹم کبھی معاف نہیں کرے گا ـــــ"

لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور طنزیہ گفتگو جاری رکھتا —— "موصل کے شمالی مشرق میں یزیدی رہتے ہیں۔ بارہویں صدی میں ان کے شیخ نے تلقین کی کہ کسی سے نفرت نہ کرو، یہاں تک کہ شیطان کو بھی برا بھلا نہ کہو۔ یہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فی الحال شیطان زیرِ عتاب ہے کسی نہ کسی دن اسے معافی مل جائے گی۔ تب وہ گن گن کر بدلے لے گا۔"

"لیکن اپنے دوست وڈ کو کچھ نہیں کہے گا ——" برٹن نے بات کاٹی۔

مگر وہ بولتا چلا گیا —— "پچھلے ہفتے بغداد میں روز نے ایک قالین کی قیمت پوچھی۔ پھیری والے نے پچاس پاؤنڈ مانگے۔ ایک گھنٹے کی بحث کے بعد پانچ پاؤنڈ پر فیصلہ ہوا۔ جوڑی کے دوسرے قالین کے لئے میں نے بھی پانچ پاؤنڈ نکالے تو پھیری والے نے قالین کھینچ کر کہا کہ یہ سودا تو ان صاحب سے ہوا ہے، آپ سے از سرِ نو بحث کروں گا ——"

ہمیں غیر متوجہ پاکر وہ اور خفا ہوتا —— "کچھ تو بولا کرو ——"

"تم درست کہتے ہو ——" ہم اسے ٹالتے۔

"میں تمہیں ہم خیال نہیں بنانا چاہتا۔ بحث کرنا چاہتا ہوں۔ باقاعدہ جرح کرو ——"

"وڈ تم ہر چیز کے خلاف ہو اور آئرلینڈ کے اس باشندے کی طرح ہو جو کسی ڈوبتے جہاز سے تختے کے سہارے تیر کر تیسرے روز ایک نامعلوم جزیرے کے کنارے پہنچا۔ مقامی باشندوں نے اس کی دیکھ بھال کی تو ہوش میں آتے ہی پوچھا "یہ کون سا جزیرہ ہے؟ اور اگر اس جزیرے میں

کوئی حکومت ہے تو میں اس کے خلاف ہوں ____"

موہن بہت جھنجھلاتا ____" خاں صاحب، جن لوگوں کو موافق نہیں آتی وہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے ____ لعنت ہے ایسے نشے پر ____"

وُڈ بغداد جاتا تو کباڑیوں کی دکانوں کے چکر ضرور لگاتا۔ دن بھر کی چھان بین کے بعد کوئی سستی سی کتاب خریدتا۔ لائبریریوں میں جا کر ایسی کتابیں تلاش کرتا جن سے سنیچر کی شام کے لئے مواد مل سکے۔ منصور اُسے بتاتا کہ مغرب نے مشرق سے بہت کچھ لیا ہے، مغرب کے غیر جانبدار مصنفین کو بھی پڑھا کرو مثلاً انگلش میں عربی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ ایڈمرل جو پرسوں بغداد میں دیکھا تھا۔ الکحل جسے پی کر لاپرواہی تباہی بکتے ہو، ال کیمیا جو کیمسٹری کے نام سے بچپن میں پڑھی تھی یہ سب عربی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ پاجامہ جو رات کو پہنو گے مشرقی چیز ہے۔

"نہیں پاجامہ تمہارا ہرگز نہیں ہو سکتا، باقی باتیں مان لوں گا، لیکن پاجامہ ہمارا ہے۔" اس نے جھلا کر جواب دیا۔

لڑکیوں کے معاملے میں بھی وُڈ بالکل نکما تھا۔ سڑک پر جاتی ہوئی یہودن نے اسے متوجہ کرنے کے لئے پہلے اشارے کئے، پھر مجبوراً اپنا رومال گرا دیا۔ وُڈ نے جیسے زکام تھا، رومال اٹھایا اس میں چھینک ماری اور ناک پر پھیر کر یہودن کے ہاتھ میں واپس دے دیا۔

جو تجیس پل پر کھڑی ہوئی لڑکیوں پر تبصرہ کر رہا تھا ____ یہ حسین ہے مگر فربہ ہے ____ وہ زیادہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ عینک بہت موٹے

فریم کی لگا رکھی ہے اور اسے ضرور احساس کمتری ہوگا جو اس قدر اونچی ایڑی کے جوتے پہننے پڑے اور اتنا میک اپ تھوپنا پڑا۔ مگر وہ جو مٹک مٹک کر چل رہی ہے واللہ خوب ہے ـــــ"

"مہ جبیں دور دور سے دل خوش کرنا بیکار ہے ـــــ سب سے اچھی وہ ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ ساتھ چلے ـــــ" منصور بولا۔

اور میرا ماتھا ٹھنکا ـــــ فوراً سعدہ کا خیال آیا۔

"ان چند مہینوں میں کیا کچھ ہوا تھا ـــــ؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہوئی ـــــ" وہ مسکرانے لگا۔

"پھر یہ فقرہ کیسے زبان پر آگیا ـــــ ویسے ہمارے یہاں مثل مشہور ہے کہ ہمیشہ بھرے میلے سے رخصت ہونا چاہیئے۔

شام کو رقص گاہ میں سب خاموش سے تھے سوائے مہ جبیں کے منصور چپ تھا، سعدہ نظریں نیچے کئے بیٹھی تھی۔ سلیم اپنے پلے ہوئے دوستوں سمیت دو تین مرتبہ آیا لیکن ہم نے بھگا دیا

منصور رقص کرنے گیا تو سعدہ نے مجھ سے پوچھا ـــــ "ان چند مہینوں میں تمہیں کون فلسفی بنا گیا؟ کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں، بلکہ تم اپنی سناؤ ـــــ منصور سے تو ایک معنی خیز فقرہ سن چکا ہوں۔"

اس کی نظریں اور نیچی ہو گئیں۔

سعدہ کی سہیلیاں آگئیں، لوئی زا نے، ہتھیلی سامنے کر دی ـــــ "جنگل گردی

اور صحرانوردی کرکے آئے ہو ـــــ کوئی پیش گوئی کرو ـــــ"

جرجبیس سرپٹ بھاگا آیا ـــــ "اب پتہ چلا کہ تمہاری تکنیک کیا ہے۔ نرم ونازک ہاتھوں کو دیکھ چکے، سخت اور کھردری ہتھیلیاں بھی تھامو ـــــ"

"جرجبیس ملکہ یہ کہتی ہیں کہ خدانخواستہ شادی ہوگی ـــــ"

"کس سے ہوگی ؟ اس کا نام کیا ہے ؟" ـــــ اس نے لوئی زا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی سے ہوگی۔ جس کا نام مسز جرجبیس ہوگا۔ اور تمہاری شادی شدہ زندگی کے پہلے دو تین سال زیادہ خوش گوار نہیں ہوں گے ـــــ"

"پھر ـــــ ؟"

"پھر تمہیں رنج و غم کی عادت پڑ جائے گی ـــــ"

جرجبیس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

پروگرام بنا کر دجلے میں کشتی کی سیر کی جائے۔ بڑی سہانی رات تھی چاند نکلا ہوا تھا۔

لوئیتا ایک نئی لڑکی کو لائی اور مجھ سے کہا ـــــ "ہم دونوں آپ کی کشتی میں چلیں گی۔"

منصور نے بتایا کہ یہ لطیفہ ہے سعدہ کی چھوٹی بہن، ابھی ابھی ایران سے آئی ہے۔

"یہ التفات اس لئے ہے کہ ساری شام تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لڑکیوں کے بھی عجیب موڈ ہوتے ہیں۔ آج خوشامد چاہتی ہیں تو کل

"بے رُخی پر ریجھ جائیں گی۔" وہ میرے کان میں بولا۔

"جب تمہیں کو سواریاں نہیں مل رہی تھیں۔ لوئی زا کی منتیں کر رہا تھا —— "اللہ مدت کرو، خدا کے لیے کچھ چاند تاروں کا —— لحاظ کرو، آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ایسی حسین رات سے کچھ فائدہ نہ اٹھاؤ گی۔ کیا تمہیں قدرتی نظاروں کا اتنا سا بھی پاس نہیں ؟"

میں نے چپو سنبھالے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ لطیفہ نے کہا ——
"کنارے پر چلیے، میں کچھ بھول آئی ہوں ——"

واپس گئے۔ دونوں میں کھسر پھسر ہوئی اور لولیتا اتر گئی۔

میں نے پھر چپو سنبھالے —— لیکن کشتی کے رُخ کے متعلق ہدایتیں ملنے لگیں —— اس طرف موڑیے —— اب اس طرف چلیے۔

دراصل وہ چاہتی تھی کہ اس کا منہ چاند کی طرف رہے لیکن اس طرح کشتی غلط رُخ میں چلی جاتی۔

"جگمگاتے چہروں کو چاندنی کی کیا ضرورت ہے؟" مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ لڑکیاں زیادہ تخیل پرست ہوتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"صحیح ہے، تو مگر درست نہیں ——"

"کیوں —— ؟"

"سنا ہے کہ کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو جھاڑیوں میں پرندے تلاش کرنے کی بجائے کھیل شروع ہوتے ہی پچھتے پر رکھ لیتی ہیں ——"

"یہ بتائیے کہ محبت کے لیے حسن و دلکشی کے علاوہ اور کیا کیا خوبیاں

ضروری ہوتی ہیں؟"

"موقعے پر موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر فرصت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

اس نے سعدہ کا ذکر چھیڑا ــــــ "حالانکہ وہ میری سگی بہن ہے لیکن ہم بچپن سے ہی دور دور رہی ہیں۔ تب ہی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ میری بہن ہے بھلا یہ کیسے بتاؤں کہ اسے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ سب کے منع کرنے پر بھی وہ سلیم سے ملتی ہے ــــــ اور یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو ــــــ؟"

"کنارے کی طرف ــــــ"

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں ــــــ" وہ چڑ گئی۔

"سب عورتیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں"

کنارے پر منصور بولا ــــــ "جب دو بہنوں یا دو عزیز سہیلیوں سے واسطہ پڑ جائے تو ٹل جانا چاہئے۔ ورنہ بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سعدہ کی نظریں تمہاری کشتی پر تھیں۔"

"میں اس مقولے کو جانتا ہوں اور ابھی ابھی اسی پر عمل کیا تھا ــــــ لیکن جہاں تک سعدہ کی نگاہوں کا تعلق ہے وہ تمہارے لئے مخصوص ہو چکی ہیں۔"

"مرد و عورت کی محبت کو چاند سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن دوستوں اور بھائیوں کی محبت تاروں کی طرح ہے، اگرچہ جگمگاہٹ کم ہے لیکن قابل یقین اور صادق ہے ــــــ" اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

ایک شام کو کیمپ میں چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ اچھی اچھی باتیں ہو رہی تھیں کہ وُڈ آگیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ اس نے پہلے تو حسبِ معمول سکاٹ لینڈ کی باتیں کیں۔ جب نشہ چڑھا تو فوراً عربوں کا ذکر شروع کر دیا۔ "خلافت کے آخری دنوں میں ایک حکمران نے قسم کھائی کہ جب تک منگولیا کی خاک پاؤں تلے نہ روند لوں گا، چین سے نہ بیٹھوں گا۔ فوجی کامیابی تو کیا ہونی خاک ہونی تھی۔ درباریوں کی ہر روز شامت آتی۔ آخر تنگ آکر امراء وزراء نے منگولیا سے مٹی کی بیس پچیس بوریاں منگائیں۔ مٹی دربار میں بچھائی گئی۔ جسے روند کر حکمران مطمئن ہو گیا ——— ایسی باتوں سے چڑ کر ہلاکو نے حملہ کیا تھا ———"

"اس مرتبہ بغداد سے کون سی کتاب لائے ہوئے ہو ———؟" برٹن نے ہنس کر پوچھا۔

تاریخ کی ایک دلچسپ کتاب ہے، جس میں لکھا ہے کہ بغداد کے لٹتے ہی دو ہی شخصیتیں نظر آئیں، وزیر ——— جو خلیفہ اور رعایا کے درمیان آ کھڑا ہوا اور جلّاد ——— جو دربار میں تلوار لئے منتظر رہتا تھا۔

"اور تیسرا وُڈ تھا جو کباڑیوں کا مہتمم مقرر ہوا ———" رچرڈ نے لقمہ دیا۔ "جلّاد کس مغربی بادشاہ کے پاس نہیں تھا؟" برٹن نے پوچھا۔ "اور پھر مجرموں کو سیدھا بھی تو کرنا پڑتا تھا۔"

لیکن وُڈ کی تقریر جاری تھی ——— "حالانکہ عربوں کی سلطنت بحرِ اوقیانوس تک پھیل چکی تھی۔ تاہم یورپ کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے ———"

"یورپ میں ان دنوں کچھ تھا ہی نہیں ——— لہٰذا جاننے نہ جاننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔" منصور بولا۔

"دسویں صدی میں جغرافیہ دان مسعودی نے لکھا ——— کہ شمال کے لوگ ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سورج نصف النہار پر کبھی نہیں آتا۔ شدید سردی نمی اور برف باری نے انہیں گرم جوشی اور تپاک سے محروم کر دیا ہے قوی الجثہ شمالی باشندے نہ لطیف جذبات سے آشنا ہیں نہ آداب گفتگو سے ———"

"یوں لگتا ہے جیسے مسعودی نے وڈ کی تصویر کھینچی ہے ———" برٹن نے قہقہہ لگایا۔

"پھر گیارہویں صدی میں طلیطلہ کے قاضی نے کہا کہ یورپ کے باشندوں کے رنگ پیلے ہیں اور جسم بے ڈھنگے، وہ حجامت نہیں کراتے، نہ نہاتے ہیں، ان میں ذہانت، مستعدی، متانت اور وسیع النظری کی کمی ہے" اور وہ جہالت، تعصب اور بدتمیزی کی جانب مائل ہیں۔ طلیطلہ کے قاضی کو یہ خیال نہ آیا کہ طلیطلہ سپین میں ہے، لہٰذا یورپ میں ہے۔"

"قاضی نے یہ بیان وڈ جیسے آدمیوں کو مدنظر رکھ کر دیا ہوگا۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

لیکن وڈ لگاتار بول رہا تھا۔

برٹن نے پہلے کسی مخمور کو نہیں ڈانٹا تھا لیکن اس رات غصہ ضبط نہ کر سکا۔ بڑے تلخ لہجے میں بولا ——— "وڈ اوّل تو تم سکاٹش نہیں ہو

کیونکہ تمہاری ساری عمر جنوبی افریقہ میں گزری ہے اور پھر تمہیں یہ پتہ نہیں کہ لوگ کسی ملک کا اندازہ فقط ان چند باشندوں سے لگاتے ہیں جن سے اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ تمہیں دیکھ کر لوگ انگریزوں کے متعلق کیا سوچتے ہوں گے۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ انسان متضاد عناصر سے بنا ہے ـــــ بے وقوفی دانائی۔ بزدلی، دلیری، رذالت اور شرافت کا مرکب ہے۔ اصل چیز ہے امتزاج ـــــ کہ ان عناصر کا توازن کیا ہے، اور اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ وہ چاہے تو خوبیوں میں اضافہ کر سکتا ہے۔ برائیوں کو دبا سکتا ہے۔ خدا کے لئے تم بھی کبھی کوشش کیا کرو۔ رہ گیا تمہارا ریگولر افسر ہونا، اور ترقی کے لئے بے چینی کہ جلد از جلد بریگیڈیر اور پھر جنرل بن جاؤ ـــــ اس سلسلے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی قسم کے جنرل بنے تو ـــ یا جنرل مرچنٹ ہو گے یا ڈپٹی اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل۔ جنرل نالج اور جنرل موٹرز کے لئے بھی کوشش کر سکتے ہو۔"

اگلی صبح برٹن نے ٹیلیفون کیا اور روڈ کا تبادلہ ہو گیا۔

کچھ عرصہ پھر ریگستان میں گزارنا پڑا۔ واپس کیمپ پہنچا۔ تو روز نے بتایا کہ برجیس لاپتہ ہے۔ اس کے محکمے والوں نے اسے موصل کی طرف بھیجا تھا تب سے کوئی خبر آئی نہ خط۔ مجھے یونہی وہم ستانے لگا، نہ جانے بے چارہ کس حال میں ہو گا۔ سب کہتے کہ خواہ مخواہ فکر کرتے ہو، خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، کہیں مزے کر رہا ہو گا۔ لیکن میری تشویش نہ گئی۔

آخر ایک دن روز کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ اس کے

گاؤں کو تلاش کیا۔ بڑی مشکلوں سے وہاں پہنچے۔ گھر تلاش کر کے آواز دی۔ سفید بالوں والی معصوم سی ضعیفہ باہر نکلی، بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ "آپ جرجیس کے دوست ہیں؟" اس نے پوچھا۔ ہمارے ہاں کہنے پر اس نے بتایا ——— "کتنے دنوں سے وہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ہر آہٹ پر چونک کر پوچھتا ہے امی میرے دوست آئے ہیں۔ جب کہتی ہوں کہ نہیں آئے تو خفا ہونے لگتا ہے ——— امی وہ ضرور آئیں گے، میرے دوست ایسے نہیں کہ میں یاد کروں اور وہ نہ آئیں ———" ضعیفہ رونے لگی اس کی پر شفقت غمگین آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے۔

اندر جرجیس لیٹا ہوا تھا۔ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا "دیکھا امی! میں نہ کہتا تھا کہ یہ آہٹ میرے دوستوں کی ہے۔"

میں نے بازوؤں کا سہارا دے کر اُسے اٹھایا ——— کیا ہوا جرجیس، میرے عزیز دوست! یہ کیا حالت بن گئی؟ یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہڈیوں کا پنجر وہی کھلنڈرا زندہ دل لڑکا ہے جسے ہمیشہ بہتر دنوں کی توقع رہتی تھی۔ اب اچھی طرح باتیں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس اجاڑ سے گاؤں میں کوئی طبیب نہیں تھا۔ بڑھی بے چاری کو جو کوئی الٹا سیدھا مشورہ دیتا اس پر عمل کرتی، جڑی بوٹیاں، ٹونے ٹوٹکے سب آزما چکی تھی لیکن لمبا بخار نہیں اترتا تھا۔

ضعیفہ رات بھر باتیں کرتی رہی ——— "وہ عمر بھر کی پونجی چار بچے تھے، ان میں سے تین بچپن میں سدھار گئے۔ اور خدا گواہ ہے کہ میری غفلت یا

لاپرواائی سے نہیں مرے۔ جب رخصت ہوئے تو موٹے تازے تھے۔ پھر ان کے والد کا بلاوا آیا۔ مرتے وقت انہوں نے میری خدمت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا۔ اور دعائیں دیں۔ جرجیس کو جن مصیبتوں سے پالا میں ہی جانتی ہوں۔ اس کی تنخواہ سے کچھ بھی نہیں لیا، بلکہ اپنی محنت مشقت کی کمائی سے کچھ نہ کچھ اسے بھیج دیا کرتی کہ کہیں پردیس میں تکلیف نہ ہو۔ جب سے یہ باہر گیا مجھے لمحہ لمحہ اس کا انتظار رہتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے بے قرار رہتی لیکن یہ مدتوں نہ آتا۔ اس کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتی ——— جرجیس افسر ہے لیکن اس کی ماں محنت مشقت کرتی ہے۔ کہیں لوگ اس کا مذاق نہ اُڑائیں۔ یہ بڑا اچھا بچہ تھا لیکن جب سے بیمار ہوا ہے بالکل بدل گیا ہے جو کچھ اسے سکھایا تھا بھلا بیٹھا ہے۔ پہلے سچا اور نیک تھا، اب جھوٹ بولنے لگا ہے، بے ادبی، چغلیاں، خدا سے نہ ڈرنا، چڑچڑا پن ——— نئی نئی باتیں سیکھ گیا ہے ———" اس کے پژمردہ چہرے کی جھریاں اور گہری ہوگئیں اور ان پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔

صدمے، مصیبتیں، سہمی سہمی امیدیں۔ مادرانہ خوش فہمیاں، صبر و تحمل ——— ایک ماں کی ساری زندگی سامنے آگئی۔

"تم تو اس کے دوست ہو، بتاؤ یہ کیوں اتنا بدل گیا ہے؟"

"بیماری بڑی ظالم چیز ہے، جہاں جسم کو پھونکتی ہے وہاں ذہنی تبدیلیاں بھی لاتی ہے، خیالات اور عادتوں کو بدل ڈالتی ہے ——— ہم اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور بہت جلد تمہارا پرانا جرجیس واپس گھر آجائے گا۔"

اسے ہسپتال لائے، خاصے طویل علاج کے بعد وہ تندرست ہوا تو پوچھنے لگا "تمہارا شکریہ ادا کرنا تو مشکل ہے، دوستو کوئی حکم دو، میں بجا لاؤں گا۔"

"اب سے اپنی ماں کی خدمت کیا کرنا" ہم نے کہا۔

جب میں اور نقد رحبیس کو لے کر گاؤں پہنچے تو ضعیفہ نے ہمیں دعائیں دیں — "تم نے میرا بجھتا ہوا چراغ روشن کیا ہے، اگلے جشنِ چراغاں پر تمہارے لئے دو دیئے جلاؤں گی، اور رحبیس کی اولاد میں دو لڑکوں کے نام تمہارے ناموں پر رکھوں گی۔

دجلے کے کنارے تہوار منایا جا رہا تھا۔ کیمپ میں بڑی رونق تھی، روشنیاں جلائی گئیں، باجے بجے، بڑی شاندار محفل منعقد ہوئی۔ لیکن وڈ موجود تھا۔ وہ بغداد سے تہوار منانے آیا تھا۔ سب شور مچا رہے تھے اور وہ خاموش بیٹھا تھا۔

"وڈ کیوں منہ پھلا رکھا ہے؟ ٹھیک تو ہو؟" کسی نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں ——"

"تو اپنے چہرے کو بھی مطلع کر دو ——"

گانے شروع ہوئے تو سب نے اصرار کیا کہ برٹن بھی کچھ سنائے۔ بوڑھا ترنگ میں تھا۔ اس نے یہ نغمہ سنایا —

خواب میں دیکھا کہ ایک خوش نما جزیرے میں
ہوں، جہاں پھول ہیں، سنگا پر ہے اور موسیقی
جہاں فقط لڑکیاں ہی لڑکیاں آباد ہیں —
تین چار سو حسین چنچل خوش گلو لڑکیاں!

اس کے باوجود مجھے بار بار رونا آتا کیونکہ
خواب میں مَیں بھی ایک لڑکی تھا!

اس پر پٹاخے چلائے گئے، غبارے چھوڑے گئے، جام بھرے گئے اور اگلا راؤنڈ شروع ہوا۔

پھر شکار کے قصّے ہوئے، موضوع بدلا اور آباؤ اجداد کے تذکرے ہونے لگے نشے میں ہر ایک اپنا شجرہ کسی مشہور نام سے ملا رہا تھا۔

آخر رَوزز بولا ــــ "حضرات آپ نے بحیرۂ مردار کا نام تو سنا ہوگا"

"سُنا ہے ــــ دیکھا ہے ــــ جانتے ہیں ــــ" آوازیں آئیں۔

"اسے میرے مورثِ اعلیٰ نے ہلاک کیا تھا ــــ" روزز نے بڑے فخر سے کہا۔

"وڈ خاموش ہے، اس سے بھی کچھ سنو ــــ" کسی نے فرمائش کی۔

"پروفیسر وڈ کی جگہ آج پروفیسر رَوزز لیکچر دیں گے۔ طلباء ٹائم ٹیبل میں ترمیم کر لیں ــــ" روزز نے نعرہ لگایا۔ وہ گلاس تھامے اٹھا اور ایک میز پر چڑھ گیا۔

"میں نے بھی کباڑیوں سے کچھ بوسیدہ کتابیں خریدی ہیں لہٰذا مجھے بھی حق حاصل ہے کہ تاریخ پر گوہر افشانی کروں۔ میرا نام رَوزز اس لئے ہے کہ میرے والد کا نام رَوزز تھا۔ میرا مذہب بھی وہی ہے جو میرے باپ دادا کا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں مغرب میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ کس مذہب میں اور کس براعظم میں جانا پسند کرو گے؟ پھر بچپن سے سننے میں آیا کہ مشرق کے باشندے کمزور اور سُست ہوتے ہیں، وہمی اور ماضی پرست بھی ہیں۔ یہ بھی پڑھا کہ مشرق میں قالین اُڑتے ہیں اور سے

سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں، بوتلوں میں سے جن نکلتے ہیں۔ ہر دوسرا شخص سادھو ہے، ہر تیسرا فقیر، ہر چوتھا علی بابا اور ہر پانچواں نواب ہے یا مہاراجا چپے چپے پر سانپ سپنولے اور شیر چیتے منتظر رہتے ہیں۔ ہر چوراہے کے قریب خزانہ دفن ہے۔ دعا ازی خوش نہیں ہے اور بددعا فوراً لگ جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تاثرات ان لوگوں کے تھے، جنہیں ایسی باتیں لکھنے کا خاص شوق تھا جو پہلے تو مشرقی لوگوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے پھر انگلستان یا یورپ پہنچ کر ایسی کتابیں لکھ مارتے تھے۔ ان دنوں بھی میں نے مغربی حضرات کو فقط خاص خاص نظاروں کی تصویریں اتارتے دیکھا ہے —— فوٹوگرافی میں بھی تضحیک کا پہلو ہوتا ہے۔ سہ پہر کو اونگھتے ہوئے دکاندار، جھکے ہوئے کمزور جانور، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا حجام۔ لولے۔ لنگڑے، اپاہج —— غرضیکہ ہم وہی تصویریں کھینچتے ہیں جو کھینچنا چاہتے ہیں۔ ان کی روٹی کو نرم پلیٹ اور شلوار کو چھوٹا خیمہ کہہ کر ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ہمارے سرسبز و شاداب ملکوں میں دن بھر تپش ہو، لو کے تھپیڑے ہوں۔ پیاس میں بار بار پانی پینا پڑے، تیز شعاعوں اور ریت کے ذرّوں سے آنکھوں کی چمک جاتی رہے، مکھیاں، مچھر، جراثیم جان کے لاگو ہو جائیں —— ہماری خنک اور روح پرور آب و ہوا بدل جائے تو کیا ہم کمزور اور سست نہیں ہو جائیں گے۔ یہاں کی چڑیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اپنے اخبار فروشوں کا حوالہ دیتے ہیں جو اخباروں کا بنڈل اور سکوں کے لئے بہت سڑک پر

چھوڑ کر اطمینان سے شراب خانے میں جا بیٹھتے ہیں۔ لیکن اگر سب کی جیبیں بھری ہوئی ہوں تو تانبے کے چند سکوں کے لئے کوئی کیوں بے ایمانی کرے گا؟ کیا وہاں ڈاکے نہیں پڑتے؟ بینک نہیں لوٹے جاتے؟؟ یہاں کے ظلم و تشدد پسندی کے قصے سناتے وقت وڈ جیسا مورخ بھی بھول جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں سوا دو سو جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی۔ ـــــ شلجم چرانا، خانہ بدوشوں سے میل جول، درخت کاٹنا، بلا اجازت شکار کھیلنا ـــــ ان شدید جرائم کی فہرست میں شامل تھے۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں انگلستان میں نہ پولیس تھی نہ جیل خانے تھے۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں سر رابرٹ پیل نے اعتراف کیا تھا کہ جتنی کڑی سزائیں انگلستان میں دی جاتی ہیں۔ دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں دی جاتیں۔ صلیبی جنگوں کو مدتیں گزر چکی ہیں لیکن ہمیں وہ شکست اب تک یاد ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں جب یروشلم فتح ہوا تو ہمارے وزیر اعظم نے فرمایا کہ جو کام ہمارے سورما صلیبی جنگوں میں نہ کر سکے وہ ہم نے کر دکھایا ہے ـــــ اور یہ بیان بیسویں صدی میں دیا گیا تھا۔ جس رفتار سے عربوں نے ملک پر ملک فتح کئے۔ دنیا کی عسکری تاریخ میں اس کا جواب نہیں۔ حساب لگائیے کسی اور قوم نے اتنے قلیل عرصے میں اتنا وسیع رقبہ آج تک فتح کیا ہے؟ لیکن مغربی مورخ ان کارناموں کو سراہنے کی بجائے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے ہیں کہ سلطنت روما پہلے ہی سے زوال پذیر تھی۔ ہسپانیہ کے اندرونی حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ رچرڈ شیر دل کو واپس جانے کی جلدی تھی۔ بازنطینیوں کا دھیان کسی اور طرف تھا ـــــ

اور اس پر طرہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو سپورٹس مین کہتے ہیں۔ ہم انہیں قبر پرست اور ماضی پرست کہتے ہیں، جنہیں تیرہ سو سال پہلے تلقین کی گئی تھی کہ بہترین قبر وہ ہے جو ہاتھ کی ہتھیلی سے مٹائی جا سکے، مذہب کے نام پر جنگ اور مذہبی تعصب کا الزام ان پر لگاتے ہیں جنہیں تعلیم دی گئی تھی کہ سب۔۔۔ اچھا جہاد وہ ہے کہ جو انسان اپنے نفس کے خلاف کرے۔ ہم انہیں عورتوں پر ظلم کرنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ جنہیں بتایا گیا ہے کہ عورت کو کبھی ایذا نہ پہنچاؤ، یہاں تک کہ اُسے پھول تک نہ مارو۔ یہ بتائیے کہ زکوٰۃ اور سوشلزم کے انکم ٹیکس میں کیا فرق ہے؟ کیا حج بین الاقوامی میل جول کی تیرہ سو سال پرانی کوشش نہیں؟؟ آخر میں میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مشرقی ممالک نے کب درخواست کی تھی کہ مغربی تہذیب پھیلانے کے سلسلے میں ان پر حملہ کیا جائے؟ اور انہیں زیر کر لیا جائے؟؟۔ اب میں اپنے مؤرخ دوست وُڈ سے درخواست کروں گا کہ آئیں اور پرانے خیالات پر روشنی ڈالیں ——"

لیکن وُڈ خاموش رہا۔

مومن نے میرے کان میں کہا —— "خاں صاحب! میں نہ کہتا تھا کہ وہسکی جہاں الٹی سیدھی باتیں کراتی ہے وہاں کبھی کبھی سچ بھی بلوا دیتی ہے ——"

برٹن ریگستان سے واپس آیا تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ پہلے پاؤں میں کانٹا چبھا، پھر پاؤں سوج گیا، ہسپتال میں لیٹنے سے اُسے سخت نفرت تھی۔ بڑی مشکل سے منایا۔ بار بار یہی کہتا —— "خدا کے لئے زیادتی مت کرو، میں پرانا سپاہی ہوں، آج تک ہسپتال میں نہیں لیٹا ——"

چند دنوں میں میرے تبادلے کے احکام آ گئے۔ برہٹن سے ملنے گیا۔ اس کا بخار پہلے سے زیادہ تھا لیکن مونچھیں اور بھویں اسی طرح تنی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تکئے کے نیچے چھپایا ہوا سگار نکالا ــــــ وہ اسے سلگا کر بولا۔ "مجھے پینے کی اجازت نہیں ہے، کم از کم اس کی خوشبو ہی سونگھ لوں ــــــ"

اتنی تکلیف اور نقاہت کے باوجود اس کی آواز میں وہی کرارا پن تھا۔

"مجھے قدیم چینیوں کا فلسفہ بہت پسند ہے کہ جب تک تندرست رہے ڈاکٹر کو باقاعدہ فیس دیتے رہے، جوں ہی بیمار ہوئے فیس بند ــــــ"

میں نے اپنے تبادلے کا ذکر کیا۔

"بہت اچھا ہوا۔ یہ علاقہ دیکھ چکے ہو، جاؤ دوسرے ملک دیکھو۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو تبادلے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن بعد میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ایک جگہ دیر تک رہنے سے تو دیمک لگ جاتی ہے۔ چھٹی پر وطن جاتا تو دیکھتا کہ جن ساتھیوں کو گاؤں میں چھوڑا یا تھا وہ کوشش اور ترقی کر کے شہروں میں پہنچ چکے تھے۔ ادھر شہر میں امیر لوگوں کی یہی خواہش تھی کہ دیہات میں کوئی باغ ہو یا فارم ــــــ لیکن فوج میں انسان یہ سب جگہیں دیکھتا ہے..."

درد سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرے پر کرب کے آثار اور نمایاں ہو گئے لیکن لبوں پر مسکراہٹ بدستور رہی۔

"ڈاکٹر نا امید ہو چکے ہیں لیکن میں موت یا آئندہ زندگی کے متعلق زیادہ نہیں سوچتا۔ مجھ سے پہلے ایسے ایسے اعلیٰ اور دلیر انسان اسی راستے سے چپ چاپ گزر گئے۔ جو کچھ ان پر بیتی ہو گی بے شک مجھ پر بھی بیت لے ــــــ"

اتنے میں ایک سرخ بالوں والی چھریری حسینہ آئی۔ برٹن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، نبض گنی، ٹمپریچر لیا۔ دو چار مذاق کئے اور چلی گئی۔

"یہاں لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں خصوصاً یہ گریس۔ یہ تو دس دس منٹ کے بعد آجاتی ہے تب ہی میں ہسپتال میں لیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل میں ہسپتال سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا نرسوں سے ——— تم ہی بتاؤ کہ اس عمر میں چہلیں کرتا ہوا کچھ اچھا لگوں گا؟ جس دور سے یہ گریس گزر رہی ہے میں تیس پینتیس سال پہلے گزر چکا ہوں ——— تمہاری روانگی کب ہے؟"

"آج جانا ہے ——— لیکن آپ بیمار ہیں ———"

"نہیں! آج ہی روانہ ہو جاؤ اور جلدی سے نئی جگہ پہنچ کر ان کی دیکھ بھال کرو جو ابھی نو عمر ہیں اور جن سے امیدیں وابستہ ہیں۔ بوڑھوں یا قریب مرگ لوگوں کے مقابلے میں ان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ ———"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو بولا ——— "ہمیشہ پھرتیلے رہنا ایک تدبیر بتاؤں ——— جو وردی آج کل پہنتے ہو ایک جوڑا محفوظ کر لو۔ ہر سال پہلی جنوری کو پہن کر دیکھنا، جب تک یہ فٹ آتی رہی تم بھی فٹ رہو گے۔"

منصور سٹیشن پر چھوڑنے آیا لیکن کچھ افسردہ سا تھا۔ پچھلے تبادلے پر اس نے کچھ اور طرح کی باتیں کی تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ کبھی اس علاقے سے گزرا تو ضرور آ کر ملوں گا۔"

"اب تم دور چلے جاؤ گے، بس بے جان خطوط رہ جائیں گے، تم نظر

نہیں آؤ گے، نئی نئی جگہوں میں نئے نئے دوست بنیں گے اور دجلے کے کنارے گزارے ہوئے دن تمہیں یاد بھی نہ رہیں گے۔ پھر خط و کتابت بھی سست ہوتی جائے گی۔ خطوط بے جان ہو جائیں گے —"

سعدہ آتی ہوئی دکھائی دی۔

منصور نے جلدی سے کہا — "تم ناتجربہ کار ہو، ایسے لمحات بڑے کٹھن ہوتے ہیں کچھ دیر کے لئے اپنا دل پتھر کا بنا لو۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوگا اور کون کہاں جائے گا — ہمت سے کام لو۔"

اور میں نے منصور کو بڑی حیرت سے دیکھا کہ جو سعدہ کے لئے ایسے فقرے کہہ رہا تھا۔

سعدہ نے سلام کیا۔ ایک ڈبہ دیا جس میں کھجوریں تھیں۔

"پھر کب آؤ گے؟ اس کے ہونٹ ہلے، تل اور بھی نمایاں ہو گیا۔

"پتہ نہیں — شاید اب موقع نہ ملے —"

"کیوں —؟"

"اس لئے کہ وطن دور ہے —"

"تم وطن تو نہیں جا رہے، واپس آؤ گے نا؟"

بلبل نے منصور کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوگا اور کون کہاں جائے گا —" میں نے منصور کا فقرہ دوہرایا۔

"لیکن تم تو کہا کرتے تھے کہ جدائی کا اثر مختلف طبیعتوں پر جدا جدا ہوتا ہے

وہی ہوا کے جھونکے جو ذرا ذرا سے چراغوں کو بجھاتے ہیں تیز آگ کے شعلوں کو اور بھی بھڑکاتے ہیں ـــــ"

"ہاں یہ کسی مفکر کا فقرہ ہے ـــــ"

"وہ چھوٹا وعدہ بھی نہیں کروگے ؟ یاد ہے وہ گیت ؟؟"

گاڑی جلدی

کئی برس کے بعد اتفاق پھر مجھے دجلے کے کنارے لے آیا لیکن اس بار میں سیاح کی حیثیت سے آیا تھا اور فقط گنے گنائے دنوں کا قیام تھا سیدھا کیمپ پہنچا، صرف چند آدمی ملے۔ باقی کے سب جا چکے تھے۔ سڑک پر گرد اڑتی تو فوجی لاریوں کی جگہ خوبصورت بھڑکیلی کاریں نظر آتیں۔

بغداد کے دجلے میں روشنیاں اسی طرح جھلملاتیں کناروں سے موسیقی کی تانیں بلند ہوتیں لیکن وہ چہل پہل رخصت ہو چکی تھی۔ شور و غل تھا لیکن قہقہے فقط کہیں کہیں سنائی دیتے تھے۔

مجھے اپنا وعدہ یاد تھا، کیمپ سے شمال کا رُخ کیا اور منصور کے گاؤں پہنچا۔

"دوست مجھے افسوس ہے کہ زیادہ چھٹی نہیں مل سکی۔ کل واپس جانا ہوگا ـــــ" میں نے معذرت کی۔

"ملاقات ایک لمحے کی بھی اچھی ہوتی ہے ـــــ" وہ بہت خوش تھا بار بار شکریہ ادا کرتا۔

اس کے چہرے پر تفکرات نے لکیریں کھینچ دی تھیں، کنپٹیوں کے بال

سفید ہو چکے تھے۔ پہلے تو مہمان نوازی میں اِدھر اُدھر بھاگتا رہا۔ پھر اس کے ساتھ ایک بچہ اور بچی آ گئے۔

"میرے بچے ہیں ——"

"اور سعدہ کہاں ہے ؟"

"پتہ نہیں کہاں ہے۔ شاید بغداد میں ہو، کیوں ——؟" اُسے بڑا تعجب ہُوا۔ منصور اور سعدہ کے متعلق میرا قیاس بالکل غلط نکلا۔

پرانے دنوں کی طرح سہ پہر کو ہم لمبی سیر پر نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد اور بیوی کا انتقال ہو چکا ہے "جس روز والد صاحب سدھارے اسی دن منصور کا لڑکپن بھی ساتھ ہی رخصت ہو گیا —— شاید اس لئے کہ میرے سر سے سایہ اٹھ جانے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اپنی باری ہے۔ وہ میرے نہایت عزیز اور گہرے دوست بھی تھے۔ تنہائی سے ڈر کر رفاقت چاہی اور شادی کی۔ پھر دو بچے چھوڑ کر وہ بھی چلی گئیں ——"

میرے اظہار افسوس پر مسکرا کر بولا —— "اور تو اور وہ سب بچ لانیاں بھی چلی گئیں ——"

کئی بار جی چاہا کہ مرحومہ کے متعلق پوچھوں کون تھی ؟ کیا ہُوا تھا ؟ لیکن الفاظ ہونٹوں پر آ کر رک جاتے۔

"کبھی کبھی مجھے اپنی زیادتیاں یاد آتی ہیں جو ان لوگوں سے کیں جو مجھ سے محبت اور شفقت کی توقع رکھتے تھے —— لیکن تب محسوس تک نہ ہوتا تھا کہ یہ زیادتیاں ہیں ——"

"یاد ہے بوڑھا برٹن نوعمروں کی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا کرتا تھا——"
میں نے یاد دلایا۔

"میرے خیال میں یہ تجربے کی کمی نہیں احساسات کی کمی تھی —— حال ہی میں میں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی اُسے گرم کپڑا دیا تو عجز سے بولی نہیں مجھے کوئی سستا سا چیتھڑا یا ٹاٹ دے دو۔ میرے اصرار پر کہنے لگی گرم کپڑے تو خوش نصیب پہنتے ہیں میرے لئے ٹاٹ ہی بہت ہے میں تھرا اٹھا پہلے بھی ضرورت مندوں کو دیکھا تھا بلکہ انہیں دیکھے بغیر قریب سے گزرا تھا لیکن اب کسی ضعیف محتاج کو دیکھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں اس میں اور مجھ میں کوئی فرق بھی تو نہیں اور اچھے دن بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ شکار کا شوق بھی نہیں رہا کبوتروں کا شکار یاد آتا ہے، میں گولی چلاتا۔ جو چھرّوں سے بچ جاتے وہ اپنے زخمی اور مردہ ساتھیوں کے اوپر منڈلانے لگتے۔ اور اگلی گولی کی زد میں آ جاتے۔ کبھی کبھی بے شمار آنکھیں سامنے آ جاتی ہیں۔ ہرنوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں جن سے آنسو نکل رہے تھے۔ پرندوں کی متحیّر آنکھیں، جانوروں کی وحشت زدہ آنکھیں، کچھ ایسی جیسے معصوم بچوں کی آنکھیں ہوں اور پوچھتی ہوں کہ میں نے کیا قصور کیا تھا؟ —— قطار در قطار یہ آنکھیں سامنے سے گزر جاتی ہیں——"

ہم پتھر پر بیٹھ کر غروبِ آفتاب دیکھنے لگے۔

شاید اس نے میرا تجسس بھانپ لیا تھا—— "تم بالکل نہیں

بدلے۔ آج تک تم نے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی جس کے بتانے میں مجھے عذر ہو لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لوں لیکن میں اس مخلص اور وفادار رفیق کو کیسے بھلا دوں جس نے ہمیشہ میرے جھوٹ کو بھی سچ مانا، میری ضد، لاپروائی اور تلخ رویے کو ادائے دلبرانہ سمجھا جس کی نگاہوں میں مجھ سا کوئی اور زمانے بھر میں نہیں تھا۔ اس کی علالت طویل ہوتی گئی۔ میں کچھ دیر پاس بیٹھتا تو کہتی جاؤ کسی سے مل آؤ، کہیں سیر کر آؤ۔ مرنے سے دو روز پہلے اس نے میرے سارے کپڑے تہ کر کے رکھوائے۔ ملازم کو تاکید کی کہ بغیر ناشتے کے مجھے کبھی باہر نہ جانے دے۔ پھر مجھ سے درخواست کی کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دوں ـــــ مجھے یقین سا ہو جاتا ہے کہ وہ ان دونوں بچوں میں زندہ ہے۔“

میں نے بیماری کے متعلق پوچھا

”ان دیہات میں طبیب بہت کم ہیں۔ عطائی مریض کی خوش فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خوش فہمی کی یہ حد ہے کہ غلط علاج سے موت آجائے تب بھی عزیز و اقارب عطائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے تو پوری کوشش کی تھی۔ تقدیر میں یونہی لکھا تھا تب ہی میں ان دنوں اپنے بچوں کے متعلق سوچا کرتا ہوں کہ جہاں انہیں تعلیم دینی ہے وہاں انہیں تندرست بھی رکھنا ہے۔ کہیں اپنی مرضی کے خلاف میدانوں میں نہ جانا پڑے ـــــ“

پھر اس نے مجھ سے محاذ کے دوسرے تجربے کے بارے میں پوچھا۔

”پہلے تجربے سے ملتا جلتا تھا ـــــ“

”اب تم ملک بھر آئے ہو ـــــ جشنوں میں حصہ لیتے ہو گے؟

"نہیں ——"

"موہن کو بھی یہی شکایت تھی کہ تم اپنی رائے چھپا جاتے ہو ——"

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے دنیا زیادہ دیکھی تھی لیکن زندگی کی بھٹی اُسے کندن بنا رہی تھی۔ میرا ہم سفر مجھ سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

"کبھی ضرور بتاؤں گا —— وعدہ رہا" میں نے کہا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ آسمان شفق سے جگمگانے لگا۔

"زندگی کے رنج و الم کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ اگر دن کے اختتام پر اداس پیلے بھورے مٹیالے بادل نہ ہوں تو غروبِ آفتاب رنگین کیونکر ہو گا ——"

صبح مجھے رخصت کرتے وقت اس نے دور میدانوں کی طرف اشارہ کیا —— "شاید میں ان پُر شور آبادیوں میں جا بسوں اور کچھ عرصے کے بعد ان لوگوں جیسا ہو جاؤں —— تب ملے تو شاید تم منصور کو پہچان نہ سکو گے ——"

میں روانہ ہوا تو آسمان میلا سا تھا جیسے آئینے پر کئی روز کی گرد جمع ہو۔ دھندلاہٹ بڑھتی گئی۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں تو زرد دھند چھا گئی اور سہ پہر میں تبدیل ہو گئی۔

"آندھی آنے والی ہے ——" ڈرائیور بولا۔

دیکھتے دیکھتے سب کچھ تاریک ہو گیا۔ موٹر کی روشنی فقط پانچ فٹ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ہم سڑک پر آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ پھر دم گھٹنے لگا۔

"باد سموم معلوم ہوتی ہے ___" ڈرائیور نے بتایا۔ موٹر روک کر ہم نے منہ سر لپیٹ لیا۔ تیز جھکڑوں کے ساتھ ساتھ، جھاڑیاں، گھاس پھونس، کنکریاں نہ جانے کیا کیا اڑا جا رہا تھا۔ اتنی تیز ہوا کے باوجود سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

جب آندھی کی شدت ختم ہوئی تو ہم روانہ ہوئے لیکن تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ راستہ بھول گئے ہیں۔ سڑک پہلے ہی اٹ چکی تھی۔ ہم صحرا میں اندھا دھند چکر لگا رہے تھے۔ گھڑی دیکھی تو نو بجے تھے، اس وقت ہمیں کیمپ میں ہونا چاہیئے تھا۔ پھر ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاید ہمارا رخ پہاڑیوں کی طرف بدل چکا تھا سوچا کہ اب کہیں ٹھہرنا چاہیئے۔

دور ایک روشنی نظر آئی۔ قریب پہنچے تو دو لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں جن کے شیشے ہماری موٹر کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں۔ کواڑ کھلے اور ایک گول مٹول چہرہ نظر آیا، جلتی ہوئی موم بتی ہوا سے بجھ گئی۔ اسے دوبارہ روشن کیا گیا تو چند اور چہرے دکھائی دیئے ___ جس نے دروازہ کھولا تھا وہ اور اس کے دو ساتھی قالین پہ بوتلیں تھامے بیٹھے تھے۔

وہ تینوں تقریباً ایک سے تھے، پھولے ہوئے جسم، موٹے موٹے نقش، چہروں سے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔

ڈرائیور نے مجھے تھرماس اور تھیلا تھما دیا اور خود موٹر میں جا بیٹھا۔

باہر آندھی پھر شروع ہو چکی تھی۔ جھونکے تیز ہوتے تو ان کی باتیں ہوا کی سیٹیوں اور چیخوں میں گم ہو جاتیں ___ اس عجیب سے ماحول میں وہ غول

بیابانی معلوم ہو رہے تھے۔

انہوں نے بہت سارا کھانا نکالا۔ میری طرف بھی دیکھا لیکن میں نے سر ہلایا اور تھرماس کھول دی۔

تقریباً دو گھنٹے تک وہ بے تحاشہ کھاتے رہے۔ پھر نئی بوتلیں کھول کر باتیں شروع کر دیں۔ وہ بڑی جلدی جلدی بولتے اور بار بار قہقہے لگاتے۔ کچھ آندھی کا شور کچھ ان کا ——— ان کی گفتگو اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

ان میں سے ایک جو اپنے بھتیجے کا واحد نگراں تھا بتا رہا تھا کہ لڑکے کا لاکھوں کا بیمہ کرا چکا ہے اسے دانستہ طور پر خطرناک کام دیئے جاتے ہیں۔ پرخطر جگہوں پر بھیجا جاتا ہے لیکن ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد مجبوراً لڑکے سے وہی سلوک کرنا پڑے گا جو اس کے دو بھائیوں سے پہلے کیا جا چکا ہے ——— یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

دوسرے نے یتیم خانوں اور ایسے دیگر منافع بخش اداروں کا ذکر چھیڑا۔ دولت اور شہرت کے سلسلے میں امیر عورتوں اور بیواؤں کو ورغلانے کے قصے سنائے۔ جعلی دستخطوں، جعلی دوستیوں، جعلی شادیوں اور دیگر چالوں کی تفصیل مزے لے لے کر بیان کی۔

میں تھکا ہوا تھا دیوار کے سہارے اونگھنے لگا۔

پھر جیسے خراٹوں نے چونکا دیا۔ آندھی کا شور ختم ہو چکا تھا ——— دروازہ کھولا تو چاندنی اندر آ گئی۔ باہر سب کچھ ساکن تھا۔ آسمان میں چاند چمک رہا تھا۔

چاندنی میں وہ تینوں دکھائی دیئے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ سانس لیتے تو توندیں پھول جاتیں۔ سانس باہر نکلتا تو بڑی بھیانک آواز آتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تین مردہ جسم شدید عذاب میں مبتلا ہوں۔

باہر نکل کر دیکھا تو دُور دُور تک قبریں ہی قبریں تھیں۔ آندھی سے بچ کر جہاں پناہ لی تھی وہ اس قبرستان کی کوٹھڑی تھی۔ دفعتاً آنکھوں کے سامنے محاذ کا ایک نظارہ کوند گیا۔ محاذ پر ایک قبرستان بم باری کی زد میں آگیا۔ دھماکوں کے ساتھ قبریں کھل گئیں۔ مُردے دُور دُور جا پڑے۔ کچھ دیر کے بعد جگہ جگہ لاشیں نظر آنے لگیں۔ کچھ ان سپاہیوں کی تھیں جو ابھی ابھی مرے تھے کچھ برسوں پرانی تھیں۔ نئی، پرانی لاشیں، زخمی اور بے ہوش سب آپس میں اُلجھے ہوئے پڑے تھے۔

موت کیسے کیسے رُوپ بدل کر آتی ہے۔ کبھی پہلے بیماری بھیج کر جسم کو اچھی طرح مجسم کر لیتی ہے، کبھی بے خبری میں آن دبوچتی ہے، کبھی ایذائیں دے کر ترسا ترسا کر جان لیتی ہے۔

لیکن سب سے ذلیل موت وہ ہے جو زندہ جسم میں یوں حلول کر جاتی ہے کہ سانس آتا رہتا ہے حواس درست رہتے ہیں لیکن دل و دماغ مر جاتے ہیں، ضمیر مر جاتا ہے —— انسانیت مر جاتی ہے۔

قبرستان کی یہ زندہ لاشیں بھی طبعی موت سے پہلے مر چکی تھیں۔

دُور اُفق پر رو پہلی لکیر کھینچی ہوئی تھی —— یہ دجلہ تھا۔

میں اس سمت میں چلتا گیا حتیٰ کہ کنارہ آگیا۔ دریا کی شفاف سطح پر تاروں کا عکس جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پانی یوں ساکن تھا جیسے لہروں اور گرداب سے

ناآشنا ہو۔ ہلکی ہلکی دھند اُٹھ رہی تھی۔ دوسرا کنارہ اوجھل ہو گیا۔ چاند بے نور ہو کر چھپنے لگا۔ نظارہ سمٹتے سمٹتے محدود ہو گیا۔ اور میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہ گیا۔

مشرق سے روشنی پھیل رہی تھی۔ خنک ہوا کے جھونکے آئے، طیور چہچہانے لگے ——— تخلیق تو روشنی، زندگی رنگ و لبو اور لطافتیں لے کر آئی تھی، انسان سے ہمدردی، پاکیزگی اور حسن و نفاست کی توقعات تھیں دریا خشک، ویرانوں کو سیراب کرنے کے لئے بہائے گئے تھے ——— پھر کیا ہوا کہ صدیوں سے ان کا پانی کبھی انسان کے خون سے سُرخ ہوا ہے کبھی کتابوں کی سیاہی سے گدلا ہوا ہے ——— اور ان کے کناروں نے ہریالی کی جگہ مایوس کن نظارے دیکھے ہیں۔

میں واپس پہنچا تو لمبی لمبی کاریں جا چکی تھیں۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ ایک طرف چبائی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں دوسری طرف خالی بوتلیں ——— ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔

بغداد میں سعدہ سے ملنے اس کے گھر گیا۔ سعدہ نے معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے، ننگے پاؤں، میک اپ کے بغیر، اس حلیے میں وہ چھوٹی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"سکول سے آئی ہو؟ تمہارا بستہ کہاں ہے؟؟"

وہ ہنسنے لگی ——— "میں تو اسی طرح رہتی ہوں۔ آرائش سے مجھے نفرت ہے۔"

ان دنوں پارٹیوں دعوتوں کے لئے مجبوراً بننا سنورنا پڑتا تھا ——"

میں نے منصور کا ذکر کیا۔

"وہ بھی چلا گیا —— دوسرے بھی چلے گئے ——"

"لیکن میں تو سمجھتا تھا کہ منصور اور تم ——"

"منصور سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا ——"

پرانے ساتھیوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتلایا کہ برٹن نے گریس سے شادی کر لی تھی جو اسے زبردستی اپنے ساتھ آسٹریلیا لے گئی۔ جب برٹن تندرست ہو کر ہسپتال سے نکلا تو اسے خود بھی علم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے مگر مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔ اس کا جوان بھتیجا قاہرہ سے تقریب میں شرکت کرنے آیا تو کئیوں نے مغالطے میں اسی کو دلہا سمجھا۔ موہن اپنے لکھ پتی خسر کے انتقال پر چھٹی لے کر ہندوستان گیا۔ واپس آیا تو اور بھی زیادہ غمگین تھا۔ خسر اتنا مقروض تھا کہ ساری دولت ادائیگی میں ختم ہو گئی۔ موہن کو امید تھی کہ بیوی کے سر سے امارت کا بھوت اتر چکا ہوگا، لیکن مفلس ہو جانے پر بھی بیوی کا رویہ وہی تھا۔ جو جیس بڑے مزے میں ہے کہیں جا رہا تھا کہ موٹر الٹ گئی۔ اتفاق سے جس نے ترس کھا کر تیمارداری کی وہ بڑے مالدار شخص کی اکلوتی بیٹی نکلی۔ ترس دوستی میں تبدیل ہوا اور دوستی محبت میں۔ آخر لڑکی کے باپ نے جو جیس کو بیٹا بنا کر دولت اور بیٹی اس کے حوالے کر دی۔ اب وہ دوستوں اور جاننے والوں کو خوب قرض دیتا ہے۔ چند مہینے ہوئے ملا تھا، بار بار پوچھتا کہ قرض لوگے۔ ان دنوں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے یورپ گیا ہوا ہے۔ روز

نے ولایت پہنچ کر بزنس شروع کی تھی۔ بڑے بڑے فارمولے لگائے۔ ساری ریاضی صرف کر دی لیکن کچھ نہ ہُوا اور اکثر جواب غلط نکلے، آخر بزنس چھوڑنی پڑی، اب کسی سکول میں حساب پڑھاتا ہے۔ جرجیس نے بتایا کہ روڈ اس قدر مذہبی ہو گیا ہے کہ سارے محلے والوں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے، اس نے جرجیس سے تمہارا اور روزی کا خاص طور پر سے ذکر کیا تھا، کہ وہ ملیں تو کہنا کہ اب میں بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ خالق نے جس صنّاعی سے انسانی جسم بنایا ہے اس کی تعریف ڈاکٹر زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور یہ کہ جس ہنر مندی سے کائنات اور نظامِ شمسی کو ترتیب دیا گیا ہے یہ کسی عظیم ریاضی داں کا کام ہی ہو سکتا ہے ——"

"اور سلیم ——؟"

"سلیم لکھ پتی ہے اور پہلے سے کہیں فربہ ——"

"اور تم ——"

"سلیم اور دوسرے اکثر مجھ سے جذباتی قسم کی باتیں کیا کرتے لیکن میں جانتی تھی کہ ان جذبات کی تہہ میں تنہائی کار فرما ہے یا شراب کا نشہ۔ تم بتاؤ تمہارے ہونٹوں سے کبھی ایک لفظ بھی نہ نکلا؟"

"نہ تنہا تھا، نہ نشے کی ضرورت محسوس ہوئی ——"

"کون ہے جس نے تمہاری قوتِ گویائی سلب کر رکھی ہے؟"

"کوئی بھی نہیں —— سچ مچ ——!"

"اب بھی کچھ سوچ رہے ہو —— کچھ تو کہو ——"

"سوچ رہا ہوں کہ کبھی مشاہدے میں غلطی ہو جاتی ہے، کبھی فکر و عمل

میں مطابقت نہیں رہتی، تو کبھی نظریئے بھٹکنے لگتے ہیں ——"

دیر تک خاموشی رہی پھر سلیم کا ذکر آگیا —— وہ افسردہ آواز میں بولی

"جس سے واقفیت رہ چکی ہو اُسے کیا بُرا بھلا کہنا۔ میں نے تو اوروں کے خلاف بھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ بس اندھیرے میں کبھی کبھی جگنو سے چمکتے تھے چنگاریاں بھڑکتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں ——"

اگلے روز مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آئی ——

"یاد ہے یہی پلیٹ فارم تھا۔ یہی وقت تھا۔ تب تم نے جھوٹا وعدہ تک نہ کیا اب تو تم وطن جا رہے ہو ——"

ٹرین چلنے لگی۔

"میں تمہیں بصرے سے خط لکھوں گا ——"

"سب یہی کہتے تھے۔ کسی نے دجلے کے کناروں سے خط نہ لکھا بصرے سے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے ——"

بصرے میں دکان سے کئی کارڈ لئے جن پر دجلے کی رنگین تصویر تھی ان پر پرانے ساتھیوں کے پتے لکھے، ٹکٹ لگائے —— سوچنے لگا اور کیا لکھوں، کئی فقرے ذہن میں آئے لیکن قلم ساکن رہا۔ سٹیمر کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ آخر حکیم بقراط کا وہ مقولہ یاد آگیا ——

"زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود۔ مواقع تیزی سے گزرے جا رہے ہیں۔ تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ——"

قرۃ العین حیدر

چلائے کا باغ

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ شمشیر نگر کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی - میں نے لکھنا ملتوی کر کے اسکرپٹ کے دو پہلے ڈرافٹ کے کاغذات بیگ میں ٹھونسے اور پلیٹ فارم پر اتری - شام ہو رہی تھی - اور اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا - اسٹیشن سنسان پڑا تھا - سب ڈویژنل آفیسر کو ڈھاکے سے تار دینے کے باوجود وہاں کوئی موجود نہ تھا - کیونکہ بنگال کے باسی وقت کے متعلق ایک نہایت فلسفیانہ نظریہ رکھتے ہیں - میں نے چاروں طرف دیکھا ایک ویو ہیکل امریکن اور چیت پتلون میں ملبوس سنہرے بالوں والی اس کی میم ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم کے پھاٹک کی طرف جا رہے تھے جس سے ذرا فاصلے پر چند جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں - قلی نے میرا سامان اٹھایا اور میں نے سوچا کہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر سے ایس - ڈی - او کو فون کرنے کی کوشش کروں - حالانکہ مجھے مقامی ٹیلی فون سسٹم کا بھی خاصہ تجربہ تھا -

"السلام علیکم" ایک گرجدار آواز آئی - میں نے پلٹ کر دیکھا - سیاہ شیروانی اور شرعی پاجامے میں ملبوس ایک باریش بزرگ خوش خلقی سے کھڑے مسکرا رہے تھے -

شاید یہی سب ڈویژنل آفیسر تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آپ ——؟" انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"جی ——"

"بڑی خوشی ہوئی، بڑی خوشی ہوئی، مجھے اُردو ادب سے اب دلچسپی نہیں رہی کہ وہ روز بروز مزید غیر اسلامی ہوتا جارہا ہے۔ مگر میری اہلیہ آپ کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔"

"جی ——" میں جھینپ کر انکسار کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی۔

"خاکسار کو بیگ کہتے ہیں۔"

"میں یہاں ٹی ریسرچ پر لگا ہوا ہوں۔ آیئے آیئے۔ میرے ہمراہ تشریف لے چلئے۔ میں ایک عزیز کو لینے آیا تھا۔"

میں نے ان کو بتایا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ان کے عزیز (وہ بھی بار لیش تھے) سامان اٹھوا کر نزدیک آئے۔ جیپ میں اسباب رکھا گیا اور اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتے ہم لوگ سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔ امریکن کی جیپ دھول اڑاتی آگے آگے جا رہی تھی۔ دھول سے بچنے کے لئے میں سلولائیڈ کے پردے سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد گاڑی چلاتے چلاتے انہوں نے دفعتہً مڑ کر مجھے مخاطب کیا۔ "عزیزہ —— اسلامی ناول لکھیئے۔ ملت کی کشتی۔" گیئر بدلتے ہوئے انہوں نے کہا:-

"ڈانواں ڈول ہے۔"

"جی ــــــ"

"معاف کیجئے گا۔ ڈاک بنگلہ جنگل کے عین وسط میں ہے۔ اور آج بالکل خالی پڑا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ــــــ" میں نے رسان سے جواب دیا۔ "میں مشرقی پاکستان کے دُور افتادہ ڈاک بنگلوں میں رہنے کی عادی ہوں۔"
بارلیش بزرگ (وہ بزرگ قطعی نہیں تھے) سینتالیس اڑتالیس سال کے رہے ہوں گے۔ مگر ایک نہایت رعب دار سیاہ داڑھی اور بھاری بھرکم جُثے نے شانِ بزرگی عطا کر رکھی تھی۔ میرے متعلق بہت خلوص کے ساتھ فکرمند نظر آ رہے تھے۔ میرے اس طرح تن تنہا اور بے پردہ جنگل جنگل گھومنے سے ان کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ میں نے سوچا اور فوراً سر ڈھانپ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کلمہ جانتی ہیں ــ" انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"جی ــ"

"پانچوں کلمے ــ"

"جی ــ"

"تعلیمات قرآنی پر عمل پیرا ہیں ــــــ؟" پھر اسی اچانک پن سے وہ اپنے رشتہ دار کی طرف مڑے "میں کہتا ہوں۔ نوجوانو۔ اسلام کی خاطر انجن بن جاؤ ــــ انجن بن جاؤ ــــ" لفظ "انجن" انہوں نے تقریباً گرج کر ادا کیا۔ رشتے دار نے سر ہلایا۔
جیپ ڈاک بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی "رات کا کھانا غریب

غسلخانے پر تنزل فرمائیے۔ میں اور میری اہلیہ گھنٹے بھر میں آن کر آپ کو لے جائیں گے۔" باریش بزرگ نے مجھ سے کہا۔

چوکیدار لپکا ہوا آیا۔

"کہو نورالعباد۔ کیسے ہو۔" میں نے خوش ہو کر اس سے پوچھا چھدری داڑھی اور نیلی تہمد والے نورالعباد کی باچھیں کھل گئیں۔ باریش بزرگ نے خدا حافظ کہا اور جیپ زناٹے سے باہر نکل گئی۔ نورالعباد نے ایک کمرہ کھول کر لالٹین میز پر رکھدی۔

"تم کو یاد ہے نورالعباد۔ ہم چار سال ہوئے یہاں آئے تھے۔"

"خوب یاد ہے مس صاحب۔ آپ لوگ ادھر مانی پوری ناچ کی فلم بنانے آیا تھا۔ شوٹنگ کرتا تھا۔"

"تمہارے بیوی بچے راضی خوشی ہیں نورالعباد ———"

"اب چار ٹھو لڑکا اور ہو گیا ہے۔ مس صاحب ———"

"اب کتنے بچے ہیں تمہارے ———؟"

"اب سب ملا کر نو ٹھو لڑکا ہے۔ مس صاحب۔" اس نے خوشی سے جواب دیا۔ "میں چاء لاتا ہوں۔"

مانوس کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لوہے کا پلنگ مچھری، مدھم آئینے والی سنگھار میز، خاکی مچھردانی غسلخانے کی بالٹی اور ٹب میں تازہ پانی بھرا تھا۔ اور نام چینی کا جگ اور پیالی کھردری سفید میز پر سلیقے سے دھری تھی۔ کھڑکیوں کے نیچے اونچی اونچی

گھاس لہرا رہی تھی۔ دور باورچی خانے میں لالٹین ٹمٹماتی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر میں شاگرد پیشے کی طرف گئی۔ نورالعباد کی سانولی سلونی بیوی بغیر بلاؤز کے اودی ساری لپیٹے دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس کی بوڑھی ساس فرش پر بیٹھی نواں پوتا کھلا رہی تھی۔ میں ان دونوں سے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں باتیں کرتی رہی۔ نورالعباد نے باورچی خانے کے دروازے میں سے جھانک کر آواز دی ــــــ "مس صاحب چاء تیار ہے۔" میں نے کمرے میں آکر چارپائی اور لالٹین کی روشنی میں سے دھول جھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر ہارن بجا۔ باریش بزرگ اور ان کی اہلیہ آچکے تھے۔

ٹی ریلیز ریسرچ اسٹیشن کے سیمنٹ کے نئے وضع کے چھوٹے چھوٹے بنگلوں میں سے ایک کے سامنے باریش بزرگ نے کار روک لی (اس وقت وہ اپنی سیاہ رنگ کی اسٹوڈی بیکر میں آئے تھے) برآمدے میں داخل ہو کر لیٹر بکس پر لکھے ہوئے ان کے پورے نام پر نظر پڑی۔ ایم۔ ایس۔ اسے علیگ اس کے ساتھ سائنس کی متعدد ڈگریاں وابستہ تھیں۔ ان کی اہلیہ مشرقی یو۔ پی کی ایک شرمیلی، کم عمر گھریلو لڑکی تھی۔ جس نے کاسنی چھینٹ کے غرارے اور دوسری کی چھپی قمیض پر ململ کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا نام کلثوم تھا۔ ڈرائنگ روم میں بہت سے مہمان جمع تھے۔ جنہوں نے باریش بزرگ کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"آہا ہا ـ مرزا صاحب آگئے ــــــ" مہمانوں میں دو ترک بھی

شامل تھے۔ جو چائے کی کاشت کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے انقرہ سے آئے تھے۔ کھانے سے پہلے میں نے اپنی کزن زرینہ کو ہیری نگمہ ٹی اسٹیٹ فون کرنا چاہا۔ مگر فون خراب ہو چکا تھا۔

"چلئے ہم لوگ کلب چلتے ہیں۔ وہاں آج فلم شو ہے۔ اس لئے یقیناً آپ کی ہمشیرہ بھی آئیں گی" بارِیش بزرگ نے کہا

"کلب کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں۔ کوئی پچیس میل ہوگا۔"

"پچیس میل۔۔؟" نووارد رشتے دار نے دہرایا۔

"چار بگان کے فاصلے اسی نوع کے ہیں برادر۔ سلہٹ میں ایک سے بیس باغات ہیں اور جب ہم لوگ دوستوں سے ملنے کی غرض سے نکلتے ہیں تو سو پچاس میل کا ہلا مار کر آتے ہیں۔ آپ کے برادر نسبتی کی ٹی اسٹیٹ"۔ بارِیش بزرگ نے اب مجھے مخاطب کیا ——" یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے ——"

کھانے کے بعد موٹریں اور جیپ گاڑیاں کلب روانہ ہوئیں۔ بارِیش بزرگ کی اہلیہ نے بچے کو سلا کر جلدی سے سیاہ برقعہ اوڑھا اور کار کی پچھلی سیٹ پر میرے پاس آن بیٹھی —— "میں پکچر دیکھنے کے لئے کبھی کبھار ہی کلب جاتی ہوں۔ ان کو یہاں کی سوشل کی زندگی پسند نہیں"

"شاید آگے زرینہ کلب میں مل جائے۔ ورنہ بڑی کوفت ہوگی ——"

میں نے کہا —— "میں تو ارسلان بھائی کو پہچانتی بھی نہیں ——"

"آپ اپنے برادرِ نسبتی سے آج تک نہیں ملیں ——؟" باریش بزرگ نے پوچھا

"جی نہیں ——"

"آپ کے برادرِ نسبتی کلکتے کے بنگالی ہونے کے ناتے معقول اردو بولتے ہیں اور بہت صالح مسلمان ہیں ——" باریش بزرگ نے مجھے مطلع کیا اور کار چلانے میں مصروف رہے۔

کلب کے احاطہ میں ان گنت موٹریں کھڑی تھیں، ہفتہ وار فلم شو کی وجہ سے دور دور کے باغات سے لوگ آئے تھے۔ قدیم برطانوی عہد میں بنی ہوئی عمارت کے اندر چاء بگان کی "اعلیٰ سوسائٹی" جمع ہو رہی تھی۔ میکانٹش ٹی پلانٹرز، قریبی اضلاع کے نئے کارخانوں کے چند امریکن اور جرمن، فینچوگنج کے نئے کھاد کے کارخانے کے جاپانی انجینئر اور ان کی خواتین، چائے کے باغات کے نوجوان پاکستانی عہدیدار اور ان کی الٹرا ماڈرن بیگمات۔ باغات میں عموماً ملک کے اونچے طبقے کے نوجوان کام کرتے تھے۔ کیونکہ ایک بے حد فیشن ایبل اور انتہائی "ہائی کلاس" ملازمت تھی۔ یہ سب زیادہ تر مغربی پاکستان سے آئے تھے۔

مس کلثوم کے ساتھ میں پرے کے ایک دبیز صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہال کی روشنیاں بجھیں اور ایک معمولی سا امریکن فلم شروع ہوا جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ سینکڑوں کا مجمع فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔

باہر گھپ اندھیرے میں سینکڑوں میل تک چاء بگان، جنگل

اور گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ پیچدار راستے، ندیاں اور ابدی سناٹا۔ نارنگی کی ڈالیوں کی موسیقی ریز سرسراہٹ۔ تاریکی اور وسعت اور تنہائی کے اس بھنور میں برطانوی انداز کے اس کلب کے اندر یہ تین چار سو افراد مخملیں، وبیز جہازی صوفوں دھنسے ڈورس ڈے کا تماشہ دیکھنے میں منہمک تھے۔ ان کا اس دھرتی سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ سوائے روپے کے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کوئی تعلق نہ تھا۔ اور انہی افراد کی طرح کے لوگ۔ صرف چند میل دور، سرحد کے اس پار، اسی معطّر دھرتی، اسی زرخیز مٹی پر، اسی سریلے اندھیرے میں آسام کے چار بگان میں اسی طرح برطانوی وضع کے کلبوں میں بیٹھے۔ اسی قسم کی فلم دیکھنے میں مصروف ہوں گے۔ یہی لب و لہجہ، یہی ذہنیتیں، یہی تراش خراش اور وضع قطع یہی اندازِ گفتگو۔ یہی دل پسند پیاں، وہاں بھی ویسی عہدیداروں کی بیویاں اسی قسم کی ساڑیاں پہنے اسی تازہ ترین وضع کے بال سنوارے ایسی ہی سطحی گفتگو میں مشغول ہوں گی۔ ان سب لوگوں کا اس قدیم دکھی، زخمی دھرتی سے کیا سمبندھ تھا ——؟ زمین کا رشتہ انسان سے کس طرح بندھتا ہے —— کس طرح ٹوٹتا ہے، کس طرح استوار کیا جاتا ہے؟

روشنیاں جلیں۔ کلثوم نے فوراً منہ پر سیاہ جارجٹ کی نقاب گرا دی۔ میں نے کھڑے ہو کر زرینہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور کلثوم بانہہ کے ساتھ ہال کے سرے پر آ گئی۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے میرا نام لے کر خوشی کا نعرہ بلند کیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میری پھوپھی زاد بہن زرینہ سبز ساڑی پہنے، کندن کے زیوروں میں جگ مگ کرتی، دلہن بنی کھڑی تھی۔ ہم دونوں دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے، اور خوشی کے مارے دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔

اس اثنا میں کلثوم مجمع میں کھو چکی تھی۔ میں اور زرینہ باتیں کرنے کے لئے جلدی سے پاؤڈر روم میں گھس گئے۔ جہاں چند غیر ملکی خواتین اپنی اپنی ناکوں پر پاؤڈر لگا رہی تھیں۔ ہم دونوں کو بے طرح شور مچاتے دیکھ کر ایک اسکاٹش بڑھیا نے مسکرا کر آنکھیں جھپکائیں۔

" مسز میک ڈونلڈ —— زرینہ نے جلدی جلدی کہا۔" یہ میری کزن ہے۔ ہم تقسیم کے بعد آج ملے ہیں۔" پھر اس نے پاؤڈر روم میں داخل ہونے والی مزید شناسا خواتین سے میرا تعارف کرانا شروع کیا۔

" زرینہ میں ذرا باہر جا کر اپنے میزبانوں کا شکریہ تو —"

" مسز عثمانی - یہ میری کزن —— کیونکہ میں تو صرف تین سال ہوئے لکھنؤ سے شادی کر کے —— شادی ہو کے —— یہاں آئی ہوں —— اس لیئے اب تک —— " اس نے ہڑبڑا کر پھر داستان شروع کی۔

" زرینہ میرے میزبان ——"

میں جلدی سے باہر نکلی اور ہال میں کلثوم سے ٹکرا گئی۔

" آپ کے دلہا بھائی ارسلان احمد صاحب آپ کو ڈھونڈتے پھر

رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ اتنے میں بارلیش بزرگ بھی ہجوم میں سے نمودار ہوئے۔ میں نے ان دونوں کا دلی شکریہ ادا کیا۔ اور وہ میاں بیوی ہال کے بڑے دروازے سے نکل کر کار پارک کی طرف چلے گئے۔

اب بیگمات اور خواتین کے انبوہ کلب کے کنٹین اسٹور کا رُخ کر رہے تھے۔ "چلو مجھے بھی تھوڑا سا سامان خریدنا ہے ——" زرینہ نے میرے قریب آکر کہا اور اپنے شوہر سے ملوایا۔ "یہ تمہارے ارسلان بھائی ہیں —— دیکھ لو ——"

اسٹور کے ایک کاؤنٹر کے پاس وہ سنہرے بالوں والی میم کھڑی تھی، جسے میں نے شام ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ بہت سے حضرات اس کے گرد جمع تھے۔ جن سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس کی گلیمرس شخصیت نے وہاں کافی تہلکہ مچا دیا تھا۔

"یہ عورت امریکن ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستانی —— میرا مطلب ہے پاکستانی ہے۔ شرط لگا لو ——" دُور سے اسے دیکھ کر زرینہ نے میرے کان میں کہا ——

"تم جانتی ہو اسے —— ؟"

"نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ شاید تم بھی واقف ہو۔" اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک نظر غور سے دیکھنے کے بعد میری کزن نے جواب دیا۔

"نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ شاید تم بھی واقف ہو۔" اس کے قریب

سے گزرتے ہوئے اسے ایک نظر غور سے دیکھنے کے بعد میری کزن نے جواب دیا۔

ارسلان بھائی نے قریب آکر کہا ـــــــ " زرینہ مسٹر اور مسز فریزر بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کی جیپ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لوگ کرنل مورگن کے یہاں ٹھہرے ہیں ـــــــ " ارسلان بھائی اسٹور سے باہر چلے گئے۔ زرینہ امریکن خاتون کے پاس مارچ کرتی ہوئی پہنچی۔ اور بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اردو میں پوچھا۔

" معاف کیجئے گا۔ آپ راحت کاشانی ہیں نا ـــــــ ؟ "

میم نے چونک کر اسے دیکھا، چند لحظوں تک دیکھتی رہی اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اردو نہیں جانتی۔

" اوہ ـــــــ کم آن راحت ـــــــ " زرینہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

" میرا نام ـــــــ " میم نے بڑے وقار سے ایسی انگریزی میں جس میں امریکن لہجے کا برائے نام شائبہ تھا، جواب دیا۔ " مسز چارلس فریزر ہے۔ ریٹا فریزر ـــــــ "

دوسرے لمحے چارلس فریزر نے اسے آواز دی ـــــــ اور وہ باہر چلی گئی۔

" اور تو اور ـــــــ یہ نام بھی بوگس ہے۔ شرط لگا لو ـــــــ " زرینہ نے کہا۔

ارسلان بھائی کار کا دروازہ کھولے ہمارے منتظر تھے۔ مسٹر اور

مسز فرزیرزان کے سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کار کلب سے نکل کر ٹی اسیٹٹ کی سمت روانہ ہوئی۔ ارسلان بھائی اور مسز فرزیرہ باتوں میں منہمک تھے۔

کچھ دیر بعد زرینہ نے شرلک ہومز کے سے خطرناک اور پُراسرار انداز میں ہونٹ لٹکا کر اور آگے جھک کے ذرا آہستہ سے کہا: "مگر کمال ہے۔ واقعی راحت تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی —— اور کیا عجیب حسنِ اتفاق ہے۔"

میم نے مطلق جواب نہ دیا۔ گو اب اس کا بشاشت بے تکلفی کا لہجہ غائب ہو چکا تھا۔ جس میں وہ اب تک ارسلان بھائی سے تبادلہ خیالات کر رہی تھی۔ — "ہم لوگ کینیڈا واپس جائیں گے۔ تو آپ کا یہ حسین ملک بہت یاد آئے گا۔ حالانکہ یہ میرے وطن امریکہ سے کس قدر مختلف ہے۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ امریکہ آج تک نہیں گئی ——" زرینہ نے بہت آہستہ سے مجھے گوش گزار کیا —— "مگر قسم خدا کی۔ واہ۔ واہ کیا قابلِ تعریف خود اعتمادی ہے۔ جواب نہیں ——"

ہم لوگ پوچھتے منزلِ مقصود پر پہنچے۔ وادی کے نشیب میں کرنل مورگن کے بنگلے پر امریکنوں کو اتار کر گھر کا رُخ کیا۔

زرینہ کا بے حد خوب صورت اور شاندار بنگلہ چائے کے باغات میں گھری ایک نیچی سی پہاڑی پر استادہ تھا۔ اس کا ماحول خالص انگریزی

تھا۔ کیونکہ ارسلان بھائی سے قبل اس ٹی اسٹیٹ کے منیجر ہمیشہ انگریز ہوتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور ڈرائنگ روم کے سرخ اینٹوں والے گہرے آتش دان میں آگ لہک رہی تھی۔ مختلف اقسام کے کتے ادھر ادھر محوِ خواب تھے جگمگاتے سرخ روغنی فرشوں والے جھل جھل کرتے کمروں میں بھیڑیوں کی افراط تھی۔ غسل خانوں کے چینی کے ٹبوں کے نیلے پانی پر ربر کی بطخیں تیر رہی تھیں۔ مسہریوں پر اصل لیس کے پلنگ پوش بچھے تھے۔

صبح کو برے سے برآمدے کے پھولوں سے گھرے کُنج میں بریکفاسٹ سرو کیا۔ دوپہر کے کھانے، شام کی چائے اور رات کے کھانے کے وقت۔ میز کی چادر، نیپکن، برتن اور اسٹرلنگ سلور کے چھری کانٹے ہر مرتبہ مختلف تھے۔ اب میں یہ توقع کر رہی تھی کہ ارسلان بھائی ڈنر سے پہلے ڈنر جیکٹ پہنیں گے۔ نرمینہ صبح کو برآمدے میں بیٹھ کر خواتین کے ساتھ ماہ جونگ کھیلتی تھی یا دوسری خواتین کے گھروں پر جاکر ماہ جونگ کی محفل منعقد کرتی تھی۔

"یا اللہ ــــــ نرمینہ ــــــ" میں نے بڑبڑا کر کہا۔

"کیوں ــــــ کیا ہوا ــــــ" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"دھار ہو گئی ــــــ"

"مت بھولو کہ تمہارے لڑکپن تک تمہارے گھر کا بھی تقریباً اسی قسم کا ماحول تھا ــــــ"

"ہاں ــــــ مگر اب زمانہ کتنا بدل گیا ہے ــــــ"

"کوئی نہیں بدلا ودلا ــــــ"

"تم کام کیوں نہیں کرتیں ــــــ؟"

"کیسا کام ــــــ؟"

"ارے اپنی ڈاکٹری اور کیا ــــــ"

"یار ــــــ" اس نے خانساماں کو لنچ کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ساری عمر فرض ہے کہ کولھو میں جتے رہیں۔ نا بھائی ــــــ اب ہم بہت دنوں کام وام نہیں کریں گے۔ ہم تو بس ماہ جونگ کھیلیں گے اور کلب کے چیریٹی بازار آرگنائیز کریں گے۔ ویسے اب میں ایک صحافی خاتون بن گئی ہوں ــــــ" اس نے ذرا شرما کر انکسار کے ساتھ اضافہ کیا۔

"واقعی ــــــ یہ تو بہت عمدہ بات ہے ــــــ" میں نے خوش ہو کر دریافت کیا ــــــ "مارننگ نیوز ــــــ؟ پاکستان ٹائمز ــــــ؟"

"نہیں ــــــ میں کراچی کے سوسائٹی ماہنامے "آئینہ" کے لئے سلہٹ ٹی گارڈنز کا خبر نامہ لکھتی ہوں کہ فلاں بیگم فلاں ڈنر میں نارنجی ساری پہنے بے حد چارمنگ لگ رہی تھیں۔ یو نو ــــــ ویٹ سورٹ آف تھنگ ــــــ"

"آہا ــــــ"

وہ کھوکھلی ہنسی ہنسی اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئی ــ "آل فاؤنڈ ــ زندگی آل فاؤنڈ ہونی چاہیئے ــ جیسی میری زندگی ہے ــــــ" پھر اس نے یک لخت بڑے ڈرامائی انداز میں کہا ــ میں ایک PARASITE خاتون ہوں ــــــ"

"آپ ایک بوگس خاتون ہیں ——" میں نے جواب دیا۔

یہ اتوار کا شگفتہ سہانا دن تھا۔ ہم بریک فاسٹ کے بعد سامنے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے ارسلان بھائی سے کہا تھا کہ میں ڈوکومنٹری کی تیاری کے سلسلے میں مزدوروں کے حالات جاننا چاہتی ہوں اور اب ایک نمائندہ گروہ کا انتظار کر رہی تھی۔

"لو تمہارے مزدور آگئے ——" دفعتاً زرینہ نے کہا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مخملیں گھاس پر سے گزرتا پوربی مزدوروں کا ایک گروہ بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اب تم شروع کرو اپنا انٹرویو ——" زرینہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ مزدوروں کے مکھیا نے سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈنڈوت اور پالاگن کیا، اس کے ساتھی زمین بوس ہو گئے۔ زرینہ نے متانت سے سر ذرا سا خم کر کے ان کی بندگی کا جواب دیا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھا کی۔ میری کزن زرینہ جو لکھنؤ میڈیکل کالج کے لفٹ ونگ گروپ کی جوشیلی لیڈر رہ چکی تھی۔

مزدور مرد اور عورتیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ذرا خائف سے نظر آ رہے تھے۔ ارسلان بھائی ڈریسنگ گاؤن پہنے اندر سے نمودار ہوئے اور بید کی کرسی کھینچ کر ان کے مقابل میں فروکش ہو گئے۔

"آہا —" میں نے ان کو چڑایا۔ "بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے ۱۹۳۲ء میں ضلع غازی پور کا انگریز کلکٹر اپنے دربار میں بیٹھا ہے ——"

"احمق ——" انہوں نے نیک دلی سے مسکرا کر کہا۔ "اب پوچھو ان

لوگوں سے کیا پوچھتا ہے ــــــ"

"تم لوگ ــــــ بارہ بنکی سے آئے ہوئے ہو ــــــ" میں نے پوچھا۔

"سینا پور سے بیگم صاحب ــــــ" مکھیا اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے تعجب اور پریشانی ہویدا تھی۔

"گھبراؤ نہیں رام نندن ــــــ تمہاری لکھا پڑھی نہیں ہوگی۔ یہ بیٹیا بڑی دور کراچی سے آئی ہیں۔ تم لوگوں کا سینا بنانے ــــــ" ارسلان بھائی نے کہا۔

"سلیما ــــــ" ایک نوجوان نے خوش ہو کر کہا۔

"پھوٹو کھینچنے ــــــ" عورتوں نے آپس میں سرگوشی کی۔

"تو کب آئے تم لوگ یہاں ــــــ" میں نے سوال کیا۔

"بہت جمانا ہُوا ــــــ"

"اتنی دور سلہٹ کیسے آئے ــــــ؟"

"ابا کی کھاتر بیٹیا ــــــ" بوڑھے مکھیا رام نندن نے اپنا پچکا ہُوا پیٹ بجایا۔ "صاحب لوگ، کاشی اور کلکتے جاتا تھا۔ مجور بھرتی کرنے۔ اس نے جنگل بالا دلیت کیا۔ دکھل کیا ــــــ پھر سردار لوگ ــــــ"

"سردار لوگ، مزدوروں کے میڈ مین تھے۔ گرگے ــــــ" ارسلان بھائی نے مکھیا کی بات کاٹ کر مجھ سے وضاحت کی۔

"سو سال قبل انگریزوں نے مشرقی یو۔ پی کے بھوکے ننگے کسانوں کو اپنے گرگوں کے ذریعہ یہاں بلوایا تھا۔ چائے باغوں میں کام کرنے کے لئے۔

یہ گر گئے یا سردار انگریزوں کا دیا ہوا روپیہ خود رکھ لیتے تھے۔ اور مزدوروں کو صرف دو وقت کی روٹی دیتے تھے ــــ"

ارسلان بھائی کی بات سن کر مکھیا نے سر ہلایا اور کہنا شروع کیا "سردار لوگ ہمرے باپ دادا کو اور ہم کو روٹی کپڑے کا لالچ دے کر ادھر لے آیا۔ او جانے میں ریل کا راستہ نہ رہی۔ ہمرے باپ دادا ماٹی کاٹے رہن ـــ"

"ماٹی کاٹے رہن ـــــ!" میں نے دہرایا۔

"ارے دادا پہلے باگ میں کام کرہیں پھر جا کر ماٹی کاٹیں ریل بچھائے کھاتر ــــ" ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"رام نندن بٹیا کو سب کے نام بتاؤ پہلے ـــــ" ارسلان بھائی نے کہا۔

"ہم رام نندن۔ ای ہمری بہن گلجریا۔ ای ترلوچن۔ ای سکھ نندن۔ ای رام کرن۔ ای لبس مینا۔ ای پاربتی" سب نے سر ہلائے۔ پاربتی ایک اٹھارہ سالہ سانولی سلونی لڑکی تھی اور بری طرح لجا رہی تھی۔

"اسے تم اپنی فلم میں ضرور لو۔ بہت اچھا ناچتی ہے ـــــ" زلیخہ نے مجید سے کہا۔ "بلکہ اپنا مرکزی کردار اسی کو بناؤ۔ بہت فوٹو جینک ہے۔"

"اور تم یہاں کون کون تہوار مناتے ہو ـــ؟" میں نے مکھیا سے دریافت کیا۔

"ائے اب رام لیلا نہیں ہوتا بٹیا ـــــ رام نومی۔ کھچڑی۔ ہولی۔ دیوالی کچھ نہیں ہوتا ـــ"

"کیوں ـــــ؟"

وہ خوش ہو گیا۔ میں نے ارسلان بھائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے انگریزی میں کہا —— "پھر بتاؤں گا ——"

پھر فلم میں مزدوروں کے بشاش تہوار کیسے دکھائے جائیں۔ خیر کچھ نہ کچھ اسٹیج کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا۔

"اور تم تو لو چین —— ؟" میں نے ایک اور مزدور سے پوچھا۔

"ہم بٹیا دس سال کی عمر میں اعظم گڑھ سے آئے رہن۔ ضلع اعظم گڑھ تھانہ چڑیا کوٹ۔ بڑا باپ مہاجن سے پچاس ساٹھ روپیہ کرجا لیا۔ مہاجن روپے میں چھ آنے سود لیت رہا۔ بڑا باپ ادا نہیں کر سکا تو مجوروں میں بھرتی ہو کر ہیاں آگیا۔ دس برس میں پچاس روپیہ جوڑ کر پھر واپس گیا۔"

"کب کی بات ہے —— ؟" "جب ذرد گاڑی نہیں چلی تھی ——"

"اور تم کلکتہ آیا —— ؟"

"ہم برٹش کے راج میں مرجا پور سے کلکتے آئے رہے۔ وہاں سے گوالندو گھاٹ آئیں۔ پھر ہمرا آدمی مار کھا گیا۔"

"پاکستان کب بنا تھا۔ یاد ہے —— ؟"

"پاکستان بنے تو ڈھیر دن ہو گیا بٹیا ——"

"بٹیا ——" مکھیا نے ذرا شرما کر کہا —— "ایک بات بتایئے آپ —— ہم لوگن کی بولی کیسی بول لیتی ہیں —— ؟"

"ایسے ہی رام نندن ——" دفعتہً میں نے سوچا کہ اسکرپٹ کے

لئے یہ انٹرویو بالکل بے کار ہیں۔

مجھے خیال آیا کہ انیسویں صدی کے شروع میں لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے بعد مشرقی یو۔ پی کے ہزاروں فاقہ کش کھیت مزدوروں کو جہازوں میں بھر بھر کے ایسٹ انڈیز فیجی ماریشیس اور دوسرے ملکوں کو بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں وہ برطانوی پلانٹیشنز پر غلاموں کی طرح کام کرتے تھے اور آج تک ان کی اولاد وہاں تقریباً اسی حالت میں موجود ہے۔

کچھ دیر بعد مزدور واپس چلے گئے۔ اسی وقت ایک سیاہ فورڈ کونسل آن کر رکی۔ جسے ایک کتھئی بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوش شکل لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک سفید بالوں والی انگریز ضعیفہ بیٹھی تھیں اور تین بچے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پچھلی سیٹ پر آیا کے ساتھ براجمان تھے۔ زرینہ ڈرائیو پر جا کے اس لڑکی سے باتیں کرنے لگی۔ اور حسب معمول میری آمد کے واقعے پر روشنی ڈالی "یہ صنوبر ہے" زرینہ نے مجھ سے کہا ——— "اور مسز ظفر علی، صنوبر کی ممی" ضعیفہ شفقت سے مسکرائیں۔

"ابا کا خط آیا ہے۔ وہ لوک سبھا کے لئے کانگریس ٹکٹ پر کھڑے ہو رہے ہیں ———" صنوبر نے زرینہ سے کہا۔ انگریز نژاد ہونے کے باوجود اس کا اردو لب و لہجہ حیرت انگیز حد تک لکھنوی تھا۔

اتنے میں ایک اور کار اندر داخل ہوئی۔ چونکہ اتوار کی صبح تھی۔ لوگ باگ ایک دوسرے پر کال کرتے یا سیر کرنے کے لئے نکلے تھے۔ یا اللہ کس قدر دکھوں سے بے نیاز زندگی ہے۔ میں نے سوچا۔ نو وارد ایک اسکاٹش جوڑا تھا۔

انہوں نے زرینہ سے کہا کہ کرنل مورگن نے مسٹر اور مسز فریزر کے اعزاز میں رات کے ڈنر پر ہم سب کو مدعو کیا ہے۔ فریزر کل صبح چند روز کے لئے چنڈی چھیرہ ٹی اسٹیٹ، چاندپور، بنگال چلے جائیں گے۔

"جاؤ گی ——؟" زرینہ نے صنوبر سے پوچھا۔

"نہیں ——" اس نے مختصراً جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

"اور یہ تم اور ارسلان ——؟" مسٹر میلکم میک فرسن نے زرینہ سے دریافت کیا۔

"میری کزن ——" زرینہ نے حسب معمول وضاحت کی۔

"ہم لوگ مدتوں بعد ملے ہیں۔ تین چار دن تک متواتر باتیں کریں گے اس لئے فرصت نہ ہو گی ——"

مسٹر و مسز میلکم میک فرسن کے جانے کے بعد میں نے صدر دفتر تار بھجوایا —— "ٹی گارڈن ورکرز مائنورٹی کمیونٹی، کلچر میں اسامی ماحول کس طرح دکھایا جائے۔ فوراً مطلع کیجئے۔"

اس کے بعد میں تار کے جواب اور ڈھاکہ سے کیمرہ مین کی آمد کے انتظار میں اطمینان سے گپیں ہانکنے کے لئے بیٹھ گئی۔

رات کو کھانے کے بعد ارسلان بھائی سونے کے لئے چلے گئے۔ اور میں اور زرینہ ڈرائنگ روم میں آگ کے سامنے بیٹھے سوں سوں کر رہے تھے ——

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ بنگال میں اتنا جاڑا بھی پڑ سکتا ہے ـــــ" میں نے کہا۔ بیرے نے لکڑی کے کندے آگ میں ڈالے اور قہوہ دانی لا کر بیگم صاحب کے سامنے حاضر کی۔ "بتیاں بجھا دو ـــــ" زرینہ نے اس سے کہا۔ وہ روشنیاں بجھا کر اور پردے برابر کر کے دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ وسیع گہرے کمرے میں اب صرف آتشدان کے شعلوں کی روشنی پھیل رہی تھی۔ قہوہ بناتے ہوئے جب زرینہ کا سایہ دیوار پہ پڑا تو میں نے جانا کہ وہ شہرزاد کا سایہ ہے۔ اس لئے میں نے اس سے کہا ـــــ "عزیزہ۔ کیا تم راحت کاشانی کے سلسلے میں کچھ روشنی نہیں ڈالو گی؟"

اسکرپٹ کے کاغذات قریب ایک تپائی پہ پڑے تھے۔ ان پر ایک نظر ڈال کر اس نے کہا ـــــ "ہاں۔" میں پرچھائیں کو دیکھتی رہی۔ جس کے ہونٹ ہلے۔ اور داستان شروع ہوئی۔

"فلیش بیک ـ اے خوش خصال۔ نیک خو۔ پری رو عزیزہ سـ

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال

ہر جگہ اس کی اک نئی ہے۔ چال۔ کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے۔ کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے۔

"سبحان اللہ" میں نے کہا۔

"بی بی۔ بلبل نوا سنج ہزار داستان طوطی زمزمہ ریز خوش بیاں، گلشن تقریر میں یوں چہکا ہے کہ عرصہ پچیس سال کا ہوا کہ عروس البلاد کلکتہ میں تین دوست رہتے تھے۔ کہ تینوں ایک جان تین قالب تھے۔ نام ان کے

شمشاد، قاسم اور واجد تھے۔ تینوں مشرقی یو۔ پی کے ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جو عرصۂ دراز سے کلکتے میں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ تینوں نے پریذیڈنسی کالج میں اکٹھے پڑھا اور جنگ شروع ہوئی تو شمشاد اور واجد اکٹھے ہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہُوا کہ شمشاد کا تقرر شیلانگ میں ہوا۔ وہ ان تینوں میں سب سے بڑا تھا۔ واجد نے محاذ سے لوٹنے کے بعد کلکتے میں پوسٹنگ ہوئی۔ قاسم جو انجینئر تھا۔ وہ ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ اب اس معبودِ حقیقی کی مصلحتوں کے قربان جائیے کہ شیلانگ میں ڈاکٹر ظفر علی بھی رہتے تھے کہ جو در حقیقت باشندے لکھنؤ کے تھے۔ مگر مدتِ مدید سے آسام میں پریکٹس کر رہے تھے۔ ان کی بیوی انگریز تھیں اور اکلوتی لڑکی صادقہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ میجر شمشاد نے جب صادقہ کو دیکھا۔ تو ہزار جان سے اس پر عاشق ہوا اور فوراً پیغامِ مناکحت اس کے والدین کو بھجوایا۔ ڈاکٹر ظفر علی میجر شمشاد کے گھر والوں سے اچھی طرح واقف تھے اور لڑکا نہایت معقول تھا۔ لہٰذا پیغام منظور کر لیا گیا۔ اور صادقہ نے ابھی سینئر کیمبرج بھی نہ کیا تھا کہ اس کی شادی میجر شمشاد سے ہو گئی۔ جو پرستش کی حد تک اسے چاہتا تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے اپنی لاڈلی بیوی کا نام صنوبر رکھا اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے واجد اور قاسم بھی کلکتے سے شیلانگ یا دارجلنگ آجاتے۔ صنوبر سگھڑ بھاوج کی حیثیت سے ان کی خاطریں کرتی اور دونوں کے بیاہ کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی۔ لیکن جب صنوبر کو معلوم ہوا کہ قاسم کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی بیوی پٹنے اپنے میکے میں رہتی ہے۔ تو اسے بڑا غصہ آیا کہ اس نے پہلے

کیوں نہ بنایا۔ اس پر قاسم نے قہقہہ لگا کر خوب اسے بنایا۔ اور اس کی سہیلیوں کے
لئے طرح طرح کے مذاق کیئے۔ قاسم تم سمجھ گئی ہو گی کہ ایک بہت دلچسپ نوجوان
تھا۔" رہ گیا واجد۔ تو اب کچھ عرصے سے وہ شادی کے نام پر چپ ہو جاتا۔ قاسم
صنوبر سے کہتا کہ یہ بڑا گھاگ ہے۔ اس نے کلکتہ میں کوئی سلسلہ شروع کر دیا ہے
اور شمشاد جو ایک بے حد محبت بھرے دل کا مالک تھا۔ اپنے دونوں دوستوں کو
سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔

"اب میں تم کو ایک بات بتا دوں۔" زرینہ نے شال لپیٹتے ہوئے کہا
"یہ چاروں شمشاد، صنوبر، قاسم اور واجد سب ہی اوسط درجے کے لوگ تھے۔
ان کو کتابوں سے کوئی ربط نہ تھا۔ بلکہ پھیکے لوگ تھے۔ جو اس طبقہ میں ہر جگہ نظر
آتے ہیں۔ اچھی ملازمتیں، مستقبل کی ترقی اور آسائش ان کی زندگیوں کے محور تھے
صنوبر بھی سیدھی سادی لڑکی تھی اور خود کو بہت ٹھسے کی لکھنوی بیگم سمجھنے کی شوقین
تھی۔ قصہ کوتاہ چاروں اپنی اپنی جگہ بہت شریف اور ڈھنگ کے لوگ تھے۔ ان میں
آوارہ یا گھٹیا کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔

"پھر صنوبر اور شمشاد کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور ان کی ازدواجی مسرت
کی تکمیل ہو گئی۔ کئی سال گزر گئے۔ جنگ کے آخری دنوں شمشاد قاہرہ بھیج دیا
گیا۔ قاسم ایک جہاز راں کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ شمشاد قاسم سے کہتا گیا کہ وہ وقتاً
فوقتاً صنوبر کی خبر گیری کرتا رہے۔ جو شیلانگ میں تھی۔

"اس دوران میں یعنی شمشاد کی غیر موجودگی میں وہی ہوا جس کے لئے
رومانی ناولوں کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب

آگئے۔ اور جب شمشاد مغربی محاذ سے لوٹ کر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اور اس کے لاڈلے دوست کے درمیان ایک بہت گہرا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔

شمشاد بڑا اصول پرست، کم گو اور ٹھوس بلکہ ٹھس قسم کا انسان تھا۔ جب یہ قصہ چھاؤنی میں اسکنڈل بن کر گشت کرنے لگا تو اس نے سروس پستول نکال کر ارادہ کیا کہ پہلے صنوبر کو مار ڈالے اور پھر خود کو ہلاک کر دے۔ صنوبر نے اس سے طلاق مانگی مگر وہ تو مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔

دارجلنگ اور کلکتے سے دونوں کے والدین نے آکر صلح صفائی کرائی اور صنوبر نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اب وہ قاسم سے نہیں ملے گی۔ شمشاد چونکہ ایک اصول پرست اور راستباز انسان تھا۔ اس نے بیوی کی قسم پر اعتبار کیا مگر ہوا یہ کہ اب صنوبر اور قاسم دریائی راستوں پر خالی اسٹیمروں اور تنہا ڈاک بنگلوں میں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ کیا آسام اور بنگال کے گھنے رومانٹک جنگل اور دریا اس طرح کی ملاقاتوں کے لئے بے حد آئیڈیل ہیں۔

صنوبر کا بچہ اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ شمشاد بچے پر بھی عاشق تھا۔ اور صنوبر کو اس کی حرکتوں کے باوجود اب بھی بے حد چاہتا تھا۔

ایک دن اگرتلہ گھاٹ پر اس نے صنوبر اور قاسم کو اکٹھے دیکھ لیا۔ اور جب صنوبر شیلانگ واپس پہنچی تو اس کی بری طرح ٹھکائی کر ڈالی۔ صنوبر نے دوبارہ طلاق کا مطالبہ کیا اور پہلے سے زیادہ مار کھائی۔

اس مار پیٹ کا سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ آخر ایک رات شمشاد

باہر گیا ہوا تھا۔ صنوبر نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔

"اس رات چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ آسام کی برسات کی رات تم نے دیکھی ہے ——؟ جو محنت کرنے والوں کے لئے قیامت آفریں اور نامرادوں کے لئے پیغام ہلاکت بن کر آتی ہے۔ چنانچہ صنوبر نے بچے کو بہت سی ٹافی دے کر اور جی بھر کے رونے اور پیار کرنے کے بعد آیا کے ساتھ شاگرد پیشے میں بھیج دیا۔ اور پھر اس نے ایک پرچہ لکھا "تم مجھے علیحدہ کرنے پر تیار نہیں اور قاسم کے بنا زندہ رہنے کا اب میرے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس جانکنی کی تکلیف سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی راستہ مجھے سجھائی دیا ہے بھیا کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔

یہ دل دوز خط لکھنے کے بعد اس نے بچے کے کھلونوں، جوتوں اور کپڑوں کو بلک بلک کر پیار کیا۔ پھر آنسو پونچھ کر پرچہ شمشاد کے سرہانے کی میز پر رکھا خواب آور گولیوں کی شیشی الماری سے نکالی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔

"عین اسی وقت بیڈ روم کا دروازہ بھڑ سے کھلا۔"

"واہ بھئی تمہارا جواب نہیں۔" میں نے داد دی۔ "اس قدر جاندار کلائمکس کی آپ منظر کشی فرما رہی ہیں۔ اور کیا بھڑ سے دروازہ کھولا ہے۔ سبحان اللہ ——"

"سنو تو چپکی بیٹھی —— تو جناب دروازہ کھلا اور کودتا پھاندتا بھیا تیر کی طرح اندر داخل ہوا اور صنوبر دھک سے رہ گئی۔ بچے نے ماں کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہا "ممی، ممی۔ ذرا یہ فیتہ باندھ دو، مجھ سے بندھ نہیں رہا۔ اور اپنی

ننھی سی کلائی پیش کر دی۔ گلابی پلاسٹک کی مصنوعی گھڑی اس کے دوسرے ہاتھ میں تھی۔ جو اسے غالباً آپا نے تحفتہً دی تھی۔

"اس لمحے اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ موت کو یکسر بھول گئی اور زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ خط پھاڑ کر پھینک دیا اور شمشاد کے لئے کھانے کی دیکھ بھال کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔"

"لیکن صبح کو اس نے شمشاد کے دفتر جانے کے بعد اسباب باندھا اور بچے کو ساتھ لے کر دارجلنگ روانہ ہو گئی۔ وہاں اس نے اپنے والد ڈاکٹر ظفر علی کے سامنے پاؤں جوڑے کہ وہ خلع حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ وہ ایک نہایت وضعدار آدمی ہیں۔ انہوں نے اسے خاندانی عزت اور اپنے سمدھی سے اپنی چالیس برس پرانی دوستی کا واسطہ دیا۔ اور اس سے التجاء کی کہ وہ شمشاد کے پاس واپس چلی جائے۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ قصور سراسر صنوبر کا تھا۔ شمشاد اس کے لئے آئیڈیل شوہر ثابت ہُوا تھا۔ مگر ہے یہ وہ آتش غالب وغیرہ وغیرہ چنانچہ صنوبر کلکتے گئی اور چند دوستوں کی مدد سے عدالت میں خلع کی درخواست دے دی۔ مقدمے نے نہایت طول کھینچا۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند کا زمانہ آن پہنچا۔ تقسیم کے چند ماہ بعد صنوبر نے خلع حاصل کر لیا۔ لیکن اسے اپنے بچے سے دستبردار ہونا پڑا۔ بچہ اب اپنی دادی اور پھوپھیوں کے ساتھ ڈھاکے میں تھا۔ جہاں شمشاد کے گھر والے کلکتے سے ترکِ وطن کر کے آ چکے تھے۔ شمشاد کچھ عرصے بعد فوج سے ریلیز حاصل کر کے کسی قسم کی اعلیٰ ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ چلا گیا۔ کلکتے میں صنوبر اور قاسم کی شادی ہو گئی۔

"دیبی بی۔ اب یہ نکتہ یاد رکھو کہ قاسم نے اپنی پہلی بیوی کو جو مستقل پلٹنے میں رہتی تھی۔ طلاق نہیں دی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے سگے چچا کی اکلوتی اور صاحب جائداد لڑکی تھی۔ اب قاسم کی دوسری شادی نے جائداد کے سلسلے میں بھی قانونی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ اور اس کے چچا یعنی سسر نے اس پر دعویٰ دائر کیا۔ جانے کیا قضیہ تھا۔ اس کی مجھے تفصیل معلوم نہیں۔ ان سب مصیبتوں سے بچنے کا بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو خیر باد کہے۔ چنانچہ اس نے آسام کی جہاز راں کمپنی سے اپنا تبادلہ مشرقی پاکستان کی ایک جہاز راں کمپنی میں کروا لیا۔ اور دونوں دولہا دلہن ڈھاکے آگئے۔

" واجد بھی کلکتے سے اوپٹ آؤٹ کر کے ڈھاکے آ چکا تھا۔ اور فوج چھوڑنے کے بعد ایک سول ملازمت میں شامل ہو گیا تھا۔

" ڈھاکے میں صنوبر نے اپنا نیا گھر بھی اسی خوش سلیقگی اور نفاست سے سجایا۔ جس طرح وہ آسام میں اپنے بنگلے دلہن کی طرح سجائے رکھتی تھی۔ وہ ایک بڑی مرنجاں مرنج اور خاموش طبیعت لڑکی ہے۔ اور اسے دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آسکتا تھا کہ اس نے سر پہ کفن باندھ کر ایسا طوفانی اور بلاخیز عشق کس طرح کر ڈالا تھا۔ بہر حال اب وہ بیگم شمشاد کے بجائے بیگم قاسم تھی اور بے حد مسرور تھی۔

واجد ملازمت کے سلسلے میں نارائن گنج میں مقیم تھا۔ مگر ویک اینڈ گزارنے کے لئے صنوبر اور شمشاد کے یہاں آجاتا تھا۔ صنوبر اس کے پیچھے پڑ گئی

کہ پاکستان بننے کے بعد ڈھاکے میں سارے برصغیر سے آئے ہوئے اچھے اچھے، خاندانوں کی ریل پیل ہے۔ اور ایک سے ایک خوب صورت لڑکیاں یہاں موجود ہیں۔ اب اسے ضرور بیاہ کر لینا چاہئیے۔ مگر واجد حسب سابق اس کی بات ہنس کر ٹال جاتا اور قاسم صنوبر کو یاد دلاتا کہ واجد بڑا گھاگ ہے۔ اس کا کلکتہ والا سلسلہ ابھی تک خاموشی چل رہا ہے۔ یہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے گا۔

"اس بات پر واجد معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر کہتا۔ ابے چپ ہو جا یار اگر اپنی خیریت چاہتا ہے۔ اس پر دونوں دوست خوب قہقہہ لگاتے اور صنوبر اس پر اسرار مذاق کو نہ سمجھ پاتی۔ مگر خود بھی ہنسی میں شامل ہو جاتی۔"

"اکثر وہ بچے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کار لے جا کر اس کے اسکول کے باہر کھڑی کر دیتی۔ اور بچے باہر نکلتے تو صبر سے اپنے بیٹے کا انتظار کرتی رہتی۔ مگر جب وہ قریب سے گزرتا تو جلدی سے آنچل آنکھیں ڈال کر کار اسٹارٹ کر دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ شمشاد نے بچے سے کہہ رکھا ہے کہ اس کی ممی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسکول سے لوٹ کر وہ پہروں روتی۔ تب قاسم اس پر برس پڑتا۔

"علامہ راشد الخیری کی اس ٹریجک ہیروئن نے خدا کی قسم اب مجھے بور کر دیا ہے وہ کہتا —— وہ اور زیادہ بلک بلک کر روتی۔ تب واجد اسے بڑے پیار سے سمجھاتا۔ تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو۔ اب قاسم سے لڑائی جھگڑے شروع نہ کر دینا۔ کہیں کی نہ رہو گی۔ وہ مزید روتی اور واجد اسے مزید دلاسے دیتا۔

"پھر یہ ہوا کہ صنوبر کے یہاں توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور وہ بیٹے کی مفارقت کا

دکھ بھول کر ان بچوں میں محو ہو گئی۔ ڈاکٹر ظفر علی شیلانگ میں تھے۔ اور صوبائی سیاست میں نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ صنوبر کی والدہ شیلانگ سے آ کر ڈھاکے میں بیٹی داماد کے پاس قیام کرتیں اور نواسیوں سے لاڈ پیار میں لگی رہتیں۔ یوں خاصی مطمئن اور خوش باش زندگی صنوبر اور قاسم کی گزر رہی تھی۔"

"پھر ایک بے حد معمولی سا واقعہ ہُوا، بی بی تم وقت کی بات جو کرتی ہو تو میری سنو۔"

"ایک چھوٹا سا سفر۔ ایک بظاہر غیر اہم ملاقات، ایک منظر کا سرسری عجلت ایک مختصر سا خط۔ ایک تحریر، بے دھیانی میں لکھے ہوئے چند الفاظ۔ زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ ایک لمحہ جہنم کو جنت اور جنت کو جہنم میں تبدیل کرنے پر قادر ہے۔ ایک لمحہ۔۔۔ صرف ایک لمحہ۔۔۔ بی بی۔"

"ایک روز قاسم نے دفتر سے گھر آ کر صنوبر سے کہا کہ اُسے ایک سرکاری وفد کے ساتھ بمبئی بھیجا جا رہا ہے۔ کسی کانفرنس کے لئے اور اس نے صنوبر کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فوراً تیار ہو جائے۔ صنوبر بمبئی کی سیر اور شاپنگ کے خیال سے کھل اٹھی۔ بچیوں کو اپنی والدہ کے حوالے کیا اور خوش خوش طیارے میں بیٹھ کر قاسم کے ساتھ بمبئی پہنچی۔

"وفد کے اراکین تاج محل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ایک رکن نے اپنے ایک مقامی دوست سے کہا کہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنا اور نرگس سے ملنا چاہتے ہیں۔ مقامی دوست نے جواب دیا کہ وہ ابھی اپنی دوست مسز سروپ کمار کو فون کئے دیتے ہیں وہ آپ سب کو نگار خانوں کی سیر بھی کرا لائیں گی۔ اور نرگس، راجکپور، دلیپ کمار سب سے ملوا بھی دیں گی۔ اور بیگم قاسم، انہوں نے صنوبر کو مخاطب کیا۔ مسز سروپ کمار اور ان کی ہمشیرہ مس کا نی ساڑیاں خریدنے کے سلسلے میں آپ کی

بہترین گائیڈ ثابت ہوں گی۔"

"لہٰذا ان دونوں خواتین کو فون کیا گیا اور صنوبر ان کے ساتھ باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔"

"تب ایک عجیب بات ہوئی۔ قاسم نے اچانک اس سے کہا کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کانفرنس سے لوٹ کر شام کو اسے خود باہر گھما لائے گا۔ صنوبر نے اپنے ایکسائٹمنٹ میں اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ تو نرگس اور مینا کماری کی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے مری جا رہی تھی۔ چنانچہ قاسم اور دوسرے پاکستانی انجینئر کانفرنس کے لئے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک تازہ ترین ماڈل کی امریکن کار تاج کے سامنے آ کر رکی۔ اور وہ بے حد فیشن پلیٹ لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اتریں اور صنوبر سے جو ان کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی سمندر اور جہازوں کو دیکھ رہی تھی، اپنا تعارف کرایا۔ فرحت سرور کمار اور راحت کاشانی۔

"بی بی ——— اس نکتے پر پہنچ کر یہ خاکسار ایک دوسرا فلیش بیک شروع کرتی ہے۔ یعنی فلیش بیک در فلیش بیک۔ صنوبر کی کہانی۔ اس نکتے تک ذہن میں محفوظ رکھو۔ کس نکتے تک ———؟"

"کہ دو بے حد فیشن ایبل پلیٹ لڑکیاں تاج کے سامنے آ کر اتریں۔" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"ہاں۔" زرینہ نے گلا صاف کیا اور ایک کافی تیار کرنے کے بعد کہانی جاری رکھی۔

"تم کو یاد ہو گا بی بی۔ جب ابا میاں کا تبادلہ لکھنؤ سے کلکتے کا ہوا تھا، تو میں انٹر سائنس کے لئے لیڈی برابورن کالج میں داخل ہو گئی تھی۔ یاد ہے نا ———؟

اچھا ۔ تو ایک مرتبہ کیا ہوا کہ ہم کالج میں ایک ہندوستانی ڈرامہ اسٹیج کرنے والے تھے ۔ تو ہماری ایک ہم جماعت انجم آرا نے کہا کہ اس کے ماموں کے ایک دوست ہیں ۔ واجد صاحب ۔ واجد صاحب کریکے ۔ ان واجد صاحب کی ایک بے حد گلیمرس گرل فرینڈ ہے جو بہت اچھی ایکٹرس ہے ۔ اور شہر کے تھیٹریکل حلقوں میں اس کی ڈائرکشن کی صلاحیتوں کو بھی بہت سراہا جا رہا ہے ۔ میں اسے بلواتی ہوں کہ ہماری مدد کرے ۔

"اب یہ لمبا چوڑا تعارف دراصل ایک ایسی حسینہ نازنین کا تھا جو کلکتہ میں تو بے حد مشہور تھی مگر بسم اللہ کے گنبد میں پلی ہوئی ہم بے وقوف اور نوعمر لڑکیوں کے لئے اس وقت تک اس کا نام اجنبی تھا ۔ یہ زہرہ جبیں فخرِ لعبتانِ لندن و چین ماہرو عنبریں مو سرگروہ خوبانِ جہاں جانِ جہاں آرام دل دلِ مشتاقاں کہ نام اس کا راحت کاشانی تھا ۔ سال بھر قبل کوئٹے سے آئی تھی ۔ اور وار پبلسٹی کے محکمے میں اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر بقول شخصے لگی ہوئی تھی ۔

"اس کے بارے میں طرح طرح کی رومانٹک روایتیں مشہور ہو گئی تھیں ۔ جن کی وجہ سے اس نے سارے میں تہلکہ مچا رکھا تھا ۔"

"مس کاشانی کی دوسری تہلکہ خیزی کی وجہ ایک اور تھی ۔"

"مجھ کو خوشی ایک اور ہے — لانا تو اور ایک جام رے
ہاں ہاں مسلماں زادیاں — ہوتی ہیں عفت والیاں
چشمِ فلک نے آج تک — دیکھی نہ ان کی اک جھلک"

میں نے زرینہ کی بات کاٹ کر آنکھیں بند کر کے پڑھنا شروع کر دیا ۔ "اور جھلک"

اتنے زور سے ادا کیا کہ زرینہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ پھر اس نے اسی روانی سے کہانی جاری کر دی۔ وجہ ایک اور تھی۔ آج برصغیر اتنا آزاد ہو چکا ہے ماشاء اللہ سے ——— اور اب یہ انوکھی بات نہیں رہی۔ مگر اس وقت تک وطنِ عزیز اس قدر ماڈرن نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ حسینہ نازنین لگتے کے لوئر سرکلر روڈ کو پیرس کا لیٹن کوارٹر گردانتی تھی۔ اور واجد صاحب کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

"چنانچہ آئندہ اتوار ہمارا ڈرامہ گروپ زولوجیکل گارڈن میں ایک جھیل کے کنارے کنج میں جمع ہوا اور وقت مقررہ پر مس کاشانی وہاں تشریف لائیں۔ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ کروائی۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ ڈراما عصمت آپا کا "خالہ بی" تھا اور بڑے وقار اور متانت سے ہم لونڈیوں سے باتیں کرتی رہیں۔

"دوسرے اتوار کو ہم کالج ہال میں ریہرسل کے لیے اکٹھے ہوئے مگر مس کاشانی نہ آئیں۔ کچھ دیر بعد انجم آرا نے منہ لٹکائے ہوئے آکر خبر دی کہ ایک بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ راحت آپا واجد چچا کے والدین کے گھر گئی تھیں۔ وہاں واجد چچا کی بہنوں نے ان پر چوری کا الزام لگا کر ان کو مکان سے نکال دیا۔

"گڈ گاڈ۔ آل مائٹی جیزس۔ گڈنس گریشس" حیرت زدہ آوازوں کا کورس بلند ہوا۔

"مگر چوری کا الزام کیوں ———؟" میں نے پوچھا۔

"حالانکہ تم کو پتہ بھی ہے۔ راحت آپا تلات کے فقیروں کی ہمنوا ہیں" انجمن آرا نے کہا۔

"فقیروں کی ——— یعنی صوفیوں کی ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں بھائی - فقیر چورنگ برنگی مالائیں پہنے درگاہوں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ اور چمن - بوستان اور زاہدان میں راحت آپا کے والد کے ذاتی تاکستان ہیں ۔"

"اوہ ہاؤ ویری نیبولس ۔"

"لیکن راحت آپا کی امّی خانہ بدوش ہیں ۔" انجم آرا نے بڑے ڈرامائی انداز میں دوسری اطلاع دی یعنی جپسی ۔ اور فورٹ سنڈیمن اور لورا لائی سے لے کر تربت تک ان کے قبیلے کے کاروانوں کی گھنٹیاں صحرا کی چاندنی میں گونجتی رہتی ہیں ۔ راحت آپا کے نانا بلوچی خانہ بدوشوں کے سب سے بڑے قبیلے کے سردار ہیں اور بے حد دولت مند ۔ اونٹوں ۔ گلے اور جنابِ ایرانی قالینوں کے سجے ہوئے خیمے اور تلواریں ۔ بندوقیں ۔ مگر واجد چچا کی بہنوں نے یہ سب نظرانداز کر کے طعنہ دیا ۔ کہ تم آخر ہو کون ——— اٹھائی گیری ——— اُچکی ——— ادھر اُدھر ڈاکے ڈالتی پھرتی ہو ——— تباہ و برباد کر ڈالتی ہو لوگوں کو ——— اب بتاؤ بھلا بیچاری راحت آپا کو لے کے چور ڈاکو بنا دیا ———

"ہم سب راحت کاشانی کے اس الف لیلوی پس منظر سے مسحور ہوئے اور بیانگ دہل اعلان کیا کہ واجد چچا کی بہنوں کو ایسی غلط اور افسوس ناک بات ہرگز نہ کہنا چاہیئے تھی ۔

راحت کاشانی ایک دم غائب ہو گئیں - اور "خالہ بی" ان کے ڈائریکشن سے فیض یاب نہ ہو سکا ۔ لیکن ڈیڑھ دو مہینے بعد ایک صبح انجم آرا نے لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی اطلاع دی ۔ کہ راحت نے عنابہ برج کے ایک

انتہائی لوفر نواب زادے سے شادی کر لی۔ اور اس کے چار دن بعد ہی اس سے طلاق لے لی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وضاحت انجم آرا نے یوں کی کہ راحت نے واجد چچا سے کہا کہ وہ اس سے شادی کر لیں۔ مگر واجد چچا نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اس کی عزت نہیں کرتے۔"

"بھئی اس کا یہی مطلب ہوا کہ آدمی اس لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ جس کے لئے اس کے دل میں عزت ہو۔"

"مگر پھر محبت کیوں کرتے ہیں؟"

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ ہم لوگ اس وقت کتنے بھولے اور احمق تھے۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو۔ گاگ ایک سے ایک ——"

"اچھا زرینہ بی بی تم اپنے فٹ نوٹ نہ دو۔ قصہ سناؤ۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "مجھے صبح سویرے لوکیشن ڈھونڈنے جانا ہے ——"

"اچھا اچھا رعب مت ڈالو —— ہاں تو میں کیا بتا رہی تھی —— ؟"

"لوفر نواب زادے سے طلاق لے لی۔"

"ہاں —— اور ٹالی گنج میں فلیٹ لے لیا۔ کیونکہ اب اس کی چھوٹی بہن فرحت بھی کالج کی تعلیم ختم کر کے کرٹے سے کلکتے آگئی تھی۔ نزہت کافی معمولی شکل کی لڑکی تھی۔ مگر انجم آرا نے کہا کہ چھوٹے ماموں کہتے ہیں۔ فرحت کا شانی میں گھر دوں سکیس اپیل ہے"

"اب دونوں بہنوں نے مل کر شہر کو انگریزی محاورے کے مطابق سرخ رنگ دیا۔"

اُنہی دنوں قاسم جو دریائی ملازمت کے سلسلے میں آسام میں تھا۔ کلکتہ آیا۔ اس وقت صنوبر سے اس کا عشق شروع نہیں ہوا تھا۔ کسی محفل میں فرحت کاشانی سے اس کی ملاقات ہوئی اور فرحت اس کی محبوبۂ دل نوازنہ بن گئی۔ پھر وہ شیلانگ گیا اور شمشاد کی غیر حاضری میں صنوبر سے عشق کرنے لگا۔ مگر ہر مرتبہ جب وہ کلکتہ آتا تو فرحت بھی اس کی رفاقت کرتی۔ جب تک صنوبر سے شادی کر کے وہ ڈھاکا نہیں گیا، اس وقت تک فرحت کلکتہ ہی میں رہی۔ لیکن صنوبر کو اس کے وجود کا مطلق علم نہ تھا (حوالہ کے لئے پچھلا فلیش بیک یاد کرو)۔

"پھر بی بی میں انٹر سائنس کر کے لکھنؤ میڈیکل کالج چلی گئی۔"

"ایک روز ریڈنگ روم میں ایک فلمی رسالہ پر نظر پڑی تو اس میں راحت کاشانی کی متبسم تصویر موجود تھی۔

"اب آگے کا سنو احوال۔"

"تقسیم ہند کے فوراً بعد انجم آرا شادی کر کے لکھنؤ آگئی، اور اس نے بتایا کہ واجد چچا ڈھاکا چلے گئے ہیں اور راحت اور فرحت نے بمبئی جا کر فری لانسنگ شروع کر دی ہے۔"

"کا ہے کی فری لانسنگ ——؟" میں نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔

"اداکاری اور دیگر فنونِ لطیفہ ——" انجم آرا نے بڑے گھاگھ پن سے جواب دیا۔ شادی سے پہلے کتنی معصوم تھی یہ بچی۔ میں نے سوچا۔

"وہ دونوں فلمی دنیا میں اس طرح داخل ہو گئی ہیں، جس طرح بطخ پانی میں تیرنے لگتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی شکلیں کیمرا کے لئے موزوں نہیں ہیں۔

اس لئے بڑی فلم اسٹار کبھی نہ بن سکیں گی"۔ انجم آرا نے کہا۔

"آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نیا دولت مند طبقہ ابھرا۔ حصول زر جس کا واحد آدرش تھا۔ اور جو ہر قسم کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے بے بہرہ اور بے تعلق تھا۔ شراب نوشی، فیشن ایبل، عیاشی اور ریاکاری کے اس عظیم الشان دور نے ایسی روایات کو جنم دیا۔ جن کے آگے بے چاری راحت کاشانی بھی ماند پڑ گئی۔ اب راحت اور فرحت کا ٹاپ انوکھا نہیں رہا تھا

"اسی زمانہ میں سروپ کمار جو بمبئی میں بڑا سخت فلمی ہیرو لگا ہوا تھا فرحت کے عشق میں گرفتار ہوا —— اور اس سے سول میرج کرلی۔ راحت نے ایک غیر فلمی ہیرو سے گویا گندھر بیاہ کر لیا اور مسز غیاث الدین کہلانے لگی۔ پھر یکایک مسٹر غیاث الدین انگلستان چلے گئے۔ راحت بمبئی کے ترقی پسند حلقے سے بھی ربط رکھتی تھی اور جب غیر ملکی فلمی یا تہذیبی وفد شہر میں وارد ہوتے تو راحت ہی ان کے استقبال میں پیش پیش رہتی۔ مگر فلم انڈسٹری کے اندر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ اس کے لئے بہت بڑا المیہ تھا۔ احمق الذین، خالی الذہن لڑکیاں چوٹی کی فلم اسٹار بن کر لاکھوں کمار ہی تھیں اور ایک عالم میں مشہور ہو گئی تھیں۔ مگر راحت اپنے غیر معمولی حسن، ذہانت، فنی صلاحیت اور اخلاقی آزادی کے باوجود کچھ نہ بن سکی اس احساس محرومی اور ناکامی کی تلافی کے لئے وہ تلوار کی دھار پر سے گزر گئی۔

"پھر سروپ کمار ایک فلمی ڈیلی گیشن کے ساتھ جاپان چلا گیا اور فرحت اپنی بہن کی دلداری کے لئے راحت سروپ کمار کے نیپن سی روڈ کے عالی شان فلیٹ میں رہنے لگی

آ کر رہنے لگی۔

(سروپ کمار نے متعدد ریس گھوڑے اور دو لاکھ روپیہ بھی فرحت کے نام منتقل کر دیا تھا۔ اس میں بیوی کی چاہت اور انکم ٹیکس سے بچنے کی تدبیر دونوں مضمر تھے)

"ایک روز فرحت صوفے پر لیٹی آپا سے پاؤں دلوا رہی تھی اور راحت نیچے قالین پر اوندھی لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ سفید رنگ کے فون کی گھنٹی بجی اور تاج محل ہوٹل سے ایک دوست نے کہا کہ ڈھاکا سے کچھ مہمان آئے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں ——— فوراً آؤ ——— چنانچہ دونوں بہنیں پریوں کی طرح سج تاج محل ہوٹل کو روانہ ہو گئیں۔ اور وہاں پہنچ کر صنوبر قاسم کو اپنا منتظر پایا۔

"آٹھ دن تک بڑے جشن رہے۔ صنوبر اور فرحت میں بے حد دوستی ہو گئی۔ فرحت نے ڈھیروں ساریاں اسے تحفے میں دیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ کیونکہ روپیہ اس کے لئے اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ دن رات اس کی موٹریں صنوبر اور قاسم کی خدمت میں حاضر رہتیں۔"

"ڈھاکا کو لوٹنے سے ایک دن قبل صنوبر دوستوں کے ساتھ ایلیفنٹا کی سیر کرنے کے لئے گئی۔ قاسم سرکاری کام کی وجہ سے نہ جا سکا۔ جزیرہ پر پہنچتے ہی گروہ کی ایک خاتون کی طبیعت خراب ہو گئی اور دن بھر وہاں رہنے کے بجائے وہ سب دوسری لانچ سے واپس آ گئے۔ صنوبر ایک ٹیکسی لے کر اپالو بندر سے سیدھی فرحت کے یہاں روانہ ہو گئی۔ تاکہ بقیہ وقت وہاں گذارے۔

"جب وہ فلیٹ کے اندر پہنچی تو سارے میں دوپہر کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راحت کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے جا چکی تھی۔ حسب معمول صنوبر سیدھی فرحت کی شاندار خواب گاہ کی طرف چلی گئی اور ـــــ"

"بھڑ سے دروازہ کھولا۔" میں نے بات کاٹی۔

"ہاں ـــــ اور فوراً الٹے پاؤں لوٹی اور لفٹ تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا کر گرنے لگی تو ایک گھاٹن لپے اسے سنبھالا۔ صنوبر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا کہ جو صاحب اندر ہے وہ پہلے بھی آ چکا ہے ـــــ؟"

"گھاٹن نے ہونٹ بچکائے۔ مگر چونکہ فرحت نے کسی قصور پر اس کی دو ماہ کی تنخواہ ضبط کر کے اسے صبح ہی نوکری سے برطرف کیا تھا۔ لہٰذا اس نے جواب دینے میں نمک حرامی نہ سمجھی۔ اس نے کہا۔ ہاں بائی۔ صاحب تو ایک چھ سات دن سے روز آتا ہے۔ کبھی دن میں کبھی رات کو ـــ آنے کا ٹائم کوئی ٹھیک نہیں ہے ـــ باہر گاؤں سے آیا ہے ـــــ کل چلا جائے گا۔"

"صنوبر واپس تاج پہنچی اور جب شام کو قاسم نے کمرا میں داخل ہو کر کہا کہ وہ دن بھر کانفرنس میں مغز کھپاتے کھپاتے چور ہو گیا ہے۔ تو صنوبر نے بڑے سکون کے ساتھ اس کے لئے کافی منگوائی اور اسے سرڈون کھانے کو دی۔"

"کیونکہ اسے واجد کی بات یاد آ گئی تھی۔ کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی ہے۔"

"ڈھاکا واپس پہنچ کر بھی اس نے کبھی قاسم پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کیا جانتی ہے اور اپنے معمول کے مطابق زندگی گزارنے لگی ـــــ"

"اب بی بی اس داستان کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے۔"

زرینہ نے شال کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر صوفے پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ "میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم-بی-بی-ایس کرنے کے بعد ۵۷ء میں گائناکولوجی میں ایم۔ ڈی کرنے ایڈنبرا چلی گئی۔ وہاں سے واپس آکر بلرام پور ہسپتال میں کام کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے میڈیکل کالج میں لکچررشپ ملنے والی تھی کہ اسی زمانے میں ڈھاکے سے بڑی آپا کے بڑے پُر اسرار سے خط اماں کے پاس آنے شروع ہوئے۔ تمہیں معلوم ہے بھائی جان ۴۷ء سے ڈھاکا میں ہیں۔ وہاں ان دونوں کی ملاقات ارسلان احمد اور ان کے گھر والوں سے ہوئی، اور بڑی آپا نے ترت میرے رشتے کی بات چیت شروع کر دی۔ ادھر میں اپنے آئیڈیلز لئے بیٹھی تھی کہ جنتا کی خدمت کروں گی۔ گاؤں میں جاکر کسانوں کا علاج معالجہ کروں گی۔ کچھ عرصہ تک میں نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے ساتھ بھی کام کیا اور اب میڈیکل کالج میں گائناکولوجی پڑھانے کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ مگر بڑی آپا کے سامنے کس کی چل سکتی ہے۔ چنانچہ ابا میاں اور اماں نے مجھے زبردستی ڈھاکا چلتا کیا۔ ۵۸ء میں ڈھاکا آئی۔

"ارسلان مجھے بے حد پسند آئے۔ مگر شادی کا فیصلہ فوراً نہ کرسکی۔ تم جانو ہی ٹو بی اور ناٹ ٹو بی TO BE OR NOT TO BE کا جان لیوا مسئلہ —— بھائی جان میرے ویزا کی میعاد بڑھواتے رہے تاکہ میں اطمینان سے کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

ان ہی دنوں ایک شام بھائی جان اور بڑی آپا کے ساتھ ان کے دوستوں مسٹر اور مسز سیڈرک وارنگٹن کے یہاں "سکال" کرنے کے لئے گئی۔ یہ ایک معمر انگریز

جوڑا تھا۔ مسٹر وار نگٹن مشرقی پاکستان کی ایک برطانوی جہاز راں کمپنی کے افسر اعلیٰ تھے اور بہت جُغادری قسم کے انگریز تھے۔ ہم لوگ لان پر جاکر بیٹھے اور ملازم ہماری اطلاع کرنے کے لئے اندر گیا اور چند منٹ بعد کیا دیکھتے ہیں۔ ایک پری جمال لڑکی پتلون میں ملبوس برآمدے سے اُتر کر گھاس پر خراماں خراماں چلتی مسکراتی ہوئی ہماری طرف آرہی ہے۔

"جب وہ قریب پہنچی تو مجھے اُسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ راحت کاشانی تھی۔ جسے میں نے دس سال قبل کلکتہ کے زولوجیکل گارڈن میں دیکھا تھا اب وہ کوئی بتیس تینتیس برس کی رہی ہوگی۔ مگر پہلے سے بھی زیادہ دل کش اور اسمارٹ نظر آرہی تھی۔"

"اس نے خالص برطانوی انداز میں بڑے اسٹائل سے بات شروع کی اور کہا کہ سیڈرک اور ہلڈا ابھی ابھی باہر گئے ہیں اور وہ ان کی دوست اور ہاؤس گسٹ ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور یہ کہ آپ لوگ کیا پئیں گے۔"

"میں نے اسے کلکتہ کی ملاقات یاد دلائی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ اور بے حد تپاک اور خلوص سے باتیں کرنے لگی اور کہا کہ وہ کل ہمارے یہاں آئے گی میں نے اس سے بمبئی کے پروگریسیو گروپ میں شامل دوستوں کی خیر خبر دریافت کی اور راحت کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ بڑے واضح سیاسی شعور کی مالک ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے بین الاقوامی سیاست اور ادب وغیرہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔"

"پھر کچھ دیر تک دونوں ملکوں کے درمیان زرِ مبادلہ کی پابندیوں کا تذکرہ ہوتا

رہا۔ اس نے کہا کہ ہندوستان سے صرف پچاس روپے لے کر پاکستان آنے کی اجازت ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ میں صرف پچاس روپے لے کر یہاں پہنچی ہوں۔ کس قدر کوفت کی بات ہے۔ تھوڑی دیر میں میزبان بھی آگئے اور راحت جس طرح گھل مل کر ان کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ گویا وہ ان کے گھر کی ایک فرد ہے۔"

"دوسرے دن وہ ہمارے یہاں آئی اور بے حد دلچسپ گفتگو کرتی رہی یہ لڑکی لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا فن جانتی ہے۔" بڑی آپا نے اظہار خیال کیا۔

"کوئی پندرہ بیس دن بعد ایک روز مس فلیمنگ بڑی آپا سے ملنے آئیں۔ مس کلارا فلیمنگ ہلڈا ادارنگٹن کی بوڑھی کنواری بہن تھیں۔ اور انگلستان سے چند ماہ کے لئے آئی ہوئی تھیں۔

"جیسا کہ میں نے تم کو ابھی بتایا وارنگٹن بڑے جغادری قسم کے انگریز تھے اور انگریز اپنے ماں باپ بہن بھائی کو بھی اپنے گھر پر مہمان رکھنے کا قائل نہیں۔"

"دوسری چیز یہ کہ انگریز ہمیشہ انڈر اسٹیٹمنٹ میں بات کرتا ہے۔ چنانچہ کلارا فلیمنگ نے برسبیل تذکرہ کہا کہ ڈیئر راحت ہمارے یہاں بہت ویلکم ہے اور وہ ایک نہایت ہر دلعزیز لڑکی ہے۔ اس وجہ سے اس نے یہاں آتے ہی آتے ان گنت دوست بنا لئے ہیں۔ مگر ذرا سی دقت یہ ہے کہ ان دوستوں کے وقت بے وقت ٹیلی فون آتے رہتے ہیں اور ہلڈا اعصاب کی مریض ہے۔"

"آپ لوگوں کی راحت سے بہت پرانی اور بے تکلف دوستی ہے۔ اسے سمجھا دیجئے کہ دوستوں کو منع کر دے۔" بڑی آپا نے کہا۔

"ہاں میرا یقیناً یہ خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ سیڈرک اور ہلڈا دو مہینے قبل دہلی گئے تھے۔ وہیں پہلی بار ان کی ملاقات راحت سے ہوئی تھی اور اس پیاری بچی نے ان دونوں کی بہت خاطر مدارات کی۔ سیڈرک نے اس سے کہا تھا کہ اگر کبھی وہ ڈھاکہ آئے تو آ کر ان کے یہاں ہی ٹھہرے۔ تو وہ سچ مچ آ گئی اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مہربان آمد ہم لوگوں کے لئے باعثِ مسرت ہے۔ میری بہن ہلڈا کے اعصاب اس مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے بہت خراب ہو گئے ہیں۔ کلارا فلیمنگ نے آنکھیں چندھیا کر اپنی خلیق مسکراہٹ کا رخ میری طرف کیا۔ "کیا تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔ مائی ڈیر کہ بنگال اس موسم میں بہت جلد آزردہ ہو جاتا ہے ——؟"

"اس بات کو ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک صبح ہمارے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ راحت بول رہی تھی۔ میں شاہ باغ میں شفٹ ہو گئی ہوں۔ کسی وقت اِدھر آؤ۔ میں شام تک اپنے کمرے پر ہی رہوں گی۔ اور کمرے کا نمبر بتایا۔

"مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ یہ لڑکی پچاس روپے لے کر ہندوستان سے آئی تھی شاہ باغ میں کیسے منتقل ہو گئی۔

"شام کو میں ریس کورس روڈ پر سے گزر رہی تھی تو راحت کے فون کا خیال آیا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اس کے پاس ہوتی چلوں۔ شاہ باغ ہوٹل کی دوسری منزل پر راحت کاشانی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا لہٰذا میں دستک دینے کے بعد اندر داخل ہو گئی۔ غسل خانے میں سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ جھل جھل کرتا لباس پلنگ پر رکھا تھا۔ کونے میں میز پر راحت کے دوسرے

شوہر غیاث الدین کی تصویر اور ماڈرن آرٹ کے متعلق مغربی نقادوں کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ سنگھار میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔ ابھی گلدستے کا سرخ ریشمی فیتہ بھی اس میں موجود تھا۔

"ارے بھئی راحت" ۔۔۔۔ میں نے آواز دی۔

"غسل خانے کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر سے جواب دیا۔

ہاں ہاں آجاؤ ۔۔۔۔ یہیں آجاؤ۔

"میں یہ سمجھ کر کہ شاید وہ منہ ہاتھ دھو رہی ہے۔ اطمینان سے اندر چلی گئی اور ہکا بکا اور بے حد نادم ہوئی"

"راحت کسی ہالی ووڈ ایکٹریس کی طرح ٹب میں نیم دراز تھی۔ ٹیلی فون پاس اسٹول پر رکھا تھا جس کا ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں فوراً الٹے پاؤں واپس جانے کے لئے پلٹی تو اس نے بڑے اطمینان سے کہا آؤ ۔۔۔۔ آؤ بیٹھو۔۔۔۔ دوسرے اسٹول کی طرف اشارہ کیا اور ٹیلی فون پر بات کرنے لگی۔

"اب دیکھو بی بی ۔۔۔۔" میری کزن زرینہ نے ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر کہا ۔۔۔۔ "میں ڈاکٹر ہوں۔ برسہا برس میں نے سینکڑوں ڈیلیوری کیس کئے ہیں۔ طرح طرح کے آپریشن کرنے کی عادی ہوں۔ انسانی اناٹومی میرے لئے کسی نفسیاتی کمپلکس COMPLEX کی حیثیت نہیں رکھتی۔ تم خود غیر ملکی آرٹ اسکولوں کی لائف کلاس میں کام کر چکی ہو۔ اور جانتی ہو کہ انسانی جسم کے متعلق سارا مسئلہ رویے کا ہے۔ ڈاکٹروں کا CLINICAL رویہ، شاعروں، سنگتراشوں اور مصوروں کا جمالیاتی رویہ اور سیدھی سیدھی جنسی اپروچ جس میں صحت مند

اور مریضانہ دونوں رویے شامل ہیں۔ یہ واقعہ کہ راحت نے مجھے غسل خانے میں بلایا۔ اس کی جسمانی نمائش پسندی یعنی EXHIBITONISM کا غماز تھا۔ راحت کو اپنے خوبصورت جسم کا شاید احساس تھا۔

"میں اسٹول پر بیٹھ کر راحت سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور اس نے بڑی ادا سے پھر ریسیور اٹھایا۔"

"تب مجھ پر اچانک ایک اور انکشاف ہوا۔ یہ مستقل فلم کے خواب دیکھنے والی لڑکی شاید اس وقت یہ تصور کر رہی ہے کہ وہ میری لین منرو ہے اور ہالی ووڈ میں اپنے سونے کے ٹب میں وہاں شاید سونے چاندی ہی کے ٹب ہوتے ہیں نا، لیٹی اپنے عالمگیر شہرت رکھنے والے عشاق یا اپنے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر سے گفتگو کر رہی ہے مجھے بے حد رنج ہوا۔ بڑی خجالت محسوس ہوئی۔"

"فون ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔"

"تم کپڑے پہنو ——— میں باہر بیٹھتی ہوں ———" میں نے کہا اور باہر آ گئی راحت ایک بڑی سی تولیہ لپیٹ کر کمرے میں آئی۔ کپڑے پہنے اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی۔

"جب میں اور مجیات ہنی مون کے لئے ساؤتھ آف فرانس گئے تھے۔ وہاں ایک سپیشل فوٹو گرافر نے یہ تصویر کھینچی تھی۔ اس نے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔"

"ساؤتھ آف فرانس ———" عطر کی پھوار اپنی گردن پر ڈالتے ہوئے اس نے آہ بھری۔ کس قدر حسین جگہ ہے۔

درحالانکہ اُس وقت میں راحت کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھی۔ مگر جانے

کیوں۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ طرح طرح کے دل خوش کن جھوٹ بولنے کی بے حد شوقین اور عادی ہے۔ آخر کیوں ــــ؟ ذرا کینے پن سے میں نے دریافت کیا ــــ" یورپ میں کہاں کہاں گئیں؟"

"سارے میں گھومے ــــ" اس میں مبہم محتاط اور محفوظ جواب دیا۔ اوہ۔ میڈی ٹیرینین کی لہریں کس قدر نیلی ہیں۔ میں تو ریویرا کے ساحل پر سنہری دھوپ میں بیٹھی بس سمندر کا نظارہ کیا کرتی تھی۔

"اتنے میں ایک موٹا سا غیر ملکی بغیر دستک دیئے کمرے میں آگیا۔ ہر ہر سگفرڈ فان باخ ــــ راحت نے ملوایا۔ جرمن صوفے پر بیٹھ گیا، اور پسینہ خشک کرنے کے بعد راحت سے پوچھنے لگا۔ کہ اسے یہ کمرہ پسند آیا۔ اور روم سروس کیسی ہے۔ اب وہ تیار ہو کر جرمن کے ساتھ نیچے بال روم میں جانے والی تھی۔ میں دونوں کو خدا حافظ کر کے باہر آگئی۔

"سالِ نو کی شام کو وہ اسی جرمن کے ساتھ ڈھاکہ کلب میں نظر آئی اور لپک کر میرے پاس پہنچی۔ بڑی آپا نے ذرا سرد مہری کا اظہار کیا۔ آپا کے اس روّیے کو اس نے بڑی خوبصورتی سے نظرانداز کر دیا۔ اور ان سے مزید خلوص کے ساتھ ملی۔

"ڈھاکہ میں اس نے سب ملنے والوں پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میری بہت پرانی اور گہری دوست ہے۔ بڑی آپا اس بات سے بہت سٹ پٹا گئی تھیں" راحت نے لوگوں سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بڑی آپا اور بھائی جان سے اس کے خاندانی مراسم ہیں ــــ

"یہ کیا واہیات بات ہے۔" آپا نے کہا ــــ ارسلان احمد کے گھر

والے قدامت پسند لوگ ہیں۔ وہ تمہارے متعلق کیا سوچیں گے کہ تم راحت کا شانی کی دوست ہو ——

"مگر آپا۔ ذرا سوچئے تو —— اس غریب نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اچھی خاصی معقول لڑکی ہے ——"

"معقول لڑکی ہے —— معقول ——" آپا نے بڑے اُلم سے کہا ——

"لیکن میں جانتی تھی کہ راحت اپنے آپ کو بے حد غیر محفوظ محسوس کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود کو ایسے لوگوں سے مماثل کرے جن کے قدم زندگی سے جمے رہیں۔

"صنوبر ہماری پڑوسی تھی۔ مگر راحت اس سے کبھی نہیں ملی۔ ابھی راحت شاہ باغ ہوٹل ہی میں قیام پذیر تھی کہ ایک شام صنوبر گھبرائی ہوئی آپا کے پاس آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اے ہے۔ خیر تو ہے کچھ منہ سے تو بول بچی ——" آپا نے گھبرا کر کہا۔

"تم جانتی ہو آپا ان پتی ورتا عورتوں میں سے ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ اگر شوہر شرابی۔ بدمعاش یا جرائم پیشہ بھی ہو تب بھی بیوی کو مرتے دم تک اس کے ساتھ نباہ کرنا چاہیئے۔ آپا ڈولا آئے اور جنازہ نکلنے والے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں۔ (اور صد افسوس کہ یہ مدرسۂ فکر اب تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے، چنانچہ وہ اصولی طور پر صنوبر کی اس حرکت کو ناپسند کرتی تھیں

کہ وہ اپنا شوہر اور بچہ چھوڑ کر دوسرے آدمی کے گھر آ گئی۔ مگر بہرحال صنوبر ایک بڑی خاموش، شریف طبیعت گھریلو سی لڑکی تھی۔ اس لئے آپا کو اس سے اُنس بھی بہت تھا ــــــ

"صنوبر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ــــــ" وہ چڑیل ــــ وہ ــــ وہ ڈائن ــــــ وہ یہاں بھی آن پہنچی ہے۔

"کون بھئی ــــــ ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"فرحت ــــــ اور کون ــــــ قاسم ایک ہفتے سے گھر سے غائب ہے۔ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ دورے پر شمالی بنگال جا رہا ہے اور ابھی ابھی واجد نے آ کر بتایا کہ جے دیپ پور کے راستے میں لانچ پر جشن ہو رہے ہیں"

"مجھے دفعتاً یاد آیا۔ ان ہی آبی راستوں اور ان ہی جہازوں پر صنوبر قاسم سے چوری چھپے ملا کرتی تھی اور شمشاد غم و غصے اور بے بسی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا ــــــ

"آپا نے آہستہ سے کہا "بیٹا، جس مرد کے ہاتھ میں تمہارے باپ نے تمہارا ہاتھ دیا۔ اسے تو تم بلا قصور ٹھکرا کر چلی آئیں۔ کیا قاسم سے بیاہ کرتے وقت تم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دراصل کس قسم کا انسان ہے ــــــ؟ خود کردہ را علاج نیست بی بی ساب صبر کرو۔

"آپا ــــ میں نے کوفت کے ساتھ کہا۔ صنوبر اور زیادہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی ــــ"

"مجھے تو تمہاری یہ صنوبر کچھ بیوقوف سے دکھتی ہے ــ" آپا نے رنجیدہ آواز

آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

"اسی وقت برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھا کہ واجد سامنے کھڑا ہے ـــــــ"

"یہ کیا باؤلا پن ہے۔ چلو گھر چل کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ بچیاں تم کو یاد کر رہی ہیں۔ اس نے کہا ـــــــ"

"صنوبر نے ذبح ہوتی ہوئی بھیڑ کی طرح نظریں اٹھا کر واجد کو دیکھا۔ واجد نے بڑی دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ سہارا دے کر اسے کرسی سے اٹھایا اور بچوں کی طرح سنبھالتا اور دلاسے دیتا اسے ہمارے احاطے سے باہر لے گیا۔

"آپا نے مغرب کی نماز کے لئے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے گہرا سانس بھر کر کہا۔ اللہ ـــــــ تیری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں۔"

"ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک شام میں باہر گھاس پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ صنوبر نے مہندی کی باڑ پر سے اُچک کر مجھے دیکھا اور پھر چاروں طرف نظر ڈال کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ قریب کی کرسی پر وہ اس طرح بیٹھی جیسے بہت بوڑھے، خستہ جان، تھکے ہارے لوگ بیٹھتے ہیں۔"

"زرینہ ـــــــ" اس نے آہستہ سے کہا ـــــــ "بتاؤ میں اب کیا کروں۔"

"قاسم صاحب واپس آ گئے ـــــــ؟"

"ہاں ـــــــ مگر وہ کہتے ہیں کہ محبت ـــــــ مر چکی ہے ـــــــ محبت مر چکی ہے ـــــــ سنا تم نے زرینہ ـــــــ؟" اس نے جھک کر گھاس کی چند پتیاں اُکھیڑیں۔ پھر انہیں بکھیر دیا۔ محبت جسے ابدی، اور زندۂ جاوید کہا جاتا ہے،

شیلانگ ہیں ــــ اس نے مشرق کے گلرنگ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ اس نے کیا کیا کچھ مجھ سے کہا تھا کیسے کیسے وعدے کئے تھے اور اب ــ اب ان سارے لطیف احساسات کا، سارے خوابوں کا، اس ازلی اور ابدی محبت کا جنازہ نکل گیا ــــ زرینہ،

" میں خاموش رہی ۔ میں اس سے کیا کہہ سکتی تھی ۔ درختوں میں ایک پپیہا زور، زور سے بول رہا تھا ۔ آم کے جھنڈ میں کوئل کوک رہی تھی ۔ ارے پپیہا باور آدھی رات جن کوک ۔ دھیرے دھیرے سلگتی سو تو نے دینی پھونک ۔ مجھے جھرجھری سی آئی اور میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ۔

" دفعتاً سفید غرارے قمیص میں ملبوس، سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے اپاکی حبلاب نیم تاریک برآمدے میں نظر آئی ۔ انھوں نے آواز دی ۔ صنوبر ــــ دونوں وقت مل رہے ہیں سر ڈھکو اور اللہ سے دعا مانگو ۔ وہ اندھیرے میں غائب ہو گئیں ۔ گھمن گھیری، شام کا سناٹا ڈراؤنا ہو گیا ۔

" زرینہ ــــ صنوبر مدہم لیکن مضبوط آواز میں کہہ رہی تھی ۔ تمہارا خیال ہے مجھے مرجانا چاہیئے ــــ ؟ کیونکہ میں محبت تھی "

" بکواس مت کرو ــــ " میں نے غیر یقینی لہجے میں جواب دیا ۔

" زرینہ ــــ وہ کہتا ہے کہ فرحت اس کے لئے مکمل عورت ہے ۔ برسوں پہلے ــــ کلکتے میں وہ اس کی مکمل عورت کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی ۔ اور اب جب وہ اسے دوبارہ مل گئی ہے تو وہ اسے پہلے کی مانند ترک نہیں کر سکتا "

"پھر اس نے تمہارا گھر برباد کر کے تم سے شادی کیوں کی تھی ——؟" تم نے یہ نہیں پوچھا ——

"وہ کہتا ہے کہ وہ وقت کی بات تھی ——" وہ تلخی سے ہنسی وقت کی بات! زرینہ اس وقت میں دوسرے کے کھیت گائے —— نہیں —— گھاس —— تھی —— جو ہمیشہ دور سے زیادہ ہری نظر آتی ہے —— وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"مگر فرحت یہاں آئی کس طرح ہے ——؟"

"اس کا میاں، سروپ کمار اپنی نئی لیڈنگ لیڈی سے عشق کرنے میں مصروف ہے اور دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کی زیادہ پرواہ نہیں رہی۔ مگر یہ عورت بے حد سمجھ دار ہے۔ اس نے وہ سارا روپیہ جو اسے سروپ کمار نے دیا تھا "بیک ڈور" سے یہاں منتقل کروا لیا ہے۔ اور —— اور —— اللہ —— یہ سب کس قدر خوفناک گھٹیا باتیں ہیں —— دنیا اتنی گھٹیا کیوں ہے زرینہ ——؟"

"اس سوال کا جواب تو بڑے بڑے فلسفی اور پیغمبر بھی نہیں دے سکے" میں نے ذرا اکتا کر جواب دیا۔ قاسم کو رتی بھر احساس نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ زرینہ۔ انسانی جسم کی موت ایک کیمیکل ایکشن ہے۔ کیا محبت کی موت بھی ایک کیمیکل ایکشن ہے۔

"ہاں۔ انسان میں کیمیکل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جذبات بھی بدل جاتے ہیں ——"

"اب فرحت اور قاسم بالکل ایک جان اور دو قالب ہیں ——" بتاؤ میں کیا کروں ——؟

"اگر واقعی ایسا ہے تو تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ صنوبر تم ایک مرد اور ایک عورت کے مابین ان کے خالص ذاتی، جذباتی معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتیں۔"

"ایک مرد —— ایک مرد ——؟" اس نے انتہائی کرب سے دہرایا

وہ میرا شوہر ہے نرمیہ —

"آسمان پر بادل اُمنڈ کر گھر آئے۔" بارش آنے والی ہے۔ صنوبر اب گھر جاؤ —— میں نے کہا۔

"میرا گھر —— کہاں ہے ——؟"

"آخر قاسم صاحب تم سے کہتے کیا ہیں ——؟"

"کچھ نہیں۔ وہ بات ہی نہیں کرتے۔ آج انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اب ہم دونوں کا اکٹھا رہنا ہم دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ میں —— میں کل ارمنی ٹولہ میں ایک بزرگ کے یہاں بھی گئی تھی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔ "انہوں نے ایک نقش دیا ہے"

میں آنکھیں پھاڑ کر صنوبر کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے براؤن بال جھٹک کر اور نیلی آنکھیں جھپکا کر مجھے ملتجیانہ، پُر امید نظروں سے دیکھا —— بتاؤ —— اس کا کوئی فائدہ ہوگا ——؟ مگر آج دوپہر وہ پڑیا واجد کے ہاتھ لگ گئی۔ انہوں نے اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ اور مجھے خوب ڈانٹا۔ سگر میں شاہ صاحب سے دوسرا نقش لا سکتی ہوں ——"

"بادل گرجنے لگے پپیہے کی پی کہاں ' تیز ہو گئی ' صنوبر،" میں نے مضبوطی سے کہا۔ "گھر جاؤ ——"

" یہ عورت ——— یہ عورت ——— کیا اسے بمبئی میں عشاق کی کمی تھی۔ یہ میرا گھر برباد کرنے کیوں آگئی ——— ؟" اللہ کے یہاں کوئی انصاف نہیں۔ انصاف کے کیا معنی جب کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تمہارے ان خداوند تعالیٰ کا ——— وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اور اٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنی کوٹھی کی طرف چلی گئی۔

" صبح کو آپا کی ملازمہ نے بتایا کہ برابر والی بیگم صاحب کہیں باہر جا رہی ہیں واجد صاحب کی کار پہ سامان لد رہا ہے "

" کوئی گیارہ بجے کے قریب واجد نے مجھے فون کیا۔ وہ ایرپورٹ سے بول رہا تھا۔ اس نے کہا صنوبر کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے۔ میں اسے تبدیل آب وہوا کے لئے اپنے ساتھ کاکس بازار لے جا رہا ہوں۔ قاسم کل رات ایک ماہ کے لئے کچھر دورے پر چلا گیا ہے۔ اگر وہ واپس آکر تم سے صنوبر کے متعلق دریافت کرے تو اسے بتا دینا کہ صنوبر اب میری ذمہ داری ہے۔ خدا حافظ!"

" لیکن قاسم سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ اس رات لکھنؤ سے تار آیا۔ ابا میاں سخت بیمار ہیں۔ میں اور آپا بدحواس ہو کر تیسرے دن لکھنؤ روانہ ہو گئے ایک ڈیڑھ مہینے میں ابا میاں اچھے ہوئے تو ڈھاکے سے ارسلان کی والدہ نے تقریباً روزانہ ٹرنک کال شروع کر دیئے۔ کہ کم از کم منگنی کی رسم باقاعدہ ادا ہو جانی اشد ضروری ہے۔ ان کو ڈر تھا کہ میں شاید رسی تڑا کر بھاگ نکلی ہوں اور اب لکھنؤ سے ڈھاکے واپس جانے پہ تیار نہ ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ ابا میاں کی بیماری اور صنوبر وغیرہ کی انتہائی کنفیوزڈ اور بے تکی زندگیوں کا مرقع دیکھنے کے بعد بھیا جی نے ہڑبڑا کر ہاں کر دی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ اپنے اس فیصلے سے بے حد

بے حد خوش ہوں)

"چنانچہ میں آپا کے ساتھ ڈھاکے لوٹ آئی۔ ارسلان احمد کے ساتھ باضابطہ منگنی کی رسم ادا ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

"ارسلان احمد کی سب سے بڑی بہن جہاں آرا آپا کے میاں بھی اسٹیمر کمپنی میں ملازم ہیں۔ انہوں نے مجھے آپا اور بھائی جان کو اپنے یہاں فنچو گنج مدعو کیا۔ میرے سسرال والے بڑے سیدھے سادے اور نیک طینت لوگ ہیں اور بے حد خوش باش۔ پروگرام یہ تھا کہ جہاں آرا آپا کے یہاں تین چار روز تک ہاؤس پارٹی منائی جائے گی۔ وہاں ارسلان کی ساری بہنیں بہنوئی بھائی اور بھاوجیں جمع ہونے والے تھے اور میرا مارے نروس نس کے مارے برا حال —— مگر خیر ——

"تو ہم سب تمہاری پسندیدہ جگہ فنچو گنج پہنچے۔ واقعی بڑا افسانوی ماحول تھا دور دور تک بکھرے ہوئے لکڑی کے بنگلے۔ دریا کے کنارے کنارے بنے ہوئے پیگوڈا ایسے مکان اور بقول تمہارے سخت چینی اور برمی قسم کی فضائیں۔

"صبح کو سارا قبیلہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا اور بڑا غل مچ رہا تھا کہ جہاں آرا آپا کی لاڈلی ٹین ایج لڑکی شمس آرا بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بولی —— امی —— پندرہ نمبر میں انڈیا سے "مرزا غالب" کے ریکارڈ آئے ہیں۔ چلیئے جلدی سے چل کر ان کو ٹیپ کر لیں۔ چلئے —— اٹھئے —— اور کھٹ کر ان کی سرخ کنارے والی سفید ساری کا آنچل گھسیٹنے لگی۔

"اے ہے بچی ——" جہاں آرا آپا نے اس سے کہا۔ تمہاری نئی ممانی دلہن تمہارے لئے ہندوستان سے ڈھیروں ریکارڈ لے آئیں گی۔ ایسی گھبراہٹ

کیا ہے۔

میں شرم سے سرخ ہو گئی اور مرڑبڑا کر دولہا بھائی یعنی جہاں آرا آپا کے شوہر سے دریافت کیا۔ پندرہ نمبر میں کون رہتا ہے ——— ؟"

"قاسم علوی ———" انہوں نے مختصر جواب دیا۔ میں چپکی ہو رہی ———

"نہیں ——— ہم تو ثریا کے گانے ابھی ٹیپ کریں گے۔ قاسم صاحب کل شاید چلے جائیں ——— شمس آرا نے ضد جاری رکھی۔

"چنانچہ دولہا بھائی نے قاسم کو ٹیلی فون کیا کہ رات کے کھانے کے ہم سب ان کے یہاں دھاوا بول لیں گے۔"

"بی بی ——— وہ رات بڑی عجیب سی تھی۔ نجانے کیوں میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں صنوبر کے ساتھ غداری کر رہی ہوں۔ سارے سامان مجھ سے بار بار پوچھتے کہ تم خاموش کیوں ہو۔ مگر میں کوئی جواب نہیں دیتی۔ کھانے کے بعد ٹیپ ریکارڈ سنبھال کر شمس آرا سب سے پہلے اسٹیشن ویگن میں جا بیٹھی اور سارا کنبہ جیپ اور اسٹیشن میں لد کر "پندرہ نمبر" پہنچا۔

"بے حد طویل وعریض جگمگاتی لکڑی کے بنگلہ پر خاموشی طاری تھی۔ ہم لوگ برآمدے اور گیلری عبور کر کے اندر گئے۔ جہاں ایک بے انتہا وسیع ڈرائنگ روم کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔"

"چند منٹ بعد قاسم اور فرحت مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ میں چونک اٹھی۔ بالکل اسی انداز سے قاسم صنوبر کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔"

"فرحت مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے میرے پاس آئی۔ میں ڈھاکے اس سے کئی بار راحت کے ساتھ مل چکی تھی۔"

"راحت کہاں ہیں آج کل ——؟" میں نے کھلی آواز میں سوال کیا۔

"بمبئی گئی ہے۔ لیکن اس سے شادی ہونے والی ہے۔"

"اچھا —— ہر سگنر ڈنان باغ سے؟"

"ارے نہیں —— ایک بے حد سویٹ کینیڈین ہے۔ چارلس فریزر۔ وہ راحت کو بہت دن سے کورٹ کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں مانتی تھی کیونکہ وطن چھوڑ کر سات سمندر پار جا بسنا کیا تک ہے۔ پھر اس نے مہمانوں کی خاطر مدارات شروع کی۔ وسیع اونچی چھت والا کمرہ باتوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ پھر شمس آرا نے ثریا کے تازہ ترین ریکارڈ جو فرحت بمبئی سے لائی تھی۔ ریڈیو گرام پہ لگائے اور ان کو ٹیپ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد میرے پیارے بنگالی سسرال والوں نے بنگالی گیت گائے۔ غرضیکہ بڑی تفریح رہی بقول شخصے ——"

"چلتے وقت دولہا بھائی نے فرحت سے کہا —— "شب بخیر" بیگم قاسم۔

"اس نے اطمینان سے جواب دیا —— میں مسز سروپ کمار ہوں۔ تشریف آوری کا دلی شکریہ —— اور مسکرا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہماری بڑی آپا اور بھائی جان کی طرح بھائی بھی پرانی اقدار کے آدمی ہیں — بے چارے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جھینپ کر نظریں نیچی کئے آگے بڑھ گئے۔

"بی بی، جس وقت ہم سب اس وسیع گہرے کمرے میں بیٹھے تھے اور ثریا کی آواز ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے، کی تکرار کر رہی تھی —— تب

دفعتاً ایسا ہوا ــــــ آوازوں کے باوجود سناٹا چھا گیا ــــــ اور ایسا لگا جیسے وجود کی ساری اِسٹ پشیمانی اور لغویت اور خستگی اور بے معنی پن اور بے رحمی دریا پر بکھرے کہرے کے ریلے کے ساتھ کمرے میں گھس آئی ہے اور ایسا لگا جیسے ــــ جیسے وقت سن رہا ہے ــــــ میں ــــــ میں وضاحت نہیں کرسکتی کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ مگر تم سمجھ گئیں نا ــــــ؟"

دور جنگلوں میں گولیاں چلنے کی آواز آئی ۔ میں نے چونک کر زرینہ کو دیکھا "سرحد یہاں سے بہت قریب ہے ۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا ــــ اور پھر کہانی شروع کردی ۔

"شادی کے بعد میں اور ارسلان ایک شام ڈھاکہ کلب میں بیٹھے تھے ــــــ اور میں سوچ رہی تھی ۔ کہ کپلنگ کی قوم سے ترکے میں حاصل کیا ہوا یہ انیسویں صدی کا برطانوی اپر کلاس انسٹی ٹیوشن برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں پرانی اسلوب دیکھو رکھنے کے علاوہ نئے دولت مند طبقے کی ایسی چوپال بن چکا ہے ۔ جہاں سیاست، ہائی فنانس اور دل کے سودے کس دھڑلے سے ہوتے ہیں ۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ راحت ائیر فورس کے افسروں کے جمگھٹے میں کھڑی چہک رہی ہے ۔ مگر وہ بارہ تیرہ برس قبل والی راحت تھی ۔ جسے میں نے کلکتہ میں دیکھا تھا ۔

"مس عصمت کا ثانی ــــــ" کوئی کہہ رہا تھا ۔

"عصمت بی بی یے چادری، کسی اور نے زیر لب کہا ۔

"میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں ۔ ایک ونگ کمانڈر نے تعارف کرادیا ۔

عصمت کاشانی ——— ابھی کرنٹھا سے بی۔ اے کرکے آئی ہیں۔ راحت اور فرحت کی چھوٹی بہن ——— عصمت نے بڑی تمکنت و غرور سے سلام کیا۔ اس میں راحت اور فرحت جیسی ملنساری اور اخلاق نہیں تھا۔ اسے ان صفات کی شدید ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بے پناہ حسن کی مالک تھی۔ جو زندگی میں اس کی کامیابی کا ضامن تھا۔ میں نے ایک لحظے کے لئے پھر ان عجیب وغریب بہنوں کے پر اسرار پس منظر کا تصوّر کیا۔ خانہ بدوشوں کے کارواں۔ سرد چشمے، سیب اور بادام کے جھنڈ۔"

"اسی وقت فرحت بھی آکر اس گروہ میں شامل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اور ارسلان وہاں سے کھسک آئے

"ارسلان کا تبادلہ سلہٹ کا ہوگیا ——— اور ہاں جانتی ہو ہماری ملاقات جب ہم اس بنگلہ میں آئے۔ تو سب سے پہلے کس سے ہوئی ——— ؟"

"مسٹر اور مسز واجد ——— !"

"ان کے یہاں ایک لڑکا بھی ہے۔ صنوبر کی ممی حسب معمول شیلانگ سے چند مہینے کے لئے بیٹی داماد کے پاس آجاتی ہیں۔ صنوبر اور واجد کبھی بھولے سے بھی اپنے ماضی کا ذکر نہیں کرتے۔ تم کو شاید یاد ہو کہ واجد وہ ہے۔ جو کلکتا میں راحت کاشانی کا اور بجنیل اور غالباً پہلا عاشق تھا۔ جب وہ وار پبلسٹی کے محکمہ میں کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر واجد نے اس سے شادی نہیں کی تھی اس نے کہا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس کی عزت نہیں کرتا ——— یاد ہے نا ——— ؟"

"ہاں ——— "

"اور میں سمجھتی ہوں ———" زرینہ نے گلا صاف کر کے کہا ——— "کہ یہ دونوں یعنی صنوبر اور واجد، اپنی زندگی سے میرا مطلب ہے کہ کافی مطمئن ہیں۔

"کوئی چار مہینے کی بات ہے۔ میں ڈھاکہ گئی ہوئی تھی۔ وہاں اب ریسٹوران اور نائٹ کلب کھل گئے ہیں ——— اور ڈھاکہ وہ پہلا سا خوابیدہ، پُرفسوں شہر نہیں رہا۔ بہرحال، تو وہاں ایک دکان سے نکل رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں کہ قصبہ ریسٹوران کے سامنے ایک چمکدار تھنڈربرڈ کھڑی ہے۔ جس کا ہڈ اترا ہوا ہے۔ اور پچھلی سیٹ پر فرحت اور عصمت کاشانی نوابزادیوں کے سے انداز میں بڑے ٹھسے سے بیٹھی ہیں۔ قصبہ کا ویٹر چاء کی کشتی پیش کر رہا ہے اور چند حضرات کار سے لگے ہوئے کھڑے دونوں حسیناؤں سے باتوں میں مصروف ہیں۔

"جگہ کی تنگی کی وجہ سے مجھے ان کی کار سے بالکل سٹ کر نکلنا پڑا تو فرحت نے خاصی بے اعتنائی سے کہا۔

"ہلو زرینہ ———"

"ہلو ——— ہلو ———" میں نے ٹھٹھک کر اس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ قاسم صاحب کیسے ہیں (کیونکہ میں نے سنا تھا کہ قاسم نے صنوبر کو طلاق دینے کے بعد فرحت سے، جو سروپ کمار سے طلاق لے چکی ہے۔ باقاعدہ شادی کرلی ہے)

جس پر فرحت نے انتہائی سرد مہری سے جواب دیا ——— مجھے معلوم نہیں۔

"یقین جانو میں بے حد قائل ہوئی ——— اور اپنی بیوقوفی کا کامل یقین ہو گیا جب میں تیزی سے سڑک عبور کر کے اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی تو قصبہ میں سے نکلنے والے دو نوجوانوں کے دو فقرے میرے کان میں پڑے :۔

"سونا کھودنے والیاں ـــــ" اور پلپ کے سیکٹر

"اور تب دفعتاً مجھ پر انکشاف ہوا۔ تمہارا اور میرا محبوب، خوابیدہ، مرنجاں مرنج، سیدھا سادا، غریب، شریف ـــــ بھولا بھالا، پروانشل ڈھاکہ اب ایک ماڈرن، صنعتی، سوفیسٹی کیٹیڈ SOPHISTICATED بڑا شہر بن چکا ہے اور اس حیرت انگیز قلب ماہیت کی ایک علامت، یہ چمکیلی تھنڈر برڈ بھی ہے جو قصبہ ریسٹوراں کے سامنے کھڑی ہے ـــــ لیکن ـــــ" اس نے توقف کے بعد کہا ـــــ "ملک کی اس خوش آئند ترقی کے ساتھ یہ شاخسانے ناگزیر ہیں۔ ہمیں اس چمکدار تھنڈر برڈ کو بھی غالباً قبول کرنا ہوگا۔"

شہرزاد کی پرچھائیں ساکت ہو گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آتشدان کے شعلے مدھم پڑ گئے۔ کمرا میں اب صرف دیوار پر لگا ہوا الیکٹرک کلاک روشن تھا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کلاک کا روشن چہرہ جو صرف وقت بتاتا رہتا ہے۔ بے رحمی۔ بے تعلقی، بے نیازی کے ساتھ اس کو ذرہ بھر پرواہ نہیں کہ سارے وقت تم پر کیا بیت رہی ہے ـــــ؟

"چنانچہ بی بی ـــــ" میں نے کچھ دیر بعد کہا ـــــ "یہ تمہارے یہاں کی زندگی ہے ـــــ"

"ہاں ـــــ مگر ایک قسم کی زندگی اور بھی ہے ـــــ" شہرزاد کی پرچھائیں نے کہا ـــــ

"جس کو میں اس سرزمین پر سالہے ہیں کھوجتی پھرتی ہوں۔ وہ چاروں طرف بکھری نظر آجاتی ہے۔ جس کو میں لکھے ہوئے الفاظ اور سلولائیڈ کی ریل کی گرفت

میں لانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ زندگی اتنی زخمی۔ اتنی گمبھیر، اتنی وسیع و عظیم ہے۔"

"——— کہ اس کی عکاسی اور ترجمانی کے لئے دل و جگر کا خون کرنا ہوگا۔"

شہرزاد کی پرچھائیں نے میری بات کاٹی ——— پھر بھی کامیابی مشکل ہے ——— یہ میرا قلم ———" میں نے اسکرپٹ پر رکھے ہوئے فاؤنٹن پن کو تاسف سے دیکھا۔

"کتنا کمزور اور ناکافی اور بے معنی اور مجبور ہے۔"

اچانک سامنے کے برآمدے میں بندھے ہوئے السیشن نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو ——— میں دیکھتی ہوں ———" میں نے قریب کے فلور لیمپ کا سوئچ دبایا۔ شہرزاد کی پرچھائیں غائب ہوگئیں۔ زرینہ کمرے کی لمبائی عبور کر کے دریچہ میں آگئی۔ میں نے اس کے پیچھے پیچھے جا کر دریچہ کا پردہ سرکایا اور باہر جھانکا۔ جھلملاتے عنابی فرش والے چوڑے برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے کتا بے تحاشا چلا رہا تھا۔

سامنے پھیکی چاندنی میں دو سائے گھاس پر سے گزرتے آہستہ آہستہ بنگلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک لحظہ کے لئے میں اور زرینہ سہم کر رہ گئے۔ ارسلان بھائی آنکھیں ملتے اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ پرچھائیں سیڑھیوں پر آکر سرنگوں بیٹھ گئیں۔

ارسلان بھائی نے ڈپٹ کر کتے کو چپ کرایا۔ سیڑھی پر خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ زرینہ نے مجھے آواز دی۔

"میرا بیگ ——— جلدی ——— میرے کمرے کی کھڑکی میں ——— "میں

نے برآمدے کی روشنی جلائی اور سائے ایک مرد اور ایک عورت میں تبدیل ہو گئے۔ بھورے رنگ کی شکستہ لوئی میں لپٹا ہوا نوجوان تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ لڑکی جس نے گھونگھٹ میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ارسلان بھائی کو دیکھ کر بام کے گملے کے پیچھے دبک گئی۔ ارسلان بھائی نے جھک کر اجنبی نوجوان کو غور سے دیکھا اور دفعتہً سوال کیا ۔۔۔ "کہاں سے آئے ہو ۔۔۔؟"

وہ خاموش رہا اور دہشت زدہ نظروں سے ارسلان بھائی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بے حد سہم کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے زرینہ کا میڈیکل بیگ لا کر دیا۔ بنگلے کا چوکیدار کھٹ کھٹ ڈنڈا بجاتا باغ کے اندھیرے میں سے نمودار ہوا۔ زرینہ نے نوجوان کی ٹانگ کا معائنہ کیا ۔۔۔ "شکر ہے گولی نہیں لگی۔ چوٹ کسی اور وجہ سے آئی ہے ۔۔۔" زرینہ نے کہا پھر اس نے لڑکی کو مخاطب کیا ۔۔۔ "لو اپنے آدمی کو ادھر لٹا دیا ۔۔۔" شاگرد پیشے کی طرف سے دو تین ملازم دوڑتے ہوئے آن پہنچے۔ لڑکی نے گھبرا کر چہرہ اچھی طرح چھپا لیا۔ "اگر تم اس طرح منہ چھپائے رکھو گی تو کیسے کام چلے گا۔ لو ادھر سے اس کی ٹانگ پکڑ لو ۔۔۔ ذرا شاباش ۔۔۔"

زرینہ مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار بات کی ۔۔۔ "ای پج جیبن بیگم صاحب ۔۔۔؟"

زرینہ نے چونک کر اسے دیکھا ۔۔۔ "پاربتی ۔۔۔!!!"

پاربتی نے آگے کھسک کر زرینہ کے پاؤں پکڑنا چاہے۔

"گڈ گاڈ ۔۔۔ وی آر آن فار ٹربل ۔۔۔" زرینہ نے پیچھے ہٹ کر انجکشن

کی سرنج نکالتے ہوئے کہا۔

ارسلان بھائی نے سگریٹ سلگایا۔ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے پہنے سیڑھیاں پھلانگ کر جیپ میں جا بیٹھے ——— "زرینہ یہ بارڈر ان سی ڈنٹ ہے۔ احتیاط سے کام لو۔ میں تحقیقات کے لئے جاتا ہوں ———" دوسرے لمحے جیپ ٹیلے کی ڈھلوان اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد احاطے کا دوسرا پھاٹک ہیڈ لیمپوں کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ پولیس جیپ زناٹے سے اگر رکی۔ سب انسپکٹر نے اُتر کر زرینہ کو سیلوٹ کیا۔ اور غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے والے بھارتی مسلمان مسمی غفورالرحمٰن میاں کو حوالۂ پولیس کرنے کا مطالبہ کیا۔

"صاحب ابھی بارڈر پر گئے ہیں۔ ان کے آنے کا انتظار کیجئے ——— زرینہ نے جواب دیا ———

اجنبی نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑایا۔ سپاہی اور کانسٹیبل جیپ سے اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر دوسرا سوال کیا ——— "بیگم صاحبہ۔ رام پرشاد ہیڈ چوکیدار کی لڑکی یہاں آئی ہے ——— ؟ یہ اغوا کا کیس بھی ہے بیگم صاحبہ ———"

پاربتی نے لرز کر زرینہ کی ساری کا پلو پکڑ لیا۔ اور اس کے پیچھے چھپ گئی۔

"تھانیدار صاحب ———" زرینہ نے بھویں اٹھا کر پوچھا ——— "اگر یہ اس ملک کا باشندہ نہیں ہے تو آپ اس پر اغوا کا مقدمہ کس طرح چلائیں گے ——— ؟"

"خدا کے لئے زرینہ ———" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم اپنا قانون مت چھانٹو۔ تم کو کیا معلوم قانونی پوزیشن کیا ہے ——— ؟"

"بکواس ــــ" زرینہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا ــــ "بہرحال ــــ" اس نے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا ــــ "صاحب کا انتظار کیجئے ــــ"

اب پو پھٹنے والی تھی۔ سپاہی برآمدے کے نیچے بجلی کی روشنی میں ارسلان بھائی کی واپسی کے منتظر رہے۔ اور زرینہ کے ملازموں سے باتیں کرنے لگے۔ سب انسپکٹر نے ٹہلتے ہوئے دور جاکر سگریٹ جلایا اور سگریٹ ختم کرنے کے بعد واپس آکر اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ ایک ملازم نے گرم چاء لاکر زخمی کو پلائی۔ جو نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑایا ــ کیا پاربتی اس کے قدموں کے نزدیک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ زرینہ نے اس سے سارا واقعہ پوچھنے کی کوشش کی ــــ مگر وہ بالکل خاموش رہی۔

سورج نکلتے نکلتے ارسلان بھائی واپس آئے

سب انسپکٹر نے اُن سے آہستہ آہستہ مفصل بات کی۔ ارسلان بھائی سر جھوڑائے تیوری پر بل ڈالے غور سے سنتے رہے۔ پھر زخمی کو جیپ پر بٹھایا گیا۔ چلتے وقت اس نے زرینہ کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے کہتا ہو۔ انسان دوست خاتون! آخر تم نے بھی میرے ساتھ دغا کی نا ــــ دوسری جیپ پر پاربتی کو زبردستی چڑھایا گیا تو وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ اس نے مڑکر زرینہ کو دیکھا بھی نہیں۔ دونوں گاڑیاں پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

اب بنگلے کے عقب میں زرینہ کی ہری بھری وسیع سبزی باڑی میں مرغ نے اذان دی۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں واپس آئے۔ بیرے نے جھلملاتی ہوئی چاندی کی کشتی میں سیجے کو ئین این ٹی سیٹ اور اسپوڈ چائنا میں چاء لاکر سامنے رکھی۔ سویرا ہوگیا۔ سامنے دریا کے پانی میں دھلے اُجالے نے چاء کے باغ آہستہ آہستہ

روشن کردیئے۔

صبح دس بجے سری منگل سے اکرم خاں کیمرا مین کا فون آیا کہ وہ کراچی سے آگیا ہے اور ٹی گارڈن کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

اس کے آنے کے بعد میں اور زرینہ اسے ساتھ لے کر نزدیک کی مختصر سی ائیر فیلڈ پر گئے۔ جہاں مختصر سا طیارہ منتظر کھڑا تھا۔ خوش اخلاق پنجابی پائلٹ نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ طیارہ اوپر اٹھا۔

بڑا شگفتہ سہانا دن تھا۔ نیز نیلے آسمان پر رنگ برنگ پرندے ہوا کی لہروں میں تیر رہے تھے۔ حد نظر تک سبزہ پھیلا تھا۔ نیلے پانیوں میں گھرے ناریل، سپاری اور تاڑ کے درختوں کے جزیروں پر سفید بگلے اور چیلیں منڈلا رہے تھے۔ جگہ جگہ ہرے بھرے گاؤں کے جھونپڑوں پر زرد سرخ اور کاسنی پھولوں کی بیلیں لہلہا رہی تھیں۔ جھیلوں میں سرخ کنول کھلے تھے۔ نالوں میں نیلوفر اور سوسن جگمگاتے تھے۔ ندیوں میں نو کے چل رہے تھے۔ آخر ہم کاہے کی لوکیشن تلاش کر رہے ہیں ــــ؟

اکرم خاں وقتاً فوقتاً جھک کر کیمرا چلا دیتا۔ پیچدار پہاڑی راستے کے کنارے ایک وائرلیس والی جیپ کھڑی تھی۔ کچھ فاصلہ پر چند فوجی ٹہل رہے تھے ــــ "کل رات یہاں ایک معمولی ان سی ڈنٹ ہوا تھا ــــ" پائلٹ نے بشاشت سے مطلع کیا۔

اب ہم دریا کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ نیچے پانی کی جگمگاتی سطح پر بھیرب بازار پاکستان سے اگرتلہ ہندوستان کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر رواں تھے۔ اگرتلہ سے بھیرب بازار کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر آ رہے تھے۔

"آسام اور ایسٹ پاکستان کے درمیان معاملہ بہت گڑبڑ ہے ـــــ"
پائلٹ نے اظہار خیال کیا ــــ "اتنا قانونی ٹریفک بھی خطرناک اور غیر قانونی تو" اس نے بات پوری ختم کئے بغیر جنوبی سلہٹ کا رُخ کیا۔

"فینچو گنج ـــــ" میں نے کہا۔ زرینہ اور میں نیچے جھانکنے لگے۔ جہاں سرخ چھتوں والے پگوڈا ایسے گھروں کی قطار دریا کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ اکرم خان نے ذرا تعجب سے پوچھا۔ "آخر کیا رکھا ہے۔ ان بیک روڈ جنگلوں میں ـــــ؟"

سلہٹ شہر کے اونچے پل پر ٹریفک کا ہجوم غیر جیوٹیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ شاہ جلالؒ کی سفید درگاہ پر عقیدت مندوں کی مسلسل آمدورفت جاری تھی۔ صحن میں کبوتروں کے جھنڈ بیٹھے تھے۔ ٹین کے مکانوں کے سامنے چٹائیاں اور بید کا فرنیچر بنایا جا رہا تھا۔ بازار میں سڑک کے کنارے سنترے کے ڈھیر لگے تھے۔

تیسرے پہر کو ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ کل ہم گھنے جنگلوں کے اوپر ہیلی کاپٹر میں جائیں گے۔

-

دوسری صبح ہم نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایک بے انتہا خوش منظر کھاسی گاؤں تلاش کر لیا۔ افق پر کام روپ کی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے دوسری جانب چائے گان کے ٹیلے حدِ نظر تک پھیلے تھے۔ تیسری طرف گھنا جنگل تھا۔ جس کے درمیان سے سرحد کی غیر مرئی لکیر گزرتی تھی۔ چائے گان کے سب سے اونچے ٹیلے کی چوٹی پر

کسی اسکاٹش پلانٹر کا اکیلا بنگلہ دور سے نظر آرہا تھا۔

"یہاں مسٹر اور مسز اینگس ڈنکن چالیس سال سے رہ رہے ہیں ——" زرینہ نے مجھے بتایا —— "ذرا سوچو تو چالیس سال۔ انسان کہاں پیدا ہوتا ہے اور کہاں کہاں جاکر اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ گلاسگو سے آکر اینگس اور نورا ڈنکن نے اپنا ماہ عسل اسی بنگلے میں منایا تھا۔ یہیں ان کے تین لڑکے پیدا ہوئے جو جوان ہوکر پچھلی لڑائی میں مارے گئے۔

اب دونوں میاں بیوی پھر تنہا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب روزانہ شام کو برآمدے کے سامنے ندی میں ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی بڑی پر سکون اور خوبصورت شام ہے ——"

دوسرے روز اندھیرا پڑے میں اکرم خاں کے ساتھ شوٹنگ کے متعلق انتظامات کرنے کے لئے رام نندن مکھیا کے گاؤں گئی تو دیکھا کہ تقریباً ساری بستی چوپال میں جمع ہے۔ فیکٹری اور باغوں سے لوٹتے ہوئے مزدور آآ کر برگد کے نیچے اکٹھے ہو رہے تھے۔

"شاید بنیادی جمہوریت کی پنچایت ہو رہی ہے۔ ویلج لیول پر" اکرم خاں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ چند ماہ قبل میں نے بنیادی جمہوریتوں کے متعلق ڈاکو منٹری فلم کا مسالہ جمع کرنے کے لئے صوبہ کے وسطی اضلاع کے دیہات کا دورہ کیا تھا۔ مگر پوربی مزدوروں کا یہ مجمع بنگالی گاؤں کی پنچایت سے مختلف معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے چوپال کے قریب جاکر رام نندن کو آواز دی۔ وہ سر پہ انگوچھا لپیٹتا دوڑا آیا۔

"کوئی تہوار ہے رام نندن ——؟" میں نے دریافت کیا۔

"آج برادری پارٹی کا فیصلہ کرے ہے ——" اس نے متانت سے جواب

دیا۔ اکرم خاں "بچھڑے" تلاش کرنے بستی کے اندر چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پاربتی سر جھکائے آم کے نیچے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کرید رہی تھی۔ اس کا باپ رام پرشاد دوسرے درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں ایک جھونپڑے کی دیوار سے لگی بین کر کر کے بیٹی کو کوسنے میں مصروف تھی۔ پاربتی کے بازوؤں پر نیل پڑے تھے۔ پاربتی کو ایسٹ مین کلر کی اس غنائی ڈوکومنٹری کا ایک اہم کردار بننے والی تھی۔

دوسری صبح میں کھاسی گاؤں کی طرف جا رہی تھی کہ جنگل کے راستے پر غفور الرحمان میاں نظر آ گیا۔ وہ سڑک کے کنارے لوئی اوڑھے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے آلتی پالتی مار کے بیٹھا اور زخمی ٹانگ پھیلا کر زرینہ کی باندھی ہوئی پٹی جو میلی اور ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ بڑے دھیان سے دوبارہ کسنے لگا۔ جیپ اپنے نزدیک رکتی دیکھ کر وہ اس رات کی طرح سہما نہیں بلکہ بڑے استہزا سے مجھے گھورنے لگا۔ اتنے میں کچھ فاصلے پر ایک بادشاہٹ میں سے بارڈر پولیس کا ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ دس بارہ آدمیوں کا گروہ تھا۔ جو ایک کنبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں بوڑھے، بوڑھیاں، بچے اور نوجوان سبھی شامل تھے۔ وہ سب سرحد کے پھاٹک کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ غفور الرحمان میاں ان سب سے پیچھے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اس کے عقب میں ایک اور سپاہی تھا۔

جیپ آگے بڑھی۔ راستے کے دونوں طرف سفید تتریاں اُڑ رہی تھیں۔ جنگل کے اندر سرنگ جیسے گہرے تنہا راستے پر سے اِکّا دُکّا کھاسی عورت گزر جاتی تھی۔ آسمان پر ایک ڈیکوٹا گوہاٹی کی سمت سے آیا اور گڑگڑاتا ہوا کلیشر کی

طرف نکل گیا۔ کیا یہ طیارہ بھی فضا میں دخل اندازی کر رہا ہے؟ انسان ایسی سرزمینوں پر دخل اندازی کر رہے ہیں جن کے لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہیں۔ انسان آپ دوسرے کے جذبات میں، دلوں میں دخل اندازی کر رہے ہیں سرحدوں کے متعلق بھون کس کا فیصلہ کرے گا ــــ؟

"اس رات والے معلمہ کا عقدہ اب تک حل نہیں ہوا۔" رات کو مسٹر اور مسز میلکم مک فرسن کے یہاں کھانے کی میز پر زرینہ نے کہا۔

"غفور الرحمان میاں ــــ" ارسلان بھائی نے چاول کی قاب مسز تھیا مک فرسن کے ہاتھ سے لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ان لاکھوں لوگوں میں سے ہے۔ جو روزی کی تلاش میں پردیس چلے جاتے ہیں۔ رائل نیوی کمیشن کا بیشتر عملہ سلہٹ کے ملاحوں پر مشتمل ہے جن کی قومیت اب ہی پاکستانی ہے۔ غفور الرحمان میاں بھی سلہٹی ملاح ہے اور اپنے اسٹیمر پر آسام سے یہاں آتا رہتا تھا۔ ہمارے اسٹیمر گھاٹ پر اسے پاربتی مل گئی۔ جو ہماری فیکٹری سے برآمد ہونے والی چائے کی پیٹیاں ڈھو کر اسٹیمر تک پر چڑھاتی ہے ــــ"

"پاربتی کا باپ میری اسٹیٹ پر بھی چوکیداری کر چکا ہے۔" میلکم مک فرسن نے سر اٹھا کر مجھے بتایا۔

"پاربتی اور غفور الرحمان میاں ــــ" ارسلان بھائی نے رائی کی شیشی اپنی جگہ پر واپس رکھتے ہوئے کہا ــــ "ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے لگے۔

رواج کے مطابق پاربتی کی بچپن سے کسی شخص سے سگائی ہو چکی ہے۔ جو چاندپور بگان پہ کام کرتا ہے۔ اور اس کے باپ سے دس سال بڑا ہے۔ بہت جلد اس کا گونا بھی ہونے والا تھا۔ پاربتی نے غفور سے کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ آسام یا کلکتہ بھگالے جائے۔ مگر غفور الرحمان میاں نے اس سے کہا کہ وہ اور اس کے ماں باپ اپنے آبائی گاؤں واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس کے ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کو پاکستانی کی حیثیت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے پاربتی کو اپنے آنے کی اطلاع کرا دی اور یہ لڑکی راتوں رات اسے لینے کے لئے بارڈر پر پہنچی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جنگلوں جنگلوں ہوتے دریا پہ پہنچ کر جنوبی سلہٹ چلے جائیں گے۔ جہاں غفور الرحمٰن میاں کا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن بارڈر پر دل آسام سے آنے والوں اور اسمگلروں کی روک تھام کے لئے بے حد چوکس ہو چکا ہے غفور الرحمان میاں کے ساتھ ہی ایک اور قافلہ سرحد کے جنگل میں داخل ہوا تھا۔ تب ہی پولیس کے سپاہیوں نے چند اسمگلروں کے تعاقب میں گولی چلا دی۔ پاربتی اور غفور سرپٹ بھاگے۔ مگر ناکہ بندی کو توڑ کر نکلنا ناممکن تھا۔ بھاگتے میں غفور گھُپ اندھیرے میں کافی بلندی سے کھڈ میں جا گرا۔

"مگر ذرا اس لڑکی کی بہادری اور عقل دیکھیے —— " ارسلان بھائی نے ہیلکم مک فرسن کو مخاطب کیا —— "وہ اسے معلوم تھا کہ گیارہ بجے ہماری فیکٹری کا ٹرک فلاں راستے سے گزرتا ہے۔ وہ غفور کو گھسیٹتی ہوئی سڑک کے موڑ تک لے گئی اور جب ٹرک قریب آیا تو ڈرائیور سے التجا کی۔ وہ ان دونوں کو میرے یہاں پہنچا دے۔ اس وقت تک غفور الرحمان بے ہوش ہو چکا تھا۔ پاربتی یہ بھی

جانتی تھی کہ غفور کو لے کر یہاں آنا بے حد خطرناک ہے۔ لیکن اسے ہماری زرینہ بیگم پر بڑا ناز تھا ـــــــ"

زرینہ نے فوراً ٹپ ٹپ رونا شروع کر دیا۔

"ارے ارے۔ عجیب بیوقوف لڑکی ہے ـــــــ" ارسلان بھائی گھبرا گئے۔

کھانے کے بعد آگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے میں نے ارسلان بھائی سے کہا۔

"ایک بات بتائیے۔ ان گنت انسان سرحد کے دونوں طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ اور باہر کی دنیا میں اس قیامت خیز المیئے پر دھیان دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔ کسی کو احساس نہیں، کہ ان ہزاروں بے خانماں، بھوکے، اسٹیٹ لیس انسانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ جن کو پاکستانی کی حیثیت سے آسام کی اس طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ یہاں آتے ہیں تو ان کو بھارتی کہہ کر پھر واپس دھکیل دیا جاتا ہے اس المناک صورت حال کے ذمے دار وہ خود تو نہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟"

"حکومتوں کے لئے بین الاقوامی قوانین کی پابندی بھی تو کوئی شے ہے۔ تم غالباً خراج کی خواہاں ہو۔ حکومتیں ـــــــ"

میلکم مک فرسن نے کہنا شروع کیا ـــــــ "حکومتیں ـــــــ حکومتیں ـــــــ!"

میں نے چڑ کر ان کی بات کاٹی ـــــــ

"اب ہم ساری دنیا کی بگڑی تو نہیں بنا سکتے۔۔۔" میلکم مک فرسن نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ـــــــ "مصیبت یہ ہے ـــــــ" انہوں نے اپنا پائپ سلگاتے ہوئے اضافہ کیا ـــــــ "کہ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو۔"

"یہ شخص غفور الرحمان میاں، یہ بھوکا ننگا فاقہ کش ملاح اور اس کے فاقہ کش

ماں باپ اور بہن بھائی غالباً صرف اتنا جانتے ہیں کہ ملکوں کے بیچ میں دیواریں کھڑی ہیں۔ مگر دکھ کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ وہ غالباً نہیں جانتے کہ ان گھنے جنگلوں میں آسام کہاں ختم ہوتا ہے اور سلہٹ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اقوام متحدہ میں بیرن کی سرحد کے سلسلے میں، ان کی نمائندگی پاکستان کو کرنی چاہیئے یا ہندوستانی ڈیلی گیشن ان کی ترجمانی کرے گا ـــــ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کا بانس کا جھونپڑا اور اناناس اور دھان کا کھیت سرباندی کے کنارے تھا۔ جہاں پرکھوں کے زمانہ سے وہ رہتے آئے تھے۔ اور اب وہ ان کا نہیں ـــــ پھر غفور الرحمان میاں اسمگلنگ کی طرف بھی راغب ہوجاتا ہے۔"

میلکم مک فرسن نے مجھے ذرا دھیان سے دیکھا۔ "تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو ـــــ"، انہوں نے پائپ کا کش لگا کر کہا ـــــ "مگر اس صورت حال کا کیا علاج ہے ـــــ؟"

"آیئے ـــــ ماہ جونگ کھیلا جائے ـــــ!"

سنتھیا مک فرسن نے شگفتگی سے تجویز کیا۔

کراچی سے میرے "تار" کا جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ دو تین دن بعد میں نے طے کیا کہ شوٹنگ شروع کردینی مناسب ہے۔

صبح سویرے میں نے ساریوں کے بنڈل نکالے۔ دس دس روپے کی رنگ برنگی ساریاں، پگڑیاں اور دھوتیاں اور چاندی کے گہنے جو میں "اداکاروں" کو تحفے کے طور پر دینے کے لئے ڈھاکے سے خرید کر لائی تھی۔ زرینہ نے خود کو گویا کوسٹیوم

ڈیپارٹمنٹ کا انچارج مقرر کیا۔ اکرم خاں مع چپڑاسی کے سازوسامان لے کر سری منگل سے سیدھا لوکیشن پر پہنچنے والا تھا۔ میں اور روزینہ اپنے لوازم کے ساتھ جیپ میں سوار ہونے والے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجتی ۔۔۔ "مسٹر ہربرٹ گنگھم کے فوری آپریشن میں میری مدد کے لئے جلد از جلد ہسپتال پہنچیے ۔۔۔" ٹی اسٹیٹ کا میڈیکل آفیسر گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"او مائی گاڈ ۔۔۔" زرینہ نے مایوسی سے ریسیور رکھا۔

"کیا ہوا ۔۔۔ خیریت ۔۔۔؟"

"ہربرٹ گنگھم ایک نوجوان پلانٹر ہے۔ شاید اپنڈی سائٹیس کا آپریشن ہے۔ تمہاری شوٹنگ مس کرنی پڑے گی ۔۔۔ خدا حافظ ۔۔۔" وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھی اور ہسپتال کی طرف اڑنچھو ہو گئی ۔۔۔

"سیٹ" پر بڑی گہما گہمی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بے شمار دُبلے پتلے فاقہ زدہ بچے چاروں طرف کھڑے حیرت سے تماشہ دیکھ رہے تھے ارسلان بھائی کے چار بگان کے مزدور اور عورتیں جن کو خاص طور پر آج کے دن کے لئے چھٹی دی گئی تھی۔ ڈھول مجیرے سنبھالے کیمرے کے گرد گھیرے کھڑے تھے۔ اور اپنی نئی دھوتیوں اور ساریوں کے بنڈل دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ پھر لڑکیاں ساریاں اور گہنے پہن کر شرماتی ہوئی ایک طرف کو آگو کھڑی ہو گئیں۔

"پارہتی کہاں ہے ۔۔۔؟" میں نے رام نندن سے دریافت کیا۔ وہ چپ رہا۔

"پارہتی کہاں ہے رام نندن ۔۔۔"

"بٹیا ـــــ وہ پیچھے چھپی بیٹھی ہے ـــــ برادری کی اجت کا مالہ ہے بٹیا ـــــ"
اس نے رُکتے ہوئے کہا۔

میں نے پاربتی کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ ایک جھونپڑے کے پچھواڑے تالاب کے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کپڑوں کا بنڈل اسے دیا۔ اس نے سر نہیں اُٹھایا۔

"پاربتی ـــــ دیکھو ـــــ کتنی سندر ساری ہے۔ لال لال ایک دم ہرا بلاؤز۔ اور یہ دیکھو گہنے ـــــ کرن پھول اور طوق ـــــ یہ آئنا کی شیشی ہے۔ تم کپڑے پہن کر آؤ۔ پھر تمہارا سنگھار کریں گے۔"

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا بھی نہیں۔

"پاربتی ـــــ سب باہر ولایت مالوگ تمہرا سینما دیکھیں ـــــ لیو ـــــ"

میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے فکر ہو گئی۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ اچانک رام نندن ڈنڈا لیے اس کے سر پر آ کھڑا ہوا ـــــ جو بٹیا کہت ہیں کرت کا ہے نا ہیں ہے۔ پھر مار کھیئے ـــــ؟" اس نے گرج کر کہا۔

جواب میں میں نے رام نندن کو ڈانٹنا چاہا۔ مگر اتنے میں پاربتی سرعت سے اُٹھی اور بنڈل اٹھا کر ایک جھونپڑے میں گھس گئی جو "گرین روم" کا کام دے رہا تھا۔

جب وہ تیار ہو کر "سیٹ" پر آئی تو اکرم خاں حیرت سے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ـــــ "کیا غضب کا کیمرہ فیس ہے۔" اس نے کیمرے میں جھانک کر کہا اور چہرہ کا فاصلہ ناپنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے ایک پیل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اسکرپٹ نکالا جو چاودیگان کے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر لکھتے لکھتے اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔

تصویر ـــــ آواز، فیڈ اِن

۱۔ کلوز اپ دو پتیاں اور بنگالی لوک دھن ایک کلی سُپر امپوز ٹائٹل

۲۔ چائے کی جھاڑی

۳۔ چائے کا باغ۔ مزدور لڑکیاں

۴۔ لونگ شوٹ۔ جنگل۔ ندی (ماحول تعمیر کرو)

تصویر	آواز
۵۔ فینچو گنج کا پل۔ دریا۔ کشتیاں	چڑیوں کی چہکار۔ پانی کی آواز۔
۶۔ اسٹیمر گھاٹ۔	بھٹیالی گیت۔
۷۔ برم چپال۔ ریلوے اسٹیشن	"چائے کے باغات کی یہ حسین رومان
۸۔ مزدور۔ مسکراتے چہرے	پرور فضائیں جہاں دھرتی کے
۹۔ چائے کی فیکٹری	جیالے بیٹے، دھرتی کے مدھر
۱۰۔ مزدور کام کر رہے ہیں۔	حیات بخش گیت گاتے
۱۱۔ مزدوروں کا لوک ناچ	ہوئے چائے کی پتیاں تیار کرتے
شگفتہ چہرے۔	ہیں۔ اور ـــــ ـــــ ـــــ

ہا! ہا!۔ میں نے کاغذ زمین پر رکھ دیا اور دوربین اٹھا کر سامنے دیکھنے لگی۔ اکرم خاں کو چاہیئے کہ مین شوٹ ساؤ کے جھنڈے شروع کرے۔ میں نے دوربین کا رُخ جنگل کی سمت کیا۔ دُور بل کھاتے راستے پر سے ایک سبز رنگ کی جیپ گزر رہی تھی۔ اور مسز ریٹا فریزر اسے چلا رہی تھیں ـــــ وہ تنہا تھیں۔

سیکوئنس ۲ ـــ گھنا جنگل   چاروں طرف اندھیرے

(ماحول تعمیر کرو) گھنے جنگلوں میں خوبصورت
ایک جیپ گزر رہی ہے باگھ بگھیلے اور ہرن اور
گلوز اپ۔ بندوقیں سنبھالے دور دور سے آئے ہوئے
ہوئے غیر ملکی سیاحوں کے سیلانی اور شکاری ——
مسکراتے چہرے۔

میں نے فوراً دوربین گھاس پر رکھ کر رام نندن کو آواز دی۔ جو نئے کپڑے پہنے ڈھول گلے میں لٹکائے خوش خوش پھر رہا تھا۔

"رام نندن ——" میں نے دوبارہ پکارا۔

"بٹیا ——" وہ دوڑا ہوا آیا۔

"دیکھو ہماری جیپ لے کر سیدھے جاؤ اور میم صاحب کی ہری جیپ کا پیچھا کرو اور ان کو روک کر ہمارا سلام بولو۔ جلدی —— ایک دم ——"

"جی بٹیا ——" رام نندن ترت ڈرائیور سے بات کر کے مسز فریزر کے تعاقب میں ہوا ہو گیا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن رام نندن یا مسز فریزر کا پتہ نہ تھا۔ وقت نکلا جا رہا تھا میں اکرم کی جیپ میں بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔

لیکن گھنے درختوں سے گھری سڑک سنسان پڑی تھی۔ خودرو اودے پھولوں پر سفید تیتریاں اڑ رہی تھیں۔ جھاڑیاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی چہکار سے گونج رہی تھیں۔ مسز فریزر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اتر کر دوربین

کے ذریعے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ راستے کے آگے سے مکمل خاموشی شروع ہوتی تھی۔ اس بلوّرین خاموشی میں، زرد پتوں پر چلتی ہوئی ہم وادی کے سنّاٹے میں داخل ہوگئیں۔ نیچے سڑک پر دو کھاسی نوجوان سائیکلوں پر جا رہے تھے۔ اور سفید گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اچانک میری نظر نشیب کی سمت گئی۔ جہاں بانس کے جھنڈ میں سبز جیپ کھڑی تھی۔ اور مسز فریزر کیمرہ سنبھالے سفید پھولوں سے لدی ہوئی ایک "رُوبی بیڑی" کے تنے سے لگی کھڑی تھیں۔ انہوں نے سُرمئی رنگ کی بے حد چُست پتلون پہن رکھی تھی۔

اتنے میں ایک سیاہ رنگ کی فورڈ کونسل دوسری طرف سے آئی اور واجد چائے کی جھاڑیوں کے نزدیک اُترا۔ شاید وہ معائنہ کرنے آیا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں کاغذات تھے۔ اور تیوری پر بل پڑے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ شکل والا، ذرا جھکا ہوا، طویل القامت آدمی تھا۔ وہ باغ کے سپروائزر سے بات کرنے میں مصروف رہا۔ پھر چند چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا جو بانس کے ڈبوں میں چائے کے بیج کے کیڑے جمع کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ دوسرے باغ کی طرف بڑھا۔ یہاں اس نے ڈھلوان کے پاس کار روک لی اور کاغذات نکالے۔

اچانک اس کی نظر مسز فریزر پر پڑی۔ جو درخت کے نیچے بت بنی کھڑی اُسے آتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لحظہ کے لئے وہ ٹھٹک گیا۔ راحت نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور درخت کے تنے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ واجد چند قدم آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹک گیا اور چند سیکنڈ تک چُپ چاپ کھڑا راحت کو دیکھتا رہا۔ پھر یک لخت

پلٹا... اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کندھے جھکائے کار میں جا بیٹھا اور زناٹے سے پہاڑی کے نیچے اُتر گیا۔

راحت نے آنکھوں پر ہتھیلیاں پھیریں۔ رومال نکال کر چہرہ پونچھا۔ بال پیچھے کو جھٹکائے۔ گہرا سانس لے کر، تن کر کھڑی ہو گئی۔ شانے سیدھے کئے اور آہستہ آہستہ چلتی جیپ میں جا بیٹھی۔ اسی وقت رام نندن کی جیپ اس کے قریب جا پہنچی۔

میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی۔ اور لوکیشن پر واپس آگئیں۔

میرے واپس پہنچنے کے چند منٹ بعد مسز فریزر بھی آگئیں۔ انہوں نے مسکرا کر دور سے ہاتھ ہلایا اور جیپ میں سے کود کر سیٹ پر آگئیں۔

"ہائی ــــــ" انہوں نے کہا۔

"گڈ مارننگ مسز فریزر ــــــ" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مسز فریزر کیا آپ اس منظر میں حصّہ لینا پسند کریں گی ــــــ؟" میں نے ان کو منظر سمجھایا۔

"شیور ــــــ آئی ڈُو لَو ٹو ــــــ!"

"تو آیئے تھوڑی سی ریہرسل کر لیں ــــــ"

"شیور ــــــ"

میں نے کیمرا کے پیچھے جا کر ان کو دیکھا۔ واقعی ان میں غضب کا "اسٹیج سنس" تھا۔ وہ بڑی ادا سے جیپ سے اُتریں۔ مسکرائیں۔ مزدوروں کو دیکھ کر مسرّت کا اظہار کیا۔ گاؤں کی لڑکیوں نے ان کو پھول پیش کئے۔ لوک ناچ کے دوران بے حد ایکسائٹمنٹ کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے تالیاں بجائیں۔ مکمل امریکن

ٹورسٹ ۔۔۔

وہ مجھ سے اور اکرم خاں سے مستقل انگریزی میں گفتگو کرتی رہیں اور مزدوروں سے بہت ٹوٹی پھوٹی امریکن اردو میں ایک آدھ بات کی۔ اکرم خاں نے شوٹنگ شروع کر دی۔

مسز فریزر کی پیشانی پر داہنی طرف پٹی کا کراس بنا ہوا تھا۔ جسے انہوں نے بڑے سلیقے سے بالوں کی سنہری لٹ میں چھپا لیا تھا۔ اکرم خاں نے ان کے اور "اسٹار ڈانسر" پاربتی کے باری باری کئی کلوز اپ لئے۔

اچانک سورج پر بادل آ گئے۔ اکرم خاں نے کندھے اچکا کر ہاتھ پھیلائے اور آسمان کو دیکھا۔ مسز فریزر ہنسنے لگیں۔ پھر وہ ادا سے سر نہوڑا کر اس طرح چلتی ہوئی جیسے پانی پہ رواں ہوں۔ میرے پاس آئیں اور بولیں ۔۔۔ "جی ازنٹ اٹ ایکسائٹنگ ۔۔۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مووی کیمرے کا سامنا کیا ہے ۔۔۔ ازنٹ اٹ فن ۔۔۔"

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو یہ اچھا لگا۔ مسز فریزر۔" میں نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

"ابھی میرا کام باقی ہے ۔۔۔"

"جی ہاں ۔۔۔ تھوڑا سا ۔۔۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔ آپ اسی طرح جیپ میں بیٹھ کر جنگل کے راستے سے گزریے۔ میں نے چپراسی کو ابھی اپنے گھر بھیجا ہے۔ کہ میرے بہنوئی کی بندوق لے آئے ۔۔۔"

"بندوق ۔۔۔ ؟" انہوں نے آنکھیں پھیلا کر مصنوعی طور پہ خوفزدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ـــــ" آپ کا ایک شاٹ بندوق کے ساتھ بھی بہت عمدہ رہے گا۔ باقی "شکاریں" کو ہم کل پرسوں جمع کرلیں گے"

"تو اب میں شکار پر جاؤں گی ـــــ؟ لیکن ابھی تو میں لوک ناچ دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوگا ـــــ؟" مسز فریزیر نے غضب کے بھولپن سے پوچھا۔

"میڈم وہ سب ایڈیٹنگ کے وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی آپ مہربانی سے ذرا جیپ اسٹارٹ کر دیجئے ـــــ" اکرم خاں نے جو ایک اکل کھرا پٹھان تھا۔ ذرا جھنجھلا کر جواب دیا۔ بادل ہٹ گئے تھے۔

"شبوٹ ـــــ"

اکرم خاں نے کیمرہ چلا دیا۔ مگر چند منٹ بعد گہرے بادلوں نے دوبارہ سورج کو ڈھانپ لیا۔

"لنچ بریک ـــــ" اکرم خاں نے آواز دی۔

زرینہ کا ملازم جیپ میں سے کھانے کی ٹوکریاں نکال کر لایا۔ "آئیے مسز فریزیر ـــــ" بیں نے کہا۔

"جی نہیں شکریہ ـــــ میں صبح بہت کافی ناشتہ کرکے چلی تھی اور میں دوپہر کا کھانا کبھی نہیں کھاتی۔ میں اتنی دیر میں چند ضروری خط لکھ لوں۔ جب میری ضرورت ہو۔ مجھے فوراً بلا لیجئے گا ـــــ" مسز فریزیر نے کہا اور تھوڑی دیر جاکر ایک خالی جھونپڑے کے برآمدے میں بیٹھ گئیں اور بیگ سے کاغذ نکال کر لکھنے میں منہمک ہوگئیں۔

تیسرا پہر آگیا۔ سائے طویل ہو گئے۔ دن ڈھلنے لگا۔ مگر آسمان صاف نہیں ہُوا۔ مسز فریزیہ جھونپڑے کے برامدے میں لگاتار سگریٹ پی کر لکھنے اور ایک کتاب پڑھنے میں معروف رہیں۔

"آخر کب تک انتظار کیا جائے ——؟" اکرم خاں نے عاجز آکر کہا۔

"جب تک بادل نہ چھٹیں —— اکرم خاں ——" میں نے جواب دیا۔

"کبھی تو سورج نکلے گا۔"

"اور اگر بالکل نہ نکلا تو ——؟ آج کا دن بالکل بیکار گیا ——"

"جب تک وقت ہمارے ہاتھ میں ہے ہم بادل چھٹنے کا انتظار کریں گے۔"

میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔ وہ ٹہلتا ہُوا گاؤں کی طرف چلا گیا۔

جاڑے کی شام بہت سرعت سے وادی پر چھانے لگی۔ چپراسی بندوق لے کر ابھی نہیں آیا تھا کہ میک اَپ کا وقت آگیا۔ اتنے میں مسٹر میلکم مک فرسن کی کار زناٹے سے آکر سیٹ کے سامنے رُکی۔ اور مسٹر مک فرسن بھاگتے ہوئے، بے حد سراسیمہ میری طرف آئے۔

"مسز فریزر یہاں ہیں ——؟ ان کو اجازت دو کہ میرے ساتھ فوراً چلی چلیں ——" بھاری بھرکم اور متین مسٹر مک فرسن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

مسز فریزیہ۔ جنھوں نے سارا دن جھونپڑے میں بیٹھے بیٹھے گزار دیا تھا۔ مسٹر مک فرسن کی آواز سُن کر ہماری طرف آئیں۔

"بیٹیا —— فوراً میرے ساتھ چلو ——"

"کیا ہوا —— خیریت تو ——؟"

میلکم مک فرسن نے جواب دیئے بغیر مسز فریزر کو گھسیٹ کر کار میں ڈھکیل دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سر نکال کر مجھے آواز دی ——" میں رات کو تمہارے یہاں آؤں گا ——" دوسرے لمحے کار درختوں میں غائب ہو گئی ——

"اداکاروں" کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑیوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ شرماتی لجاتی لڑکیاں منہ میں پلو ٹھونس کر یا کھلکھلا کے ہنستی ہوئی ٹولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ انہوں نے اپنی پھٹی پرانی ساریاں دوبارہ لپیٹ کر اپنی نئی ساریاں کل کی شوٹنگ کے لئے سینت لی تھیں۔ پاربتی ایک درخت کے نیچے بیٹھی اسی طرح چپ چاپ اپنے گہنے اتار رہی تھی —— اور بار بار بے چین، دہشت زدہ نگاہیں اٹھا کر دور جنگل کے راستے کو دیکھ لیتی تھی۔ جس پر اب کہرہ منڈلا رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی نئی ساری اور گہنوں کی پوٹلی بنا کر بغل میں دابی اور پیر کے انگوٹھے سے کنکروں کو ٹھوکریں مارتی مارتی اپنے گاؤں کی طرف چل دی۔

جس وقت ہماری جیپ گاؤں کی ڈھلوان سے اُتر رہی تھی۔ رام نندن دوڑا دوڑا آیا —— "بٹیا —— بٹیا —— اپنے کاغج بھول گئیں —— یہ لیجئے" ——

میں نے رام نندن کے ہاتھ سے ڈوکومنٹری کا فائیل لیا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور کاغذات تھے۔ میں ان کو ترتیب دینے لگی تو ایک اجنبی تحریر دکھائی پڑی۔ میں نے ذرا تعجب سے اس پر سرسری نظر ڈالی۔

سلہٹ ——
۲۳، دسمبر ۱۹۶۰ء

میرے پیارے ابّا جی —— تسلیم ——

راشدہ پھوپھی کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ میں نے اندور کے ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کا انتظام کروادیا ہے۔ آپ کے اپریشن کے لئے فوراً وہاں داخل ہو جائیے۔ میرا دل آپ کو دیکھنے کے لئے تڑپتا ہے اور میں بے حد پریشان ہوں اور جلد آپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔ میں یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں تاکہ شام کی گاڑی سے نکل جائے۔ امّی جان کو میرا دست بستہ آداب کہئیے گا۔ سکینہ اور رابعہ ڈھاکے میں خیریت سے ہیں۔

آپ کی تابعدار بیٹی محمودہ ....

تحریر پر چند آنسو بھی ٹپکے تھے۔ کیونکہ سیاہی ایک آدھ جگہ سے بہہ گئی تھی۔

ساتھ ہی لفافہ تھا:۔

جناب مولوی عبدالصمد صاحب

مکان نمبر ۱۹ متصل مدرسہ عالیہ اسلامیہ

عثمان گنج ۔ ضلع سیہور

سابق بھوپال اسٹیٹ

مدھیہ پردیش —— انڈیا۔

"یہ کہاں سے ملا۔ رام نندن ——؟" میں نے پوچھا۔

"بٹیا اور سارے سے یہ ڈھیر سارے پتے بٹور کر لایا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

جیپ آگے بڑھی۔ وادی میں پہنچتے پہنچتے کہرے کے ایک ریلے نے آلیا اور

بلوچستان کی برف پوش کوہستانی خانقاہ ـــــ خانہ بدوشوں کے سردار کے نذریں تھے اور البُرز کی موسیقی اس کہرے میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔

مجھے بے حد ندامت ہوئی کہ میں نے انجانے میں کسی کا خط کیوں پڑھ لیا۔

لیکن ـــــ محمودہ بنت عبدالصمد ـــــ تم کو اس پیہم خود فریبی، اس فرارِ مسلسل سے کیا حاصل ہُوا ـــــ؟ کچھ تو بتاؤ کچھ تو کہو۔

میں نے خط لفافے میں رکھ کر ڈرائیور سے کہا کہ کرنل مورگن کے بنگلے کی طرف سے ہوتا چلے۔ اور اندر جا کر خط فریدہ یا میم صاحب کو دے دے۔ جو وہ جلدی میں گاؤں کے جھونپڑے میں چھوڑ کر آئی تھیں۔

لیکن کرنل مورگن کا بنگلہ خاموش پڑا تھا۔ وہاں سے معلوم ہُوا کہ سب لوگ ریلوے اسٹیشن گئے ہیں۔

میں نے گھر کے راستے میں شوٹنگ کے متعلق فاضل سمیٹا۔ لیکن ایک ڈوپ شیٹ کے نیچے سے چند اور کاغذ نکلے۔ ایک کاغذ پر بہت سے درخت بنے تھے۔ ایک بڑا درخت اور اس کے سائے میں ایک چھوٹا سا درخت ایک بڑا درخت اور اس کے سائے میں ایک چھوٹا سا درخت ـــــ ایک بڑا درخت۔ ایک اور کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بنی تھیں۔ پانچ چھ مرتبہ دہرایا گیا تھا۔ میں کہاں کہاں سے گزر گئی ـــــ میں کہاں کہاں سے ـــــ

اور اس کے بعد ایک کونے میں لکھا تھا ـــــ

شاید کہ چمن مہکا، شاید کہ بہار آئی دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی

"مسٹر ہربرٹ کننگھم کیسے ہیں ـــــ؟" گھر پہنچتے ہی میں نے نرگس سے

دریافت کیا جو تھکی ماندی اپنی مسہری پر لیٹی تھی۔

"ہربرٹ کا آپریشن ـــــ" زرینہ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔ "اِنڈی سائنٹس کا نہیں تھا ـــــ"

رات کو ہم لوگ ابھی کھانے کی میز پر ہی تھے۔ کہ ہرکارے نے میرے نام تار لاکر دیا۔

"ریفرنس آپ کا تار ـ اگر یہ صورت ہے تو ڈوکو منڈی کینسل کر دیجئے اور واپس آجایئے۔

"ونڈرفل" زرینہ نے کہا ـــــ "اب اتم اطمنان سے چند روز یہاں رہو۔ چھٹی لے کر ـــــ کیا خیال ہے ـــــ؟"

اسی وقت ملازم نے اناؤنس کیا ـــــ "مسٹر مک فرسن صاحب میم صاحب" میلکم اور سنتھیا مک فرسن کرے میں داخل ہوئے۔ میلکم کا چہرہ تنا ہوا تھا۔

"ہربرٹ کا انتقال ہو گیا۔ ڈھاکا ہاسپٹل سے تار آیا ہے" ـــــ انہوں نے تار ارسلان بھائی کی پلیٹ کے نزدیک سرکا دیا۔

اس رات نیم تاریک ڈرائنگ روم کے آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں میلکم نے اس طرح بات کی۔ جیسے ساری زندگی کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہوں۔

"کاش چارلس فریزر صرف ایک گھنٹہ دیر سے آتا ـــــ" سنتھیا مک فرسن نے کہا۔

"یا اینگس اور نورہ اپنا بنگلہ ریٹا فریزر کے حوالہ کر کے ڈھاکا نہ چلے جاتے۔"
مسٹر مک فرسن بولے۔

"مگر ریٹا فریزر تو کرنل مورگن کے یہاں ٹھہری تھیں ——؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر ایڈیتھ مورگن کی ریٹا سے پہلے روز سے نہیں بنی۔ دراصل کرنل کی دوستی چارلس فریزر سے جنگ کے زمانے سے تھی اور وہ محض کرنل سے ملنے کے لئے ہی ڈھاکا سے یہاں آیا تھا ——" سنتھیا مک فرسن نے کہا۔

چارلس کینیڈین ہے —— اور ہر کینیڈین اور امریکن کی مانند اسے بھی 'لوکل کلر' دیکھنے کا خبط ہے۔ وہ اپنے ایک اور پرانے دوست بل مک گریگر سے ملنے چاندپور نگان گیا اور وہاں سے شام کو ہی واپس آگیا۔ کیونکہ بل کو کسی ضروری کام سے چٹاگانگ جانا تھا۔ جب چارلس واپس آیا تو کرنل مورگن نے اس سے کہا کہ وہ اسے نواب یتیم پاشا سے ملانے لے جائیں گے۔ جو آسام کے مغل عہد کے نوابوں کی آخری یادگار ہیں۔ یتیم پاشا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چارلس اور کرنل کے وہاں پہنچنے پر نواب صاحب نے فوراً پروگرام بنایا کہ وہ مہمانوں کو شکار کھلانے سندربن لے جائیں۔ چنانچہ چارلس نے ریٹا کو یہاں فون پر اطلاع دی کہ وہ کئی روز کے لئے سندربن جا رہا ہے۔"

میلکم مک فرسن نے پائپ منہ سے نکال کر راکھ دانی پر کھٹ کھٹایا اور اپنے چارخانہ ٹویڈ کے کوٹ کی جیب میں سے ماچس ڈھونڈ کر نکالی۔ نیا تمباکو بھر کے پائپ جلایا اور چند لمحوں تک شعلوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ تھے۔

"بے چارہ ہربرٹ کننگھم ———" میلکم مک فرسن نے مجھے مخاطب کر کے دوبارہ بات شروع کی۔ "ایک نوجوان انگریز پلانٹر تھا اور حال ہی میں یہاں آیا تھا۔ وہ ایک بڑا جذباتی اور بھولا بھالا سا لڑکا تھا۔ ٹی اسٹیٹ پر اس کی ہم دونوں سے بے حد دوستی ہو گئی اور میں اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگا۔"

میلکم نے بہت آہستہ سے اپنی بھوؤں پر ہاتھ پھیرا۔

"ہربرٹ بہت خوش شکل اور بہت دل پھینک لاابالی قسم کا بیچلر تھا۔"

"تم کو یاد ہے زرینا، چند روز ہوئے ہم دونوں تمہیں کرنل کے یہاں ڈنر پر مدعو کرنے آئے تھے ———؟ اسی رات ہربرٹ کی ملاقات ریٹا سے ہوئی۔

"شام کو شراب کا دور چلا۔ ایڈتھ مورگن اپنی الکحل آسانی سے نہیں سنبھال سکتیں۔ اس رات ان پر دورہ سا پڑ گیا۔ اور انہوں نے اچانک ریٹا فریزر کو طعنے دینے شروع کئے۔ جواباً ریٹا نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ ریٹا ڈرائنگ روم سے غائب تھی اور جب دوبارہ نظر دوڑائی تو ہربرٹ کو بھی موجود نہ پایا۔

"اب سارے مہمانوں پر نشہ چڑھ چکا تھا۔ تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اسکاٹ لوگ بوتل پر عاشق ہیں اور بڑے بڑے پیگوں کو میز کے نیچے پہنچا دیں۔ مگر اس رات تو ریٹا کی وجہ سے عجیب ہلڑ مچ رہا تھا۔"

رات بھیگ چلی تو میں نے میلکم سے گھر چلنے کے لئے کہا۔ کیونکہ میں اسکاٹ تو ہوں مگر ایک کٹر مذہبی پریسبی ٹیرین پادری کی بیٹی بھی ہوں۔ اور مجھے اس طرح کی بے تحاشہ مے نوشی سے دہشت ہوتی ہے چنانچہ میں اور میلکم کرنل اور ایڈتھ کو شب بخیر کہہ کر باہر آ گئے تو کیا دیکھا کہ برآمدے کے نیچے باقاعدہ خوجداری ہو

رہی ہے ـــــــ" سنتھیا مک فرسن نے اپنے شوہر کی بات مکمل کی۔

"اسے ــــــ" ارسلان بھائی نے استعجاب سے کہا۔

"وہاں ریٹا تو نشے میں مسرور تھی۔ دیکھ کھڑی قہقہہ لگا رہی تھی۔ اور چارلس فرزیہ اور بے چارہ ہربرٹ ایک دوسرے کی ٹھکائی میں مصروف تھے۔ اسی وقت سارے مسرور مہمان باہر نکل آئے مگر کسی نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش نہ کی ـــ اور اس منظر سے محظوظ ہوتے رہے۔

"اتنے میں ریٹا نے بیچارے ہربرٹ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تو چارلس نے آگ بگولا ہو کر اسے دھکا دیا اور وہ دور جا پڑی اور اس کی پیشانی میں چوٹ آگئی۔

دوسری صبح سویرے چارلس کرنل کے چھوٹے طیارے کے ذریعہ چاندپور بگان روانہ ہو گیا۔ لیکن شام کو ہی واپس آ پہنچا۔ دوسرے دن کرنل اور چارلس، نواب صاحب بیگم پاشا کے ساتھ سندربن چلے گئے۔

"تم جانتی ہو زرینا ـ بوڑھے انگس اور نورا ڈنکن کتنے شفیق اور پیارے لوگ ہیں۔ وہ دونوں اس رات دعوت میں نہیں آئے تھے۔ کیونکہ انگس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ صبح کو چارلس اور کرنل کے چاندپور بگان چلے جانے کے بعد ایڈیتھ ڈنکنز کے گھر گئیں ـ ان کو مختصراً رات کا واقعہ سنایا اور نورا سے کہا کہ انہیں اعصاب کی شکایت ہے اور وہ تنہا ریٹا کی حسب دل خواہ میزبانی نہ کر سکیں اور ڈنکنز سے مشورہ طلب کیا۔

"اب یہ بڑی آکورڈ صورتِ حال تھی۔ کیونکہ پچھلی رات نشے کی حالت میں

ایڈیتھ بھی ریٹا کو جلی کٹی سنا چکی تھیں اور مار پیٹ اور جھگڑے کے بعد جب مسٹر چارلس اسی طیش کے عالم میں ریٹا کو ہمراہ لئے بغیر اپنی سیاحت اور شکار کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ اب ایڈیتھ کہہ رہی تھیں کہ ان کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔"

جس وقت میکیم مک فرسن بات کر رہے تھے مجھے دفعتاً خیال آیا کہ مادام عرفت ریٹا ان عورتوں میں سے ہے جسے دوسری عورتیں بے طرح ناپسند کرتی ہیں اور مرد جن پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے ہیں۔ زرینہ کے قصے کے مطابق ڈھاکے کی مسز وارنگٹن کے اعصاب بھی خراب ہو گئے تھے۔

میکیم نے بات جاری رکھی ——— "چنانچہ فرشتہ خصال نورا ڈکسن نے کہا کہ وہ دوسرے دن انگس کے میڈیکل چیک اپ کے لئے ڈھاکا جا رہی ہیں۔ اس دوران میں چارلس فرزیہ کی سندربن سے واپسی کے وقت تک ریٹا یقیناً ان کے بنگلہ پر قیام کر سکتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ انگس اور نورا خود ایڈیتھ کے یہاں گئے اور ریٹا کو اپنے یہاں قیام کرنے کے لئے مدعو کیا۔ اور کہا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے ملازمین ریٹا کا پورا خیال رکھیں گے۔ ریٹا بہت خوش ہوئی اور بولی کہ اسے فوٹو گرافی کا خبط ہے اور ان کا خوش منظر بنگلہ اور سامنے کی سبزی اس کے اس شوق کے لئے آئیڈیل ثابت ہو گی۔ چنانچہ ریٹا ڈکسنز کے یہاں منتقل ہو گئی اور اس کے نئے میزبان ڈھاکا روانہ ہو گئے ———"

"اور اب یہ کہنا غیر ضروری ہو گا کہ خواتین کی نرسری گیا رہ بجے کی ماہ جونگ اور کافی پارٹیوں کی گریپ وائن کے ذریعے یہ سارا قصہ کم از کم ایک سو میل کے ریڈیس میں بخیر و خوبی پھیل گیا۔"

سنتھیا مک فرسن نے کہا۔ "تم لوگ اس فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں بہت مصروف تھیں۔ اسی لئے تم تک یہ بات نہ پہنچ سکی۔ تین چار روز ہوئے میں نے مسز مک ڈانلڈ کی کافی پارٹی میں مسز مک گریگر کو یہ بھی کہتے سنا کہ ریٹا فریزیہ امریکن نہیں۔ بلکہ دراصل کیل کتا اینگلو انڈین ہے اور ایڈتھ نے جو تحقیر آمیز رویّہ ریٹا کے ساتھ اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ دراصل یہ بھی تھی کہ ایڈتھ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی گلیمرس مہمان ہاف کاسٹ ہے۔"

"اس پچھلے آٹھ دن میں ہربرٹ مجھ سے فیکٹری میں روزانہ ملتا تھا ——"
میلکم نے کہا —— "وہ اور ریٹا کے لئے دیوانہ ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ذہنی ہیجان ہے اور چارلس کی واپسی پر یہ سارا قصہ آپ سے آپ ختم ہو جائیگا چارلس فریزر کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک بے حد حساس اور زخمی شیر کی مانند بپھر جانے والا انسان ہے اور ریٹا کو بے طرح چاہتا ہے۔"
"چارلس کام کیا کرتا ہے ——؟" ارسلان بھائی نے میلکم کی بات کاٹ کر دریافت کیا ——
"وہ کولمبو میں حکومت سیلون کے لئے کسی نوع کا ایڈوائزر ہے۔ بمبئی میں ریٹا سے ملاقات ہوئی۔ اب کینیڈا واپس جانے سے قبل سارے برصغیر کی سیر کرنے نکلا ہے۔ سلہٹ وہ اپنے پرانے فوجی ساتھی کرنل مورگن سے ملنے آیا تھا۔"
"تم نے ہربرٹ کو سمجھایا نہیں ——؟" ارسلان بھائی نے پوچھا۔
"سمجھایا —— مگر اس پر عشق کا جنون سوار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے زندگی بھر ایسی مکمل عورت نہیں دیکھی۔ ایسی عورت جس کے لئے

WOMAN ALL کی اصطلاح رائج ہے۔"

"مکمل عورت ـــــ" زرینا نے دہرایا۔ قاسم نے بھی صنوبر کو چھوڑتے وقت فرحت کے لئے یہی کہا تھا۔

"اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بے چارے ہربرٹ نے یہ سارا ہفتہ پہاڑی والے بنگلا پر گذارا ـــــ" میلکم مک فرسن نے کہا ـــــ ارسلان بھائی نے آتشدان کی آگ تیز کی۔

"آج صبح ـــــ" میلکم مک فرسن نے سبز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ریٹا بہت سویرے ہی اُٹھ گئی تھی۔ رات اس نے نورا ڈنکن کی آیا سے کہا تھا کہ وہ علی الصبح تصویریں کھینچنے کے لئے باہر جائے گی۔ چنانچہ اس نے صبح اُٹھ کر جلدی سے بریک فاسٹ کیا اور انگیس ڈنکن کی جیپ لے کر کھاسی گاؤں کی طرف نکل گئی۔

"اور آج ہی صبح منہ اندھیرے چارلس اور کرنل سندربن سے واپس آ پہنچے۔ گھر پر ایڈیتھ نے بتایا کہ ریٹا ڈنکنز کے یہاں اُٹھ گئی ہے۔ لہٰذا چارلس سیدھا پہاڑی والے بنگلا پر پہنچا۔

اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ ملازم ابھی شاگرد پیشے ہی میں تھے صرف نورا کی آیا بنگلا پر موجود تھی۔ وہ چارلس کو پہچانتی نہیں تھی۔ چارلس نے اس سے پوچھا کہ ریٹا میم صاحب کا بیڈ روم کدھر ہے۔ آیا نے گھبرا کر مہمان کمرا کی طرف اشارہ کیا۔ چارلس سیدھا ریٹا کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہاں بے چارہ ہربرٹ سو رہا تھا۔

وہی بندوق جسے چارلس فریزر شکار کے لئے سندربن لے گیا تھا۔ اس کے

کندھے سے آویزاں تھی۔

"لیکن عدالت میں وہ یہ بیان دے سکتا ہے کہ سندر بن سے یہاں تک کی پرواز کے دوران میں وہ تھکان دور کرنے کے لئے متواتر شراب پیتا رہا تھا اور اس کے ہوش وحواس قائم نہ تھے۔ اس کے بہت سے دوست اور شناسا بھی گواہی دیں گے۔ کہ وہ بے انتہا پیتا ہے، بلکہ عادی شرابی ہے ـــــ" سنتیا مک فرسن نے کہا۔

"جس وقت آج صبح صبح مجھے ڈاکٹر سعید نے فون کیا کہ ہربرٹ کا فوری، آپریشن کرنا ہے ـــــ"

"مگر کسی نے ریٹا فریزر کو کیوں نہیں تلاش کیا ـــــ؟" میں نے زرینہ کی بات کاٹی۔

"اوّل تو یہاں جنگلوں میں کسی کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ دوسرے میرے خیال میں مناسب یہی تھا کہ مسز فریزر موقع واردات پر نمودار نہ ہوں ـــــ" میلکم نے جواب دیا۔

"افوہ ـــــ کیا قیامت کا دن گزر رہا ہے ـــــ" زرینہ نے کہا۔

"اور کمال ملاحظہ ہو۔ میں ارسلان بھائی کو اطلاع دینے کے لئے یہاں آیا تو عین اس وقت آپ کا چپراسی یہ پیغام لے کر وارد ہوا کہ آپ نے مسز فریزر کے لئے بندوق منگوائی ہے۔ میرے تو یقین جانو اکب ملے کے لئے چھکے چھوٹ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں "ایلیس ان ونڈر لینڈ" نرالی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ بہرحال معلوم ہوا کہ تم ریٹا فریزر کو فلمی ہیروئن بنائے ڈال رہی ہو اور اس طرح

یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ کہاں ہیں۔
"چارلس اور ریٹا دو پولیس افسروں کی معیت میں رات کی ٹرین سے ڈھاکا روانہ کئے جا چکے ہیں۔ میں ڈھاکا میں مقیم کینیڈین ڈپٹی ہائی کمشنر کو فون کر چکا ہوں خدا سب پر رحم کرے —" میلکم نے بات ختم کی۔
"اب راحت — آئی مین — ریٹا کا کیا ہوگا —!" زرینہ نے پوچھا۔
"وہ ابھی چارلس اور ریٹا کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غالباً قانونی لحاظ سے ریٹا کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں —"
زرینہ نے سر صوفے کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔
"ارسلان — وہ تار مجھے دینا —" میلکم نے کہا۔ ارسلان بھائی نے تار اٹھا کر دیا۔
"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہربرٹ کے والدین کو کیا لکھوں۔ وہ ان کا اکلوتا لڑکا تھا —" میلکم مک فرسن کہہ رہے تھے۔
کمرا میں خاموشی چھاگئی۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹکیں۔ ہلکی سبز دیوار پر روکشن ڈائیل نے رات کا ڈیڑھ بجایا۔
میلکم نے رومال سے اپنی نم پلکیں خشک کیں اور اٹھ کھڑے ہوئے ہم لوگ میاں بیوی کو رخصت کرنے کے لئے برامدے میں نکلے۔ چاروں طرف چار کے باغات اور بانس کے جھرمٹوں پر کہرہ چھایا ہوا تھا۔ چند منٹ تک ہم پانچوں ڈوبتے چاند کی بہت مدہم چاندنی میں چپ چاپ کھڑے رات کی آوازوں کو سنتے رہے اور میلکم اور سنتھیا مک فرسن شب بخیر کہہ کر کار میں بیٹھے اور

اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

جس روز میں چا بگان سے واپس جا رہی تھی۔ زرینہ نے راستے میں ارسلان بھائی سے دفعتاً پوچھا ۔۔۔۔۔ "ارسلان ایک بات بتلائیے۔ مکمل عورت کیسی ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ ALL WOMAN! ۔۔۔۔۔؟"

"معلوم نہیں ۔۔۔۔۔" انہوں نے جواب دیا ۔۔۔۔۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان سے اتر کر کچی سڑک پر آگئی۔

شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مزدور عورتوں کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑوں کی سمت لوٹ رہی تھیں۔ گاؤں میں دیئے جلنے لگے۔

اچانک ایک موڑ پر پاربتی کی نذر ساری کی جھلک دکھلائی دی۔ کار دیکھ کر وہ ٹھٹھکی اور بندگی کے لئے ہاتھ جوڑے۔ پھر وہ چائے کی خالی ٹوکری کمر سے باندھے تیز تیز قدم رکھتی "روپی ٹری" کے جھرمٹ میں غائب ہو گئی ۔۔۔۔۔ سانجھ بھئی اور دیا جرے ۔۔۔۔۔

سرخ پھولوں سے دہکتے ہوئے گھنے درختوں کی پتیاں سرسرائیں ۔۔۔۔۔ پیا نہ آئے پاس ۔۔۔۔۔ پپیہے نے کہا۔

"آج رام نندن کہہ رہا تھا کہ پاربتی کا گونا ہونے والا ہے۔ برادری نے فیصلہ کر دیا ۔۔۔۔۔" زرینہ نے کہا۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں "دو پتیوں اور ایک کلی" کی جھاڑیوں سے سرک کر ۔۔۔۔۔ نینن سے دو گنگ بہیں، کوئل نے کہا۔

اندھیرے میں جا گریں۔

ڈوبن لاگی آس، پپیہے نے کہا۔

نشیب میں ندی کنارے دھند لکا پھیل چکا تھا۔ لالہ رنگ افق پر دھواں اٹھ رہا تھا ــــــ

ــــ ندی کنارے دھواں اٹھت ہے ــ میں جانوں کچھ ہوئے جا کارن جوگن بھئی، وہی نہ جلتا ہوئے ــــ"

زرینا نے کہا ــــــ

اونچی نیچی سڑک پر دھول اڑاتے ہوئے ہم تینوں خاموشی سے سری منگل کی طرف بڑھتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف ٹیلوں پر سندھ مالتی کھلی تھی۔ جو شام پڑے مہکتی ہے مگر ویرانے میں اس کا قدرداں کوئی نہیں۔ دفعتہً میں نے زرینہ سے پوچھا۔ "زرینا بی بی ــــ راحت اور واجد صنوبر اور قاسم اور فرحت کے متعلق تو معلوم ہو گیا لیکن شمشاد کا کیا ہوا ــــ وہ اب کہاں ہے ــ وہ جس کی وجہ سے کہانی شروع ہوئی ــ"

"کہانی شروع ہونے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی ــــ بی بی اور نہ اس کے خاتمے کی کوئی ایک وجہ ہے ــ زرینہ نے کہا۔

"یہ درست ہے زرینہ بی بی ــــ تمہارا فرمانا میرے سر آنکھوں پر پھر بھی، اس شمشاد کا بہ قول شخصے کیا بنا ــــ؟"

"مرزا شمشاد علی بیگ ــــ" زرینا نے ایک کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے جواب دیا ــــ "اب ٹی اسٹیشن پر ریسرچ ڈائرکٹر ہے۔ داڑھی رکھ لی ہے

جماعتِ اسلامی کا معتقد ہے ۔ اپنی بیوی کو جو اس کی خالہ کی لڑکی ہے، پردہ کرواتا ہے اسٹیشن پر جب اکا دکا سیاحوں کی ٹولیاں یا دورہ پر آنے والے سرکاری افسران کراترتے ہیں تو وہ اکثر ان کو اپنی جیپ میں لفٹ دیتا ہے ۔ چارلگان کی دنیا سے ان کو خود سے متعارف کرا دیتا ہے ۔ اور داڑھی کے اندر ہنستا رہتا ہے ۔ اکثر دوران گفتگو میں تبلیغ اسلام بھی کرتا ہے ـــــ"

ارسلان بھائی خاموشی سے کار چلانے میں مصروف رہے ۔ اب دور سے سری منگل کے ڈاک بنگلا کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آرہی تھیں ۔ ہم تاریک رات میں اسٹیشن کی جانب رواں رہے ۔ ام کے درختوں میں سے ٹی ریسرچ اسٹیشن اور اس کے بنگلوں کی روشنیوں کی جھلک دکھلائی دی ۔ کچھ دیر بعد ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے ۔ جس کے سنسان پلیٹ فارم کے مختصر سے برامدے میں ایک اکیلا مسافر اکڑوں بیٹھا اخبار کے کاغذ جلا جلا کر آگ تاپ رہا تھا ۔

ٹرین حسب معمول ایک گھنٹا لیٹ تھی ۔ پٹڑیوں کے قریب کار ٹھہرا کر ہم انتظار میں مصروف ہو گئے ۔

"رزینہ بی بی ـــــ" میں نے دور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے تار کے کھمبوں کو دیکھتے ہوئے سردی سے کانپ کر کہا ـــــ

"اگر تم کو ٹروتھ سیرم TRUTH SERUM کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کا رسلٹ لیٹر، لکھ کر آئینے کو بھیجو گی ـــــ؟"

"بی بی" نے ریحانہ نے سوں سوں کر کے جواب دیا " اگر تم کو ٹروتھ سیرم کا انجکشن لگوا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کی ڈوکومنٹری بناؤ گی ـــــ؟"

گہرا گہرا ہو گیا۔ ارسلان بھائی نے سگریٹ جلایا تو لائیٹر کی روشنی زور سے چمکی۔ کچھ دیر بعد زرینہ نے سر ہلا کر ذرا شرماتے ہوئے کہا ——— "بی بی ——— ایک سوال مجھے عرصہ سے پریشان کر رہا ہے۔ ——"

"فرمائیے ——"

"خدا نے یہ دنیا کیوں بنائی ——؟"

"ایں ——؟"

"ہاں ——— کیوں ———؟ آخر کیوں ———؟ مجھے اس کی کوئی وجہ بتاؤ۔"

ارسلان بھائی نے ادھ جلا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور دوسرا سگریٹ جلایا۔

"یہاں تین سال تنہائی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کا موقعہ مل گیا۔ جو میں ڈاکٹری کے چکر کی وجہ سے پہلے کبھی پڑھ نہ سکی تھی اور بی بی۔ میں نے بہت پڑھ ڈالا۔ مختلف فلسفے اور مختلف مذاہب ہندو مت اور بدھ مت اور اسلام اور تصوف اور کنفیوشی ازم۔ مگر اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا کہ آخر اس ذاتِ مطلق نے دنیا بنائی ہی کیوں ——— یہ لیلا کس لئے رچائی آخر۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ مہاتما بدھ بھی دراصل ایک مرتبہ افیم کھا گئے تھے۔ یہ نروان وغیرہ سب اسی کا نتیجہ تھا اور اگر ———" اس نے گنگناتے ہوئے بات جاری رکھی ——— "اگر پانچ منٹ کے لئے فرض کر لو

"ہاں ——— اگر پانچ منٹ کے لئے فرض کر لو ———" میں نے دہرایا۔

"کہ آپ سے آپ ارتقا ہو گیا۔ تو ارتقا بھی کیوں ہوا بھائی ——— کوئی

تنگ تھی ــــ ؟ وجہ تھی ــــ ؟"

دور سے گڑگڑاتی کہرے کو چیرتی ٹرین اسٹیشن پر آپہنچی۔ میں نے اٹیچی کیس سنبھالا۔ قلی نے ڈکی سے اسباب نکالا۔ میں ٹرین میں سوار ہوئی۔ ارسلان بھائی نے گارڈ سے بات کی۔ ڈبہ خالی پڑا تھا۔ "چٹخنیاں اندر سے اچھی طرح چڑھا لینا۔" ارسلان بھائی نے فکر کے ساتھ کہا۔ میں نے ایک بار پھر خوابیدہ سلہٹ کو خدا حافظ کہا ـــ میری پیاری کزن نزہت اور ارسلان بھائی خاموش پلیٹ فارم پر دھند کے میں دو پرچھائیوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

ٹرین نے سپاری اور کیلے کے جھرمٹوں میں دوڑنا شروع کیا۔ گھُپ اندھیری رات جو مہاکالی، مادرِ فطرت، وقت کی راجدھانی ہے۔ ایک ریلوے کراسنگ کے نزدیک چھوٹے سے کالی مندر میں چراغ جل رہا تھا۔ تالاب کے کنارے ایک درگاہ میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ تالاب پر کائی پھیلی تھی ــــ اور کنول کھلے تھے۔

"ست، چت اور آنند، جو مایا میں اس طرح پوشیدہ ہیں ــــ جیسے تالاب پر کائی جم جاتی ہے۔"

میں نے کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر آنکھیں بند کر لیں اور مجھے بہت سے، ہمیشہ یاد رہ جانے والے منظر یاد آگئے۔

شاہ جلالؒ کی درگاہ کا حوض۔

ایک بوڑھی ہندو عورت جو حوض کی منڈیر پر جھکی سیاہ پانی میں تیرتی سرخ متبرک مچھلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

بانس کے ڈبوں میں چا کے بیج کے کیڑے جمع کرتے ہوئے بچے بانس کے پلوں پر سے گزرتے، چھتریاں لگائے ڈوری سے ٹکی تیل کی بوتلیں سنبھالے کسان ــــ بید کے پودے ــــ خلاش اور بیل کے جنگل بھویائیانے والوں کی آواز ــــ ایک چھوٹا سا کالا بچہ، جسے اس کا باپ بڑی احتیاط، بڑے لاڈ سے ایک تالاب میں نہلا رہا تھا۔

راج شاہی کے دور افتادہ گاؤں کے چا خانوں میں بیٹھے سنجیدگی سے اخبار پڑھتے ہوئے داڑھی والے کسان الاؤ کے گرد جاگ گان کی محفل ــــ نورالعباد کی کوٹھڑی میں جلتا ہوا دیا۔

روشن لالٹین ہاتھ میں لٹکائے گوہاٹ کی سمت آتے ہوئے کسانوں کی ٹولیاں، نیلی عنابی، اودی تہمدیں ــــ نیلی عنابی اودی ساریاں۔ سفید دھوتیاں کم کم کے بڑے بڑے روشن ٹیکے۔ کاجل سے بھری آنکھیں۔ بھوک سے پچکے پیٹ۔ دوتارہ بجاتے باؤل اور اس کے بعد ــــ واحدہ اور ریتا فرزند، غفیر الرحمان میاں اور پاربتی۔

آدھی رات کے سناٹے میں اھزت بلے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

سری رام کرشن کے ایک عزیز چیلے غالباً دویویکا نند نے بیلور مٹھ میں مہاکالی کے چرنوں میں پھول چڑھا کر دنیا تیاگے ہوئے کہا تھا ــــ

راج راجیشوری ــــ بھونیلشوری ــــ سدھیشوری، اپنی تقدیس اور اپنی ناپاکی ــــ اپنا دھرم اور اپنا ادھرم، اپنی ودیا اور

لے نوائے سرمدی

اور دیا ——— اپنے پاپ اور اپنے پُن، اپنا خیر اور اپنا شر ——— اپنی نیکی اور اپنی بدی ——— سب لے لو اور مجھے خالص بھگتی دے دو۔

اور میری کزن زرینہ نے تھوڑی دیر ہوئی، سوال کیا تھا، "خالص بھگتی میں بھی کیا مل جائے گا ———؟"

ہلتی جُلتی، چرخ چوں کرتی ٹرین اتھاہ رات کے سمندر میں سے گزرتی ڈھاکے کی طرف رواں رہی۔

دنیا میری سمجھ میں نہیں آئی۔

راجندر سنگھ بیدی

صرف ایک سگریٹ

سنت رام کی آنکھ کھلی تو صبح کے چار بجے تھے۔

ساتھ کے بستر پر دھوبن سو رہی تھی۔ ایک بہادر۔ دھوبن، سنت رام اپنی بیوی کو کہتا تھا۔ اس کا نام تو اچھا بھلا شانتی تھا لیکن سنت رام اسے اس نام سے پکارتا تھا۔ کیونکہ وہ لانڈری میں کپڑوں کی دھلائی کے بہت خلاف تھی۔ گھر میں نوکر چاکر، پرماتما کا دیا سب ہوتے سہتے وہ رومال سے لے کر بھاری بھاری چادریں تک گھر ہی میں دھوتی تھیں۔ جب تھک جاتی تو سب سے لڑتی اور لانڈری کے خرچ سے بہت مہنگی پڑتی۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہ ہمیشہ دبائے جانے کی فرمائش کچھ اس انداز سے کرتی کہ فرمائش اور حکم میں کوئی فرق ہی نہ رہتا۔ دبانے کی اس مصیبت سے سنت رام تو کیا دھوبن کے بچوں تک کو چڑ تھی۔ کوئی پانچ نہیں تو چار دس منٹ تک دبوا لے لیکن یہ کیا کہ کوئی گھنٹے بھر سے، ادھر چھوڑنے کا نام ہی نہ لے۔ عجیب تماشا ہوتا تھا۔ آخر دبانے والے کو خود بے دم ہو کر لیٹ جانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑی بیٹی لاڈو کے ساتھ یہی معاملہ

تو ہوا۔ ماں کو دبانے کے بعد وہ ہانپتی ہوئی پلنگ کے ایک طرف جا گری اور بولی۔
اب تم مجھے دبا دو، ممی!

پھر اس ڈبنے دلوانے کے سلسلے میں ایک اور بڑی مصیبت تھی۔ دھوبن کے پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ درد کہاں ہو رہا ہے۔ جہاں ہاتھ رکھو، درد ہمیشہ اس سے تھوڑا پرے ہوتا تھا۔ اور یہیں جگہ ڈھونڈواتے ڈھونڈواتے وہ سارا بدن دلوا لیتی تھی۔ کوئی کہے یہ اس کی چالاکی تھی تو ایسی بات نہ تھی جناب۔ واقعی پتہ نہ چلتا تھا اور آخر یہ فیصلہ ہوتا کہ سارا بدن دکھ رہا ہے، اچھا، دھوبن کو دبوانے کا ہی نہیں، دبانے کا بھی شوق تھا۔ اشارہ کرو اور وہ تیار۔ البتہ یہ کام اس سے کوئی کم ہی کرواتا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ کیا تھا مستری کی پکڑ تھی جس سے وہ اچھے بھلے آدمی کے نٹ بولٹ کس دیتی تھی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت نہ صرف مردانہ بلکہ پہلوانانہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی کو نہیں دبا رہی، بلکہ بیٹھ کو نچوڑ رہی ہے سنت رام تو اس کے دھوبی پٹڑے سے بہت گھبراتا تھا۔ دھوبن —— ہاں، سنت رام نے اس کا یہ نام اس لئے بھی رکھا تھا کہ بچپن میں اس نے سیر بین میں بارہ من کی دھوبن دیکھی تھی جو نیم برہنہ حالت میں پہلو پہ لیٹے، ہاتھ میں مور کے پروں والا پنکھا لئے ایک بھرپور عورت معلوم ہوتی تھی۔ سیر بین والا اپنے ڈبے پہ گھنگھرو بجاتا ہوا گلی میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا پیرس کی رات دیکھو، اپنی بارات دیکھو اور پھر ٹیون بدل کر —— دھوبن دیکھو بارہ من کی، گوری چٹی آما تن کی۔ آہا!۔ اور سب بچے ماؤں سے ایک ایک پیسہ لا کر اس جادو کے بکس والے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنا اپنا چہرہ اور آنکھیں سیر بین میں ٹھونس لیتے تھے۔

اور نظاروں سے پورا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ پیرس، بارات، سفید ریچھ، سرکس کے چکر کے بعد جب دھوبن آتی تھی تو بچوں کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ سوچتے دھوبن کیوں اس بکس میں قید کر رکھی ہے؟ مہینہ پہلے بھی وہ ایسے ہی لیٹی ہوئی تھی اور آج بھی لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پہلو پہ لیٹے لیٹے کیا وہ تھک نہیں جاتی؟ دھوبن ایک نامحسوس طریقے سے بچوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ دماغ میں گھس جاتی تھی اور کہیں پندرہ بیس برس کے بعد باہر نکلتی۔

ساتھ کے کمرے میں لاڈو، سنت رام کی شادی شدہ لڑکی جو ایک روز پہلے سسرال سے آئی تھی سو رہی تھی۔ کچھ ایسی بے خبری میں، جیسے اس کا کوئی میاں ہی نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ رات کے پہلے پہر گیندے بابی۔ اس کے بچے نے اسے سونے ہی نہ دیا تھا اور جب اسے نیند آئی تو سانس لینے کے لئے زیادہ ہوا کی ضرورت پڑی۔ لاڈو جیسے شادی سے چھ برس پہلے تھی، ویسے ہی اب بھی بولتی۔ بات کرنے میں منہ سے پانی کی پھوار سننے والے پڑتی تھی۔ جیسے وہ روٹھتی، ویسے ہی من بھی جاتی۔ سنت رام اور دھوبن کو یہی فکر تھی ——— یہ آلی بھولی بیٹی ہماری بسے گی کیسے؟ اسے کوئی "مشکل پسند" میاں مل گیا تو مصیبت ہو گی۔ لیکن اسے میاں جو ملا تو اس نے کوئی شرط ہی نہ پیش کی، اور نہ اب پیش کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے ادھر اس گھر میں ماں باپ کی ناچاقی، ادھر لاڈو کی سسرال میں والدین کی کثرتِ محبت یا ایسے ہی دنیا کے ڈر سے مل ملا کے دونوں میاں، بیوی کو ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ بہادر دونو اتنے تھے کہ گھر میں چوہا نکل آئے تو بہ "چھچھنے" چلاتے ہوئے ایک دوسرے کی پناہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ لیکن یہ ڈر اولاد تک منتقل ہو

ہو رہا تھا۔ لاڈ کے ساتھ اُن کا مُنا بابی سویا ہوا تھا۔ ماں کے گلے میں بانہہ ڈال کر۔ جب ذرا نیند کھلتی تو اس کے کان مسلنے لگتا۔ سنت رام نے جب بھی محبت کے جذبے سے معمور ہو کر دو ھتے کو ساتھ سلایا تو تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر اسے اُٹھاتے ہوئے پھر اس کی ماں کے ساتھ ڈال دیا۔ سوتے میں بانہہ گلے میں ڈالنے کی بات اتنی نہ تھی۔ البتہ جب وہ اپنے لجلجے ہاتھوں سے کان مسلنے لگتا تو عجیب سی گدگدی ہوتی اور کبھی یوں معلوم ہونے لگتا، جیسے کوئی کنکھجورا کان میں گھس رہی ہے ——

چھوٹے دو بچے، لڑکا اور لڑکی اپنے ماموں کے ہاں گڑگانواں گئے ہوئے تھے۔ ان کے بستر خالی پڑے ہوئے بیکاری کے عالم میں چھت کو تکا کرتے۔ بڑا پال یہیں تھا، جس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے، وہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہو گیا تھا اور سنت رام کے تسلط سے نکل گیا تھا۔ سنت رام نے اپنے بیٹے پال کے سلسلے میں اپنی زندگی کا آخری چانٹا کوئی چھ برس پہلے مارا تھا جو اب تک گھس چکا تھا۔ اب تو وہ اس سے ڈرنے لگا تھا۔ آج بھی پال حسب معمول رات کے دو بجے آیا تھا۔ ڈپلومیٹ کے دو چار پیگ لگا کر۔ وہسکی کی اصلی مہک تو گھر کے لوگوں نے نیند میں گزار دی تھی۔ لیکن اب ابھی اس کے اُلٹے سانس میں سے بو آ رہی تھی ——

پال چھبیس ستائیس سال کا ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتے کھولتے رہنے سے اس کے بدن پر بوٹی نہ آتی تھی۔ اس کے باوجود چہرے کی بناوٹ اور مونچھوں کی ہلکی سی تحریر کے باعث وہ مرد کے طور پر قابل قبول تھا۔

عورتیں اسے بہت پسند کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ ان کے بچوں کو بہت پسند کرتا تھا۔

کردار کے اعتبار سے پال اَننگ بھرا تھا اور جاہ طلب، اس میں انا بے پناہ تھی۔ یہ انا جس کی وجہ سے اس کی ناک کے نتھنے پھیلتے جاتے تھے اور وہ بڑے زوردار طریقے سے اپنے آپ کو پال آنند کے نام سے متعارف کراتا تھا جیسے وہ کوئی روایت ہو۔ یہ روایت اس نے کہاں سے پائی تھی؟ اپنے باپ، سنت رام آنند ہی سے نا جو ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک تھا۔ اور جس نے اپنے بیٹے کو شہزادے کی طرح پالا تھا۔ اس کی ماں، دھوبن سے چری رقمیں دی تھیں اور اس عمل میں اپنی بیوی سے اپنے تعلقات خراب کر لئے تھے۔ پھر اس نے پال کو جائیداد کی چھت دی تھی۔ ایک ایسے مکان کی چھت جس میں تین بیڈ روم تھے اور ایک شاندار ڈرائینگ روم جس میں اُستادوں کی پینٹنگ تھیں۔ پھر دن میں دو دو بار بدلنے کے لئے کپڑے۔ یہ سب اپنے باپ سے لے کر وہ کیوں اسے بھی بھول گیا تھا؟ صرف یہی نہیں، اس سے نفرت کرنے لگا تھا اور یوں پاس سے گزر جاتا تھا جیسے وہ اس کا باپ نہیں، کوئی اور ہو۔ اگر حکومت نے کوئی نیا قانون پاس کر لیا تو جس سے کمپنی فیل ہو گئی تو اس میں سنت رام کا کیا قصور؟ زندگی میں نفع ہوتا ہے، اور نقصان بھی۔ یہ کیا مطلب کہ نفع کے وقت تو سب شریک ہو جائیں اور نقصان کے وقت نہ صرف الگ ہو بیٹھیں بلکہ گالیاں بھی دیں! لیکن اس میں پال کا زیادہ قصور نہ تھا۔ وہ آج کل کے زمانے کا لڑکا تھا اور صرف اس شخص کی عزت کر سکتا تھا جس کے پاس پیسہ ہو یا اس کے ڈھیر سارے پیسے بنانے بلڈنگیں کھڑی کرنے اور امپالہ کار خریدنے کا امکان ہو۔ ایک بار سنت رام کے

سوال پر پال نے یہ بات کہہ بھی دی جس سے بوڑھے کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا۔ اسے اس کا خود بھی اندازہ نہ تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا کہ وہ کہیں چوری یاری کر کے، ڈاکہ ڈال یا بینک ہولڈاپ کر کے لاکھ روپیہ بنائے اور اسے بیٹے کے پاؤں میں پھینک کر اس کی اور اس کی ماں کی نظروں میں اپنی کھوئی ہوئی توقیر پھر سے حاصل کر سکے۔ جب خسارہ ہوا تو دھن یا لالڈو یا پال میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہ کہا ـــ اے جی، یا پپا، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ جی میلا کیوں کرتے ہیں؟ جیسے کھویا ہے، ایسے ہی پا بھی لیا جائے گا۔ جو پیسہ بنانے نکلتے ہیں کھو بھی دیتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر نقصان اٹھانے والا بے وقوف ہوتا ہے۔ یہ تو رہتی بات ہوئی جیسے ہر پیسہ بنانے والا عقلمند ہوتا ہے۔ کیوں سب نے اسے بوڑھا اور سٹھیایا ہوا سمجھ لیا اور بیسیوں بار اس کی طرف دیکھے بغیر پاس سے گزر گئے تھے اور اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے؟ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ اگر پھر سے اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے تو وہ ان گزری ہوئی سب باتوں کو دل میں رکھ کر ایک ہنٹر ہاتھ میں پکڑ لے اور کسی بھی عنایت سے پہلے بیوی اور بچوں کو مار مار کر نیلا کر دے۔ نہیں یہ شوہر اور باپ کا کردار تو نہیں لیکن یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ باپ کا کردار پیار دینا ہی ہے، لینا نہیں۔ گویا اسے پیار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پیار کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ ایک سال کے بچے کو ہوتی ہے تو سو سال کے بوڑھے کو بھی۔ اور تو اور اپنے کتے جمی کو بھی ہوتی ہے جو اس وقت کہیں اپنے ڈربے میں پڑا سو رہا ہے اور بیچ بیچ میں کہیں سے کوئی آواز آنے پر بھونک اٹھتا ہے۔ کہیں پیار کی نظریں اس کی نظروں سے ملتی ہیں۔

تو ایک پیغام اس کے دماغ سے دُم تک چلا جاتا ہے جو نہ صرف خود بے تحاشا ہلتی ہے بلکہ سارے بدن کو بھی ہلا ڈالتی ہے۔ جس دن اسے کوئی ایسی نظروں سے نہ دیکھے وہ کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ گویا کہہ رہا ہو۔ میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن پیار کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہاں دھوبن، لاڈو، پال نے اسے جمّی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

شاید یہ سب اس لئے تھا کہ سنت رام نے زندگی میں صرف دینا ہی سیکھا تھا اور اب یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا۔ لینے میں اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے کاروبار میں خسارے کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ اب وہ دے نہیں سکتا اور جب گھر کے لوگ چپکے میں پاس سے گزر جاتے تھے تو وہ ان کی خاموشی کا عجیب الٹا سیدھا مطلب نکالتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ لینے والوں کو بھی عادت پڑ سکتی ہے لینے کی، مگر اس سلسلے میں سنت رام بہت سفاک واقع ہوا تھا۔ اس نے کئی بار ادھار لے کر بھی بیوی بچوں کو تحفے دیئے جو انہوں نے لے کر رکھ لئے اور بے شعوری کی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ کسی نے شکریے کا ایک لفظ بھی تو نہ کہا اور نہ تشکر کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے کتنے کمینے اور بزدلانہ طریقے سے اپنی محبت روک لی تھی یا شائد سنت رام کو اپنے گھاٹے کا اس قدر احساس ہو گیا تھا کہ گھر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسے اپنے لئے تحقیر کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اس نفرت اور تحقیر ہی کو پسند کرنے لگا ہے اور اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رحم طلب نظروں سے کسی کی طرف نہ دیکھ سکے۔

دھوبن کی چوبیس گھنٹے کی نیگنگ اور نصیحتوں کی سنت رام کو اتنی پروا نہ تھی کیونکہ وہ ان پڑھ اور بدزبان ہونے کے باوجود محنتی بہت تھی۔ اور اپنی صفائی پسند طبیعت سے بہت سی چیزوں کی تلافی کر لیتی تھی۔ لیکن ایک رات بڑے پیار کے لمحوں میں اس نے ہونٹ چرا لئے کیونکہ سنت رام کے منہ سے سگریٹ کی بُو آتی تھی لیکن وہ تو بچپن ہی سے سگریٹ پیتا تھا۔ اب صدیوں کے بعد یہ بُو کیسی؟ شاید وہ اسی خسارے کی بو تھی یا شاید دھوبن بوڑھی ہو گئی تھی۔ اور ٹھنڈی اور خشک کیونکہ یہ جوانی اور اس کی گرمی ہی ہے جس میں بُو اڑ جاتی ہے اور روئے زمین کی سب خوشبوؤں پر چھا جاتی ہے لیکن اگر دھوبن ٹھنڈی اور خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی تو وہ خود بھی تو جوان نہ رہا تھا۔ کیوں اسے اس عمر میں ہونٹوں کی طلب تھی؟ بوڑھے اور بے کیف ہونٹوں کی جن میں رس نام کو نہ تھا۔ ان پر تو صرف جلی کٹی تھیں اور کوسنے جن کے سوا اور کچھ آ ہی نہ سکتا تھا۔ دھوبن سیدھی سادی اور نادان عورت تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ جب ہونٹ چرا لئے جائیں تو مرد پر کیا بیت جاتی ہے؟ سنت رام انہی کی تلاش میں رل کر ان ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جا رکھتے ہیں جن پر سوائے نجات کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یا شاید دھوبن سیر بین کی دھوبن یہ "جیٹ پاز" چلا آیا تھا اور اس نے پہلو بدل لیا تھا۔ اور اپنی سیج سے اٹھ کر مور پنکھ کو ہاتھ سے پھینکتے ہوئے دیکھنے والوں کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ نہ وہ جادو کے ڈبے والا رہا تھا اور نہ وہ معصوم دیکھنے والے ـــــ یا خود سنت رام پر وہ وقت چلا آیا تھا جبکہ جوانی ایک بار پھر عود کر آتی ہے اور آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے۔ پہلے کی سی طاقت

کے ساتھ شعور اور تجربہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور ایک پختگی اور رسیدگی پا جانے سے انسان خود ہی اپنے آپ میں تعفن پیدا کر لیتا ہے اور تھوڑے پانی والے جوہڑ کی کیچ میں بھینس کی طرح سے لوٹنے لگتا ہے یا غالباً اس کی وجہ بھی وہی گھاٹا تھی جو سنت رام نے اپنے کاروبار میں کھایا تھا اور مالی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ پانے کا احساس، محبت میں غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بدل کر رہ گیا تھا۔

ڈور کی تو خیر کوئی بات بھی نہ تھی وہ تو بیاہی ہوئی تھی اور اپنے گھر جا بسی۔ وہ تو اب بابل کے آنگن کی چڑیا تھی جو کہیں پڑے ہوئے دانوں کو چنتی ہوئی اڑ جاتی تھی۔ لیکن پال تو بیٹا تھا اور اسے یہیں رہنا تھا۔ اسی گھر میں، اسی چھت کے تلے جہاں اسے بہو کو لانا اور بسانا تھا۔ کہیں اور گھر لے لینے سے تو باپ کے گھر کی چھت نہیں بدلتی۔ وہ کیوں چند باتوں کو نہیں سمجھتا اور یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیوں اس کے پاس اپنے بہن بھائیوں اپنے ماں باپ کے لیے چند منٹ بھی نہ تھے؟ امریکن فرم میں اگزیکٹو ہو جانے سے کیا وہ کوئی خدا ہو گیا تھا؟ کیوں وہ اس فرم کے ذریعے سے پرائیویٹ کنٹریکٹ لینا اور لیں پیسہ پیدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا۔ وہ کبھی تو باپ سے بات کرتا، جو اس سے پیسے نہ مانگتا تھا وہ تو فقط یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس بیٹھے دو تین جسم اکٹھے ہوں جو ایک دوسرے سے نکلے ہیں۔ بدن، صرف بدن کا لمس ہو۔ یہ نہ بھی ہو تو آنکھیں ملیں جو باپ ہی پر نہیں آباؤ اجداد پر گئی ہیں۔ پاس بیٹھ کر آج کی نئی تعلیم کی باتیں کرے۔ جس سے پرانے بہت پڑھے لکھے آدمی بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ ان کی دنیا کا پتہ چلے، کچھ اپنی دنیا انہیں دکھائی جا سکے۔ اس سے سیکھیں اور اسے بتا بھی سکیں کہ صرف تعلیم ہی بس نہیں، تجربہ بھی ضروری ہے اور چند

حالات میں جیمز بانڈ کے علم سے بہت اُوپر ہوتا ہے۔ وہ کبھی کچھ تو مانگے اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔ کیوں وہ ایکا ایکی اس قدر خود مختار اور بے نیاز ہو گیا تھا؟ یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر اب ماں باپ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بوجھ ہی کی بات ہے تو وہ اب بھی بوجھ ہے کہیں وہ کپڑے اتار کر دھوبن کے سامنے پھینک جاتا ہے اور چونکہ گھر میں کچھ پیسے دیتا ہے۔ اس لئے ماں، ماں نہیں رہی پر سچ مچ کی دھوبن ہو گئی؟ گھر میں بیسیوں مہمان آتے جاتے ہیں۔ انہیں ایئر پورٹ سے لینا یا گاڑی پہ چھوڑنے جانا صرف ماں باپ کا ہی فرض ہے؟ اور کچھ نہیں تو لاڈو ہی کو ملنے، لینے چلا جائے۔ وہ اپنی بیٹی ہے تو اس کی بھی بہن ہے۔ اگر پال یہ سب حرکتیں ناسمجھی کے عالم میں کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ تو بلا کا ذہین تھا اور ایک پل میں وہ معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ چار سال قبل جب ایک نہایت امیر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی سے اس کا رشتہ ہونے کی بات چلی تو کھٹ سے اس نے انکار کر دیا اور بولا۔ دس سال مجھے آپ کے چکر سے نکلنے میں لگے ہیں، پتا! آپ چاہتے ہیں کہ میں اور دس سال ایک امیر آدمی کی اکلوتی بیٹی کے چکر سے نکلنے میں گزار دوں؟

سنت رام اس بیٹے کی بات کو سن کر چکت ہو گیا تھا۔ اسے اس بات کا گورو بھی ہوا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کے ناطے سے بہت خود دار واقع ہوا ہے اور افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ باپ کے چکر سے نکلنے کا کیا مطلب؟ کیا بیٹا باپ کے چکر سے نکل سکتا ہے یا باپ بیٹے کے چکر سے؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ ہو سکنے والا حصہ نہیں؟ کیا برّاعظموں کا فاصلہ ہونے پر بھی وہ ایک دوسرے سے دُور ہوتے ہیں؟ آخر کون سا وہ اندھا ہے جسے وہ ڈور دکھائی نہیں دیتی جو باپ بیٹے

سے وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑتا اور چھوڑتا ہی چلا جاتا ہے؟ بیٹا چاہے باپ کے جانے کے بعد بھی کہے کہ میرا باپ نالائق آدمی تھا۔ ہزاروں کا قرض مجھ پر چھوڑ کر چلتا بنا۔ اس پر بھی تعلق تو رہتا ہی ہے نا؟ نالائق باپ اور لائق بیٹے کا تعلق۔ میں تو مر ہی نہیں سکتا۔ جب تک اپنی اولاد کے لئے کچھ چھوڑ کر نہ جاؤں۔ ایسا ہوا تو ان کی ماں دھوبن تو مجھے وہاں خدا کے گھر تک نہ چھوڑے گی۔ اور وہی روح تک کا تولیہ نچوڑ ڈالے گی۔ لیکن میرے باپ نے میرے لئے کیا چھوڑا تھا؟ اس پر بھی ان کی عزت میرے دل میں کبھی کم نہیں ہوئی۔ کیا پیسہ اور جائیداد چھوڑنے ہی سے کوئی باپ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے؟ یہ بات تو اعداد و شمار ہی سے غلط ہے۔ ایک باپ مقروض مرتا ہے۔ جبھی دوسرا جائیداد بنا سکتا ہے نا؟ خیر، میرا تو ابھی تغلق روڈ پر ایک بنگلہ ہے۔ کیا ہوا گھاٹے کے بعد اس پر تھوڑا پیسہ لے لیا۔ گیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا رہن بھی نہ چھڑا سکوں؟ پھر گاؤں جگدل میں زمین ہے، دو سو بیگھہ۔ جس میں سے کچھ بٹوں کی ہے اور کچھ میں نے اپنے پیسے کی بنائی ہے۔ کیا یہ میری ہمت نہیں کہ اتنی مصیبت آ پڑنے پر میں نے اس کا ایک انچ نہیں بیچا۔ میں نے اس لئے نہیں بیچا کہ میرے پرکھوں کی روح کو تکلیف نہ ہو اور میرے بیٹے مجھے کوسنے نہ دیں۔ پھر بیمہ ہے۔ بہت نوبت آئی تو خودکشی کر کے بیوی بچوں کو پیسہ دلوا سکتا ہوں . . . .

جب بھی سنت رام کو اپنا باپ یاد آیا اور اس کی موت کا وقت، جس میں صدمے کی انتہا تھی اور اس کے بیچ ایک عجیب سی پُراسرار خوشی تھی کہ اب جو بھی اچھا

بُرا کریں گے اپنا کریں گے اور پپال کے سلسلہ میں اس بات نے سنت رام کو ایک عجیب طریقے سے کٹ کر دیا۔ آخر کون سا بیٹا ہے جو اپنے دماغ کے کسی کونے میں اپنے باپ کی موت کی خواہش نہ لئے بیٹھا ہو؟

سنت رام کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ ماتھے کے کمرے میں آکر اس نے زیرو پاور والا بلب جلایا اور اس کی مدھم سی روشنی میں لاڈو، اس کے بچے بابی اور پھر پپال کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا وہ اپنے بیٹے میں جی رہا تھا اور پھر اپنے پوتے، پڑپوتے میں . . . . .

سنت رام کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔

ارے یار! سگریٹ بھی کیا چیز ہے جس نے بھی اسے ایجاد کیا، حد کر دی۔ کیسا ایک ننھا سا رفیق زندگی کا جو آپ کے تنہا لمحوں میں کسی دوسرے کے موجود ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے اور اس کے دم سے آپ کبھی اکیلا نہیں محسوس کرتے بلکہ وہ خود زندگی ہے جس کا ایک کنارہ زندگی ہی کی طرح سے دھیرے دھیرے سلگتا اور دوسرا موت کے منہ میں یا منہ کی موت میں پڑا ہوتا ہے۔ وہ آپ کے ہر سانس کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوا خود راکھ ہو جاتا ہے لیکن آپ کے بکھرے ہوئے خیالوں کو ایک نقطے میں سمیٹ لاتا ہے۔ آپ چند ایسے راز سمجھ چکے ہوتے ہیں جن کے بعد اور کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ لوگ کہتے ہیں، اس سے کینسر ہو جاتا ہے —— ہوا کرے . . . . جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے وہ کون سی خضر کی حیات جیتے ہیں؟ دنیا کے ہر بشر کو آخر کوئی نہ کوئی بہانہ تو موت کو دینا ہے۔ سگریٹ کا بہانہ کیوں نہ ہو؟

رات جب سنت رام گھر لوٹا تو سگریٹ لانا بھول گیا تھا اور اس وقت ساڑھے چار بجے دکانیں بند تھیں اور سنت رام کی طلب کھلی جو کھلتی ہی جا رہی تھی۔ سامنے بیٹے پال کے سگریٹوں کا پیکٹ پڑا تھا جس کے اوپر ماچس رکھی تھی۔ پال شہزادہ ہونے کے کارن اسٹیٹ ایکسپریس سے ادھر سگریٹ ہی نہ پیتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ سنت رام کو چار میناری سے لے کر قینچی اور گولڈ فلیک تک سب چلتے تھے۔ اسٹیٹ ایکسپریس ہی لوں؟ کیا ضرورت ہے؟ کیا میں چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار نہیں کر سکتا۔ جبکہ پان بیڑی کی دکانیں کھلنے لگتی ہیں؟ لیکن اگر انتظار کرنے دے تو پھر وہ سگریٹ نہیں دودھ کا گلاس ہوا۔ سنت رام کا ہاتھ پیکٹ کی طرف لپک گیا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا پیکٹ میں صرف دو ہی سگریٹ تھے۔ ایک تو پال کو باتھ روم کے لئے چاہیئے ہی تھا اور دوسرا؟ کیا پتہ ایک سگریٹ سے اس کا کام نہ چلتا ہو اور دوسرے کی بھی ضرورت محسوس ہو۔ اس وقت نہیں تو شیو کے بعد سہی یا ناشتے کے بعد۔ اس علاقے میں اسٹیٹ ایکسپریس کہاں ملتے تھے جو اڑا لینے کے بعد نو دس بجے سے پہلے چوری چپکے رکھ دیئے جائیں، جبکہ پال اٹھتا تھا، رکھ بھی کیسے دیئے جائیں کیونکہ ان سگریٹوں کے لئے کناٹ پلیس جانا اور آنا پڑتا تھا جس کا مطلب تھا آدھا گیلن پٹرول پھونک دینا۔ ایک سگریٹ کے لئے!

اس سے اچھا ہے کہ چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار کر لیا جائے۔

لیکن صاحب سگریٹ جب بلاتا ہے تو اتنی زور کی آواز دیتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ وہ آواز نہ پینے والوں کو سنائی نہیں دیتی۔ ان کے کان میں نہیں ہوتے نا۔ کیوں نہ بھیکو، اپنے نوکر سے سگریٹ لے لیا جائے؟ وہ تو

بیڑی پیتا ہے۔ بیڑی ہی سہی لیکن بھیکو کو اس کی کمبخت کرن کی نیند سے جگانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ پورا پہاڑ کھود دو اور پھر اس سے ایک کنکری کی فرمائش کرو۔ کیونکہ بھیکو ہمیشہ ہڑبڑا کر 'کیا ہوا، کیا ہوا' کہتا ہوا اٹھتا تھا جس سے گھر کے سب لوگ جگ جاتے تھے۔ اس کمینے کی نیند بدعنوانیوں کی وجہ سے نہ ٹکتی تھی۔ ایسے ماہر چوکیدار بھی تو ہے۔ سنت رام نے دروازہ کھول کر جھانکا اور بتیوں کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا۔ چوکیدار کا کہیں تخم بھی نظر نہ آتا تھا۔ پورے پانچ بجے تھے اور وہ اپنی سمجھ میں پانچ بجا کر اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے کسی چبوترے کے ساتھ جا سویا تھا۔ بیکار ہی ہم لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ کون سا ڈاکہ پڑنے والا تھا جبکہ سامنے پولیس کی چوکی بھتی ہے؟ بھیکو۔ چوکیدار۔ یا چوکی کے کسی سنتری سے بیڑی مانگنے سے تو یہی اچھا ہے کہ اپنے بیٹے کا اسٹیٹ ایکسپریس پیا جائے۔ اسے برا تو لگے مگر جو ہوگا دیکھا جائے گا . . . .

چنانچہ سنت رام نے پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ ایک ہی کش سے سنت رام کا اضطرار آدھا رہ گیا تھا۔ دوسرے کش سے ایک چوتھائی اس حساب سے تو تیسرے چوتھے کش سے پوری تسلی ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن سگریٹ کا بھی عجیب حساب کتاب ہوتا ہے۔ جیسے اضطرار کا اپنا لاجک۔ چوتھے کش کے بعد اضطرار کے کم ہونے کی رفتار گھٹ جاتی ہے اور سگریٹ کے جلنے کی زیادہ۔ بہر حال بہت مزہ آیا۔ اسٹیٹ ایکسپریس اتنا اسٹرانگ سگریٹ تو نہیں جتنا چار مینار، مگر اچھا ہے۔

پورا سگریٹ پی چکنے کے بعد سنت رام کو محسوس ہوا کہ اس نے برا کیا۔ کیا وہ

تھوڑی دیر کے لئے ایک سگریٹ کے بغیر نہ رہ سکتا تھا؟ نہیں جوانی میں آدمی اپنے حواس پر قابو رکھ سکتا ہے، بڑھاپے میں نہیں۔ آخر بیٹے کا سگریٹ پیا ہے نا؟ مجھے خوش ہونا چاہیئے اور اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی۔ کیسا مزا آیا۔ چھوٹی چوری میں بہت مزہ آتا ہے۔ جبھی بابی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ ماروں گا، میں تم کو ماروں گا۔ وہ خواب میں کسی سے لڑ رہا تھا۔ لاڈو نے آدھے سوئے، آدھے جاگے عالم میں اسے تھپکنا شروع کر دیا۔ سوجا بابی، سوجا، بابی سو گیا اور وہ بھی سو گئی۔ پال کو کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کے خراٹے تو جاپ چکے تھے۔ البتہ ناک میں کوئی چیز اڑے ہونے کے کارن سیٹی سی بج رہی تھی۔ جبھی اندر سے دھوبن کی آواز آئی۔

"سگریٹ پی رہے ہو؟"

"ہاں"۔ سنت رام نے وہیں سے کہا۔

جس کے جواب میں وہ بولی "صبح صبح ہی شروع ہو جاتے ہو۔ دن تو چڑھنے دو۔۔۔۔ یوں کلیجہ جلانے سے بیمار ہوگے کہ نہیں ہوگے؟"

سنت رام نے دل ہی دل میں کہا۔ میری بیماری کی جیسے بہت پرواہ ہے۔ یہ گھر کے لوگ، جب پرواکرنی ہوتی ہے تو نہیں کرتے اور جب نہیں کرنی ہوتی تو کرنے لگتے ہیں۔ اس نے اندر کے کمرے کی طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا "تم سو جاؤ، ابھی سوا پانچ ہوئے ہیں"۔

دھوبن کی آواز اس کی انگڑائی میں سے چھن کر آئی —— "نہیں مجھے ہیٹر لگانا، چائے گرم کرنا ہے۔ بہت کپڑوں کا ڈھیر ہے۔۔۔"

جبھی دھوبن کے اٹھنے کی آواز آئی۔ ہاں صاحب جب عورتیں اٹھتی ہیں تو

تو وہ اس بات کا رکھ رکھاؤ نہیں کرتیں کہ ان کی کھٹ پٹ سے کوئی ڈسٹرب ہوگا۔ وہ بستر کی چادر کو چھانٹ رہی تھی، جیسے اس پر کہیں ریت آ پڑی ہو۔ پھر الماری کی کیبنٹ سنائی دی اور اس میں سے دودھ کے پیسے نکلے۔ یہی سینڈل کی کھٹ کھٹ برسوں پہلے لگتی اور دماغ میں فتور پیدا کرتی تھی۔ اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔

چادر چھانٹتے ہوئے دھوبن کی آواز آئی۔ "اُف، اُف . . . دماغ جل گیا ہے، سگریٹ کی بُو سے۔"

"اچھا، اچھا!" سدرت رام نے کہا "تمہیں بُو ہی آتی رہتی ہے۔"

دھوبن کو واقعی بہت بُو آتی تھی، جو غالباً عمر کا تقاضا تھا۔ چوتھے کمرے میں کوئی سگریٹ پیئے اسے وہیں سے پتہ چل جاتا تھا۔ ایسے ہی وسکی شراب کا، چاہے کسی نے صرف چکھا ہی ہوا ہو۔ اس کی کنجوسی، اس کے اخلاقی طور پر اچھا ہونے نے گھر کے سب لوگوں کو چور بنا دیا تھا۔ سب بے حال ہو کر علتیں کرتے اور پھر انہیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن دھوبن سے کوئی کچھ چھپا نہ سکتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ نے باہر نکل کر بالکنی پر جا کر سگریٹ سلگایا لیکن جب مڑ کر دیکھا تو دھوبن موجود۔ جس سے سگریٹ کا مزہ ہی جاتا رہا۔ اس کی اس روک ٹوک نے پال میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ کھلے بندوں سگریٹ پیتا تھا بلکہ اس نے اسکاچ کی ایک بوتل گھر ہی میں لا رکھی تھی۔ باہر سے آنے پر جب اسے محسوس ہوتا کہ شراب کم پڑی ہے فوراً ایک آدھ پیگ گھر ہی میں منگا لیتا۔ ماں سے اس کی کئی بار لڑائی ہوئی تھی۔ دھوبن آخر اس سے ہار گئی تھی۔ اس نے کہا بھی تو اتنا ـــــ "میرا کیا ہے جائے گی اپنی

قسمت کو روسے گی؟"

سگریٹ!... دراصل مرد اور عورت کے منہ کی بُو کو ایک ہونا چاہیے، ورنہ سب تباہ ہو جاتا ہے۔ اس تباہی کے کارن سنت رام نے اپنی ٹائیپسٹ ڈولی کو پہلے، سگریٹ پلا لیا تھا۔

پال اٹھے گا تو کیا کہے گا؛ یوں ایک سگریٹ پی لینے میں تو کوئی بات نہیں، لیکن کسی عمل، کسی ذائقے کی تکمیل نہ پانا بُرا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دو محبت کرنے والوں میں کوئی تیسرا آجائے۔ پھر پال کئی باتوں میں کس قدر کمینہ ہے۔ ایک بار اس کا جوتا پہن لیا تو وہ کتنا جزبز ہوا تھا۔ اس نے جُوتے کو لے کر پھینک ہی دیا اور کہنے لگا۔ میرے اور پتا کے پیر ایک ہیں کیا؛ اب یہ کھل گیا ہے اور میرے کام کا نہیں۔ سنت رام کو بہت دُکھ ہوا۔ ایک بار بیٹے کا جوتا پہن لیا تو کیا ہو گیا؟ بیسیوں بار اس نے میرا چپل پہنا ہے۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ اُلٹی مجھے خوشی ہوئی اس احساس کے ساتھ۔ میرے بیٹے نے میرا جوتا پہنا ہے اور بڑوں کا یہ کہنا بھی دماغ میں آیا جب باپ کا جوتا بیٹے کو برابر آجائے تو پھر اسے کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ جب سے میں نے سب کہنا سننا چھوڑ دیا۔ نہیں، ایک بار اس نے کسی سمگلر سے امریکن جرکن خریدی تھی، جو مجھے بہت اچھی لگی۔ پال کو بھی اچھی لگی تھی جبھی تو اسنے خریدی، لیکن میں ہمیشہ کی طرح اپنے بڑھاپے کے کارن اسے پہننے کے جذبے کو روک نہ سکا۔ چنانچہ میں نے پہن لی۔ اس کے رنگ بڑے شوخ و شنگ تھے اور مجھے اسے پہننے میں بہت مزہ آیا لیکن پہلے تو دھوبن نے میرے مزے کو کرکرا کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دی۔

"کیا ہُوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ اندر ہی اندر اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولی "کچھ نہیں" اور پھر رہ بھی نہ سکی، اندر کہنے لگی ——— "کیسے گھوم رہے ہو جیسے ویسی مرغا مرغی کے ارد گرد گھومتا ہے -!"

یہ جذبات کا دھوبی پٹڑا تھا - خیر۔

لیکن رہی سہی کسر پال نے پوری کر دی - میں نے اپنا شوق پورا کرنے کے بعد اس جرکن کو بڑی احتیاط سے وارڈروب میں ٹانک دیا - لیکن صبح ہی تو پال جرکن کو میرے پاس لے آیا اور بولا ——— "پپّا! آپ ہی اسے پہن لیجئے -"

میں نے مجرمانہ انداز سے کہا "کیوں - تم کیوں نہیں پہنتے؟"

"یہ میرے کام کا نہیں رہا" وہ بولا - "دیکھتے نہیں آپ کا پیٹ بڑا ہے اس کے پہننے سے الاسٹک چلا گیا ہے اس کا -"

مجھے بے حد غصہ آیا اور میں اس پر برس پڑا - میں نے کہا میں تمہارا باپ ہوں جرکن پہن لی اور تمہارا نقصان کر دیا؛ تم نے سینکڑوں نہیں ہزاروں بار میرا نقصان کیا ہے - میں نے کبھی تمہیں کچھ نہیں کہا ہے - الٹا میں خوش ہوا ہوں - چلو یوں کہہ لو کہ باہر سے ناراضی کا ثبوت دیا لیکن اندر سے میں کتنا خوش تھا؛ تم سینکڑوں بار میری قمیص، میرا جوتا پہن گئے ہو میں نے یہی کہا - میرا بیٹا! میرے کپڑے پہنتا ہے اور تم نے اسی طرح اس دن دو گھوڑے والی بوسکی کی قمیص میرے منہ پر دے ماری - تم نہایت کمینے نہایت بے شرم ہو۔

بجائے اس کے کہ پال کو افسوس ہو، وہ میرے ساتھ دلیل بازی پر اتر آیا - "آپ پاپی کماتے ہیں" وہ کہنے لگا " اور اس کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اس پر پڑ جاتا ہے گیا

وہ قمیص میرے پہننے کے لائق رہتی ہے؟"

ان دنوں بھی لاڈو یہاں اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس جھگڑے میں وہ بھی پاس اکھڑی ہوئی اور بول اٹھی، "پپا بالکل میری طرح ہیں۔"

چھوٹے دونوں بھی جو اس وقت اپنے ماموں کے ہاں گرہ گانواں گئے ہوئے تھے، یہیں تھے۔ چھٹکی بھیکو کی مدد سے بستر کی سلوٹیں نکالتی ہوئی بولی۔۔۔ ہاں! بات کرتے ہی تو لاڈو دیدی کی طرح منہ کی ساری پھوار سامنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ تماشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہیں پپا اور لاڈو آپس میں بات کر رہے ہوں، تو۔"

لاڈو سن رہی تھی، دوسرے سب سن رہے تھے۔ نہ چاہنے کے باوجود میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔ بات سنجیدہ بھی تھی اور مضحک۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا بھی تو اتنا "ہاں، آخر لاڈو کا باپ ہوں نا، اسی پر گیا ہوں۔"

اور تو اور، چھوٹا وشنو بھی ہنس رہا تھا بخلیوں کی طرح، پھیپھڑے پیدائشی طور پر کمزور ہونے کے کارن وہ کبھی کھل کے منہ نہ ہنستا۔ "ہی ہی، پان کھاتے ہیں نا پپا۔" اس نے کہا "تو قمیص پر سامنے تو لگتا ہی ہے، لیکن پیٹھ پر جانے کیسے جا لگتا ہے؟" یہ سب سمجھتے تھے، میں پان منہ سے تو کھاتا ہی نہیں، قمیص سے کھاتا ہوں۔ اس پر طرفہ دھوبن منظر پر چلی آئی۔ میرا خیال تھا ماں ہونے کے ناطے وہ باپ کا پکش لے گی، لیکن صاحب، اس نے الٹا بیٹے بیٹیوں کی تائید شروع کر دی۔ "کیا پوچھتے ہو ان کا؟" وہ بولی "بالکل بابا ہیں اوپر سے۔ کھانا کھائیں گے تو سالن کرتے پر گرا

ہوگا۔ لکھنے بیٹھیں گی تو سیاہی۔ میں ان کا کر دن کیا؟ پتہ تو مجھے چلتا ہے۔ دھوتے دھوتے جس کے ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ یہ میری قسمت، عمر گزر گئی میری، ان کے داغ نکالتے نکالتے۔۔۔

صرف ایک بالی رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بانس تھا، جس سے وہ "بڈھا بابا" کو بھنکارتا تھا "مار دوں گا" وہ خلا میں خیالی دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا بڈھا بابا، اس کا خیالی دشمن میں ہوں، پھر جی کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے آپ اتفاقیہ بات کہہ بیٹھے۔ بھیکو بجلی کا بل چکانے چلا گیا تو ورنہ وہ اپنی مگھم بولی میں کہتا "ہم میاں بی بی کا جھگڑا ہیں نہیں پڑے گا" اور یہ بات ادھر بھی میرے خلاف جاتی۔ گھر بھر میرا دشمن ہو گیا تھا۔ ایسا پہلے تو نہ تھا۔ چند برس پہلے جب سے مجھے کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے، دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کسی کو میری بات ہی پسند نہیں یا شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اس لیے سب کو بُرا لگتا ہوں۔ مجھے ان کے سامنے سے ٹل جانا چاہیے۔ اس دنیا سے ٹل جانا چاہیے۔ لیکن، میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟

میں نے اس گھر، ان لوگوں پر اپنی جان بھی وار دی۔ نہ کسی کلب کا ممبر ہوا۔ نہ ریس کورس پہ گیا۔ یہ تو یہ کوئی پکچر بھی ڈھب سے نہ دیکھی۔ کام کام اور کام۔ تفریح کے لیے ایک لمحہ نہیں۔ اسی لیے میں ذہنی طور پر بیمار ہو گیا ہوں۔ شاید پاگل۔ پاگل نہیں تو سنکی ضرور ہوں۔ کبھی پاگل یا سنکی کو پتہ چلا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اسے تو صرف دوسرے جانتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی شکلوں سے اپنی شکل کا پتہ چلتا ہے۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ خدا، کسی کو خسارہ نہ ہو۔ جوانی میں جو ہوتا ہے ہو جائے، لیکن اس ڈھلتی آخر عمر میں نہیں جبکہ مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بچوں کا فادر، مسٹر گوڑ ہو جاتا ہے، اور بیوی کا بھی۔ ۔ ۔

پال آٹھ بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر سندت رام سہم سا گیا۔ ڈرنے کی ایک

ایک مثال یہ ہے کہ آدمی سامنے یا دل میں کہنے لگے۔ میں کسی سے ڈرتا ہوں؟ سنت رام پر اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ڈرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا معاملہ کو اس سطح پر لے آئے جس سے بیٹا یہ کہے کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ پال تو چاہتا تھا، ایسا موقع پیدا ہو . . . کوئی سنے تو ہنسے بیٹے کا ایک، صرف ایک، سگریٹ پی لینے سے اتنا ڈر اور اتنی ذہنی بک بک؟

چائے سے پہلے پال نے باپ کی طرف دیکھا اور معمول کی مسکان کی جس کے جواب میں سنت رام نے سر ہلا دیا اور اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پال دوسری طرف دیکھے تو وہ اس کی طرف دیکھے۔ لیکن پال نے برابر اپنا منہ باپ کی طرف رکھا جس سے گھبرا کر سنت رام نے اپنا چہرہ، ہندوستان ٹائمز کے پیچھے چھپا لیا۔ پھر اسے تھوڑا اٹھا کر دیکھا تو پال شڑک شڑک چائے پی رہا تھا۔ جس کے بعد اس نے کھٹ سے پیالی پرچ میں رکھی پھر وہ سگریٹ کا پیکٹ تھامے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔

اب تک تو سب ٹھیک تھا۔ پال نے پیکٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا نا۔ جب وہ باتھ روم جائے گا۔ تب اسے پتہ چلے گا اور سنت رام بیٹے کے باہر آنے اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے یونہی ادھر اُدھر ہوتا رہا۔ دھرمی نے کہا۔ نہاؤ گے نہیں؟ تو جواب میں جھلائے ہوئے سنت رام نے جواب دیا . . . تمہیں نہانے کی پڑی ہے۔ اب ایک ہی بار نہاؤں گا۔

دھرمی حیرانی سے سنت رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر پھٹکار کو معمول کی لایعنی سمجھ کر ناشتے کے دھندے میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں پال باتھ روم سے آیا تو اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ ماتھا

کچھ اور نیچے ہٹ گیا تھا۔ وہ واش بیسن میں جلدی جلدی اپنا ہاتھ صابن سے دھو رہا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی؟ کیوں وہ جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا؟ سامنے اس نے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھا۔ منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے، نہیں، ہاتھ دھوتے ہوئے جھاگ اڑ کر چہرے پر چلے آئے تھے۔ چونکہ ہاتھ تو ابھی صابن سے اٹے تھے، اس لئے اس نے کُرتے کے بازو سے جھاگ پونچھ دیا اور پھر اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر نتھنے پھلانا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں۔ ہاتھ دھوئے ہوئے پال لوٹا تو دھوبن نے آواز دی۔ ـــ "رات تم پھر پی کر آئے تھے؟"

پال نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اتنا کہا ـــ "ہاں، آج پھر پینے والا ہوں۔"

دھوبن تن گئی۔ وہ ایسی دبنے والی تھوڑی تھی؟ اس نے صاف کہہ دیا۔۔ "آج پی کر آئے تو میں دروازے میں قدم نہ رکھنے دوں گی۔" جس کے جواب میں پال نے کہا ـــ "آنا کون چاہتا ہے، اس جیل خانے میں؟ میں نے پہلے ہی گولف لنکس میں ایک کمرہ دیکھا ہے۔" پھر دھوبن کی پاٹ دار آواز آئی۔ "نکل جاؤ۔ ابھی نکل جاؤ۔" جس سے سنت رام کی جان نکل گئی۔

"شانتی!" سنت رام نے کڑک کر کہا "کیا بکتی ہو، یہ گھر تمہارا ہے؟"

اسی سمے میں دھوبن نے جواب دیا "ہاں، میرا ہے۔ جاتا ہے تو جائے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ، بھلا ہو تم باپ بیٹوں کا جنہوں نے جینا سکھا دیا۔" اور پھر وہ رونے لگی۔۔۔ سنت رام اسی بات سے تو ڈرتا آیا تھا کہ ایسا موقع نہ آئے۔

بیٹے کی بد عنوانیوں کو دیکھ کر اندر سے کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن باہر سے کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ چلے جاؤ، مگر پھر واپس آجاؤ کہنا مشکل۔

پال کے باقی کے کام کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی شیو بنا رہا تھا اور اپنی ٹھوڑی پر بے شمار قط لگا رہا تھا اور خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے ماں کو ایسا جواب کیوں دیا، وہ ماں کو الٹی سیدھی کہتا تھا تو سنت رام کو تکلیف ہوئی تھی اور ماں اسے کچھ کہتی تو اذیت۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ زیادہ قدرتی تھا، جس میں وہ ایک دوسرے کو سن سنا کر پھر ایک ہو جاتے تھے۔ مگر آج پال کا انداز یہی تھا کہ وہ جائے گا تو پھر نہیں آئے گا۔۔۔

"آنا کون چاہتا ہے" اس جیل خانے میں "۔ اس کا کیا مطلب۔ پال کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اندر سے محسوس کر رہا تھا کہ اس گھر میں آنے کا کیا فائدہ، جہاں کوئی چیز اپنی نہ رہ سکے۔ جوتا، جرکن اور نہ سگریٹ۔ پال پھر جلدی جلدی نہایا اور کپڑے پہنتے ہوئے باپ کے پاس سے گزر گیا۔ سنت رام نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن اس نے آنا کانی کر دی۔ اخبار بھی اٹھا کر نہ دیکھا اس نے، اور اسٹیٹ ایکسپریس کا پیکٹ پوری نفرت سے کھڑکی سے باہر پھینکتا ہوا وہ نکلنے لگا۔ وہ دین تو اس سے لڑ بیٹھی تھی اس لئے اس نے بیٹے کو ناشتے کے لئے بھی نہ پوچھا۔ سنت رام نے اسے روکنے کی کوشش کی اور آواز دی۔

"بیٹا ناشتہ تو کر لو۔۔۔"

"نہیں" پال نے مختصر جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ جس انداز سے اس نے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ اس سے روح تک میں تشنج پیدا ہو گیا۔

پال کے جاتے ہی دھوبن اور سنت رام میں ٹھن گئی۔ وہ تو اسے صرف اسی فضیحتے کے سلسلہ میں ملعون کر رہا تھا، لیکن دھوبن ایک طرف روئے جا رہی تھی اور دوسری طرف کوسنے دے رہی تھی۔ اس سلسلے میں وہ نئے پرانے سب دفتر کھول بیٹھی۔ اس کی باتوں سے تو ایسا پتہ چلتا تھا کہ اس گھر میں آ کر اس نے کوئی سکھ نہیں دیکھا۔ وہ بہت چھوٹی قسمت والی تھی۔ حالانکہ سنت رام سمجھتا تھا کہ اس دنیا کا کوئی سکھ نہیں جو اس نے بیوی کو نہ دیا ہو اور اگر دکھ بھی دیکھا ہے تو ساتھ اس نے بھی تو دیکھا ہے لیکن بیوی نہ صرف اپنے بلکہ پوری اولاد کو تباہ و برباد کرنے کا ذمہ دار سنت رام کو ٹھہرا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "یہ پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلہ میں مجھے ڈانٹتے۔ لڑتے جھگڑتے رہے میرے ساتھ۔ پھر دو سپوت مجھ پہ لاد دیے۔ ایک ہاتھ سے بچہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے روٹیاں پکا رہی ہوں ان برکتوں کے لیے۔ اب خدائی اولاد کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی۔ جیسے کپڑے کی۔ جبھی سے وہ نالائق نکل آئے سب کے سب، اور اب بیٹے کی یہ ہمت کہ وہ تمہارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے؟"

سنت رام حملے کی بجائے مدافعت پر اتر آیا تھا۔ واقعی وہ کیا تھا جو بیوی کو بچوں سے نہ بچا سکتا تھا اور نہ بچوں کو بیوی سے۔ جب تک لاڈو بھی جگ گئی اور آنکھیں پونچھتے ہوئے منظر کو دیکھنے لگی۔ کاش وہ تھوڑی دیر پہلے اٹھ جاتی اور اپنے بھائی کو جانے سے روک لیتی۔ وہ میرا بیٹا ہے اس کا بھی تو بھائی ہے۔ لیکن ماں کو روتے دیکھ کر وہ اس کی طرف ہو گئی۔ بظاہر اس نے ماں ہی کو چپ کرنے کے لئے کہا اور سنت رام کو دیکھا صرف۔ لیکن اس کے دیکھنے ہی میں کیا کچھ نہ تھا جس سے

سنت رام کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے اور اس کے بعد وہ بچے کو سنبھالنے لگی اور گھر میں اپنے میاں کو ٹیلیفون کرنے لگی تاکہ وہ آئے اور اسے لے جائے۔ اس کے بعد ایک خاموشی سی چھا گئی جس میں دھوبن کے سسکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ خاموشی ۔۔۔ للّا اور دوسرے بچوں نے بھی تو یہ سمجھ لیا تھا کہ روز کا معاملہ ہے کون اس پر سر دھنے؟ یہ کیا میرا ہی معاملہ تھا؟ سنت رام نے سوچا گھر کے کسی اور بشر کا نہیں: پال تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا، ماں کے بات کرنے سے پہلے۔ دھوبن کی بات تو صرف ایک بہانہ ہو گئی۔ وہ نہ چاہتا تھا پال کو کوئی سا بھی بہانہ دے لیکن اس نے نہیں تو اس کی ماں نے اسے دے دیا۔ کیونکہ وہ جل بھن گیا تھا۔ پیکٹ میں صرف ایک ہی سگریٹ پاکر: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سنت رام دفتر میں داخل ہوا تو اس نے کسی کے علیک سلیک کا جواب نہ دیا۔ لیکن ان لوگوں کو کیا پڑی تھی؟ آج صاحب کا موڈ اچھا نہیں، کسی نے کہا۔ پھر دوسری طرف سے آواز آئی، اچھا کب ہوتا ہے؟

کیبن میں داخل ہوتے ہی چپراسی چندو سے سنت رام نے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا۔ چندو ہمیشہ پہلے ہی سگریٹ خرید کر رکھتا تھا۔ وہ اپنی جیب سے دام خرچ کر دیتا۔ اور جب مالک سے مل جاتے تو جیب میں ڈال لیتا۔ سنت رام نے اپنا کوٹ ٹانگا۔ پیکٹ پر سے کاغذ پھاڑا، سگریٹ نکالا، سلگایا اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج سنت رام کا جی کام میں نہ تھا۔ ایک شدید ڈر نے اس کے جسم و ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے گھومنے والی کرسی پر پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں میز پہ رکھیں اور سگریٹ کے دو چار بیجے بیجے کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔۔۔۔ میں نے کسے تباہ کر

کر دیا ہے، گھر کے لوگوں کو؟ بیوی اور بچوں کو؟ میں معمّر ہونے کے باوجود پڑھتے رہنے کی وجہ سے آج کل کے زمانہ کا ہوں۔ میں نے شوہر اور باپ بننے کی بجائے ان سے دوستی رکھنے کی کوشش کی۔ شاید یہی قصور تو نہیں میرا؟ میں نے بیٹی سے ایسی باتیں کیں جو پرانے خیال کے باپ نہیں کرتے۔ جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے کہا تھا.... وہاں مخلوط تعلیم ہے، لازماً وہاں لڑکیاں ہونگی اور لڑکے بھی اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آ گئی ہے جسے گڈ ٹائم کہتے ہیں گڈ ٹائم ہے لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق ہے۔ اسے تم مت بھولنا۔ مرد پر کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ وہ اپنے اخلاق، اپنی تہذیب سے اسے قبول نہ کرے لیکن عورت پر بہت ہے کیونکہ بچہ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی لئے دنیا بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضا کیا جاتا ہے قدامت پرستی کا اور یہ ٹھیک ہے انہیں کبھی اپنے آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہئے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمے داری قبول کرے۔

دھوئیں کے مرغولے میں سنت رام کو اس وقت کا بیٹی کا چہرہ یاد آیا۔

وہ ہڑبڑ باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اور کچھ نہیں بھی۔ شاید وہ سوچتی تھی۔ پاپا آج کیا لے بیٹھے ہیں؟ اس بات کو تو آج کل کے زمانے کی ہر عورت ہر لڑکی سمجھتی ہے۔ پتا کتنے پرانے خیالات کے ہیں؟ اگر میں پرانے خیالات کا ہوں تو روز یہ قصے کیا سنتا ہوں؟ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو بدھ کے زمانے میں بھی کہی جانی چاہئے تھی اور آج کے زمانے میں بھی۔ کیا انسان مشق اور غلطی ہی سے سیکھتا ہے؟ لیکن اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ جہاں اس محلے کے دوسرے بچوں نے بدعنوانیاں کیں وہاں میرے بچوں نے نہیں، کم از کم لڑکیوں نے نہیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا۔

جو میں نے انہیں دی۔ تو پھر یہ تباہی کیسی؟ پال چھبیس برس کا ہو گیا تھا جب میں نے براہِ راست اس سے پوچھا کہ اسے عورت کے سلسلے میں کوئی تجربہ ہوا ہے؟ چونکہ وہ بیٹا ہونے کے علاوہ میرا دوست تھا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔ اب مجھے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ تجربہ کامیاب ہوا یا نہیں کیونکہ جنسی فعل ایک بہت بڑی ذمے داری کی چیز ہے۔ اس میں کوئی سی بھی غلطی پوری زندگی پر چھا سکتی ہے۔ اس لئے تو مرد عورت کے بیچ محبت اور شادی کی چار دیواری کا تحفظ لازمی ہے۔ لیکن پال بھی میری طرف بِٹر بِٹر دیکھ رہا تھا اور شاید جی ہی جی میں ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا ہونہہ! ذمے داری!۔۔۔ پاپا اُنیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن یہ طے تھا کہ بہت سی باتیں وہ نہ جانتا تھا اور میں نے اس کے دماغی جالے اور پھپھوندیاں اتارے اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دنیا اور اس کے حالات کا مقابلہ کر سکے اور آج اس بیٹے نے اس کا ایک سگریٹ پی جانے سے منہ موڑ لیا مجھ سے!

نہیں ہو سکتا ہے معمول کی طرح وہ کسی اپنی ہی دھن میں ہو اور جلدی گھر سے باہر نکل گیا ہو۔ فرق یہی ہے نا کہ پہلے وہ اس کے قریب جاتا اور آج ساڑھے نو بجے نکل گیا تھا۔۔۔ کل میری ایک فرم سے لاکھ روپے کی ڈیل ہونے والی ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر پال خفا بھی ہو گیا ہے تو راضی ہو جائے گا۔ پھر سب مل کر گلمرگ کے پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنائیں گے۔

لیکن، ایک سگریٹ،۔۔۔ صرف ایک سگریٹ۔۔۔

سنت رام کا خون بار بار کھول اٹھتا تھا۔ جیسے اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا ہو خود کو معاف نہ کیا ہو۔ مگر تو باپ بیٹے سے نفرت کرتا ہے، اپنے آپ سے

نفرت کرتا ہے جو بیٹا باپ سے نفرت کرتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ پس دراصل باپ سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ خود سے نفرت کرتا تھا۔ کیونکہ مقابلہ کی اس دنیا میں جب تک وہ باپ سے آگے نہیں نکل جائے گا تو خود کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ باپ سے محبت اس وقت کر سکے گا۔ جب اسے نالائق اور بے وقوف ثابت کر دے . . .

سنت رام نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور جنیدو سے کہا۔ ڈولی کو بلاؤ۔

ڈولی اندر آئی۔ آج اس نے بالوں کے پرم سنوار رکھے تھے اور چست بلاوز کے ساتھ ایک سفید رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کیونکہ سنت رام کو سفید رنگ بہت پسند تھا۔ لیکن سنت رام نے ڈھب سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ ڈولی جانتی تھی آج کل بوس کچھ کھویا سا رہتا ہے۔ اس نے کئی دنوں سے بزنس کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ یہ تو اس کا کرم تھا کہ ایک بڑے آدمی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ کام کرتی تھی تو پیسے لیتی تھی۔ بیچ میں وافر باتیں کیسی؟

اندر آنے کے بعد جب ڈولی نے "یس سر" کہا تو سنت رام نے چھلکتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور اپنے آپ کو کہنے سے روک لیا کہ تم بہت خوبصورت لگتی ہو ڈولی — !

لیکن، ایک لمحے کے لئے اس کا دل جو کہیں بھی ٹھیکا پانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ ڈولی کے خوبصورت بالوں میں اٹک گیا۔ یہ عورتیں بھی خوب ہیں۔ اگر مرد کا دل سیدھے بہاؤ میں نہ بہے تو اسے لہروں اور اس کے ہچکولوں میں ڈبو دو۔ مگر سنت رام نے جلد ہی اپنی آنکھیں اس طوفانی بہاؤ سے اور نیچے کے بھنور سے ہٹالیں اور دائیں طرف دراکشا سوگ کے کیلنڈر کو دیکھنے لگا جیسے اسے کوئی

تا یہ سچ دیکھتا ہو۔ ایسی حرکتوں کو خوب خوب سمجھتی ہے۔ اور اپنی نظریں اپنے شکار پر گاڑے رہتی ہے۔ مرد جانتا ہے کہ اس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تو گیا۔ اس لئے وہ پرے اور پرے سے پرے دیکھنے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کب تک؟ آخر منٹ کے سوویں حصے کے لئے وہ مجبوری اور بے اختیاری کے عالم میں پھر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ اور وہ یہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی آخری پھڑپھڑاہٹ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سنت رام نے ڈولی سے پوچھا — پرکنز کہاں ہے آج کل؟

- پرکنز ڈولی کا بھائی تھا، جاہن پرکنز۔

"یہیں ہے" ڈولی نے جواب دیا اور تھوڑا مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سنت رام کے اس سوال کو ادھر اُدھر کی باتوں میں سے سمجھتی تھی جو مطلب پر آنے سے پہلے مرد ہمیشہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تو سخت بزنس کا عمل روا رکھنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی مذاق ہے؟ — جب چاہے بلا لو، جب چاہے جھٹک دو۔ اتنے دنوں تک بات ہی نہیں کی، دیکھا تک نہیں اور گنہ رہ گئے اور آج ایک ایکی پرکنز یاد آیا ہے!

کیا ڈولی بھی کب تک بزنس کا انداز رکھ سکتی ہے؟

سنت رام نے ڈولی کو نادانی کے عالم میں سگریٹ پیش کر دیا۔ ایک لہر سی ڈولی کے بدن میں دوڑ گئی جو اس کے بالوں کے پرم سے زیادہ مضطرب تھی اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک دیئے اور بولی "نو، تھینکس" اور پھر غصے اور شکایت سے اس کی چھاتیاں اوپر نیچے ہونے لگیں۔ سنت رام نے اس کی نکردن

میں اپنی نظریں گاڑتے ہوئے ایک زور نے انداز میں کہا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سنت رام کہتے جا رہا ہو۔ دنیا نے میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ گھر کے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک تم تھیں جو ایک معمولی سے "رینز" کے لئے مجھے التفات کا دھوکہ دے سکتی تھیں۔ اور تم نے دھوکا دیا اور وہ مجھے ایسی محبت لگی جو سچی محبت سے کہیں اوپر ہوتی ہے۔ اس میں وہی فرق تھا جو اصلی بوسے اور جھوٹی کے بوسے میں ہوتا ہے۔ جس میں پچھلا لاکھ روپے کا گھاٹا اور آنے والا لاکھ روپے کا نفع بڑے خوبصورت طریقے سے ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں . . . ڈولی نے سنت رام کی طرف دیکھا، ورنہ وہ اور بھی بوڑھا ہو جاتا اور اسے ایک کی جگہ کئی اور گھاٹے پڑ جاتے، جن سے وہ خود بھی بیکار ہو جاتی۔ اس نے اپنے رحم کی تھوں سے سوچا جو اس کی ماں تھا۔ اور دنیا بھر کے مردوں کی ماں، چاہے وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ پھر آل رائٹ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھایا۔ سنت رام نے لائیٹر جلا کر ڈولی کا سگریٹ سلگا دیا۔ ڈولی نے کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے ایسے ہی سگریٹ کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرا کش لگانے کے بعد وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھی۔ پیچھے کیبن کے دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی سنت رام کی طرف بڑھی۔

جبھی سنت رام نے کہا "پرکنز شہر میں ہے تو اسے کہو۔۔"!

ڈولی وہیں رک گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی تاکہ وہ اپنا فقرہ مکمل کر لے۔

سنت رام نے کہا "مجھے اسٹیٹ ایکسپریس کا ایک کارٹن لا دے، پیسے پھر دے دوں گا۔"

"آل رائٹ" ڈولی نے کہا اور پیچھے ہٹتی ہوئی وہ کیبن سے باہر نکل گئی۔

سنت رام گھر پہنچا تو کارٹن کی قلعہ بندی کے باوجود وہ ڈر رہا تھا۔ ایک نہیں بیسیوں واہمے دامن گیر تھے اس کے، جن کے بارے میں وہ دھوبن یا لاڈو سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پال چلا آیا۔ سنت رام کے جسم میں جو کپکپی پیدا ہو رہی تھی بند ہو گئی بلکہ ایک عجیب طرح کے سکون، نرمی اور گرمی کا احساس ہوا ہے، جیسے سردیوں میں کوئی کمرے کے اندر بخاری جلا دے۔ لیکن پھر وہی ڈر۔ اس کے جسم و ذہن کا احاطہ کرنے لگا۔ کہیں اپنے کپڑے لتّے اٹھانے اور گودلے لکس کے کمرے میں منتقل ہو جانے کے لئے تو نہیں آیا۔ پال ؟ مگر اس بات کے تو کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ پھر وہ آج جلدی کیوں چلا آیا تھا۔ وہ تو کبھی نہ لوٹتا تھا رات کے ایک دو بجے سے پہلے !

کیا وہ اچھا بیٹا، راجا بیٹا ہو گیا تھا ؟ لیکن اچھا بیٹا ہونے کے باوجود وہ چپ کیوں تھا ؟ وہ لاڈو کے ساتھ بات کر سکتا تھا۔ اور نہیں تو بابی کے ساتھ کھیل سکتا تھا کمینہ ! کس قدر بغض سے بھرا ہوا تھا اس کا سینہ ! لیکن پال نے کوئی کپڑے وپڑے اکٹھے نہ کئے۔ وہ ایک منٹ کے لئے اپنے کمرے کی طرف گیا اور پھر باہر آتے ہوئے باپ کی طرف گیا اور جیب سے ایک پیکٹ نکال کر پتا کو پیش کر دیا۔ سنت رام نے دیکھا اور پوچھا — " یہ کیا ؟ "

" رشین سوبرائین "

رشین سوبرائین سگریٹ . . . اور پورا پیکٹ ! خون سنت رام کے کانوں اور آنکھوں تک آنے لگا۔ ایک سگریٹ تو کیا پی لیا ہے اس کا۔ اس کے عوض پورا پیکٹ لائے دے رہا ہے، جوتا مار رہا ہے ایک طریقے سے۔ سنت رام نے

پیکٹ اٹھایا اور پورے زور سے پال کے منہ پر کھینچ مارا۔

"کچے، شہدے، حرامی" سنت رام کہہ رہا تھا "تو کیا سمجھتا ہے، میں اپنے سگریٹ بھی نہیں خرید سکتا؟ تجھے خرید کے نہیں دے سکتا؟ اتنا تو نہیں مرا ہوں، جتنا تو سمجھتا ہے۔ ابھی تو تیرے ایسے مو کمینوں کو خرید کے رکھ لوں اور جیب میں ڈال کے چل دوں۔ ۔ ۔ باسٹرڈ!"

پال کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہونٹ پر رکھ لیا۔ جس پر پیکٹ کے لگنے سے ایک کٹ سا چلا آیا تھا۔ اور خون کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کہا بھی تو صرف اتنا ۔ ۔ ۔ "پپا!"

لاڈو بیڈ روم سے دوڑی ہوئی آئی اور اس نے بھی اتنا سا کہا ۔ ۔ "پپا!" پھر دھوبن لڑتی ہوئی بولی "کیا ہوا جی؟"

"کچھ نہیں"، سنت رام نے سب کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "مجھے اس پلے سے اپنا حساب برابر کر لینے دو۔ بہت دیر ہو گئی اسے ٹھگے ہوئے۔ ۔" پھر اپنے بیٹے کے چہرے پر خون کا قطرہ دیکھ کر سنت رام اور ڈر گیا۔ اور بھی وحشتناک ہو گیا کیونکہ بیٹے کا خون دیکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ دیکھنے والے کو بظاہر وہ بیٹے کا خون معلوم ہوتا ہے لیکن خون اس کا ہوتا ہے جس کا وہ خون ہے ۔ ۔ ۔ اور بھی آگے پیچھے ہٹئے! منہ پر کف لاتے ہوئے سنت رام کہہ رہا تھا۔ ۔ "میں تجھے جان سے مار دوں گا آج۔ چھوڑ دو چھوڑ دو مجھے ۔ ۔ ۔ یہ بھی ایک مثال ہو جانے دو۔ بیٹے باپ کا خون کرتے آئے ہیں۔ آج باپ کو بیٹے کا خون کرنے دو۔ مادر ۔ ۔ ۔ میں نے تجھے کیا نہیں دیا؟ تو بار ہنجاب پڑھنے کے لیے گیا تو چار سو روپیہ مہینہ

سیکھتا رہا۔ پھر تو وہاں سے بھاگ آیا اور میرے دوست نے دو برس تجھے اپنے یہاں رکھا اور تجھے تعلیم دی۔ میری وجہ سے اس نے تجھے اپنے یہاں رکھا، ورنہ تجھے کون پوچھتا ہے . . . چیتھڑے کو؟ اور پھر بھی پیسے بھیجتا رہا۔ میرے بیٹے کو تکلیف نہ ہو اور تو اس سے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جاتا، ہر قسم کی بدمعاشیاں کرتا رہا۔ تیرے اپنے کہنے کے مطابق تیرے دوست تجھے شہزادہ کہتے تھے کیونکہ تو باپ کے مال پر عیش کرتا تھا۔ پھر تو نے بی اے میں کمپارٹمنٹ لی اور امتحان کو پورا نہ کیا کیونکہ تو ہندی میں فیل ہو گیا تھا۔ ہندی بھی کوئی بات تھی بھلا؟ میں نے کتنی تجھ سے منتیں کیں کہ ایک مضمون سے پاس کرے۔ لیکن تجھے اس سے چڑ ہو گئی۔ پھر بھی میں نے تجھے کچھ نہ کہا۔ چھبیس برس کی عمر تک گھر رکھا اور روٹیاں کھلاتا رہا۔ ہوتا کسی اور کے ملک میں تو اٹھارواں لگتے ہی باپ تیرے چوتڑ پر لات مارتا اور باہر نکال دیتا۔ یہ اپنا ہی ملک ہے، جس میں اس قسم کی چوتیا پنتی چلتی ہے . . . . جب تیری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے تو میں تیری ماں سے چوری دس بیس پچاس ڈال دیتا تھا اور آج یہ اسی کے کارن ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہے اور کہتی ہے . . . میں نے اپنی اولاد کو تباہ کر دیا۔ تیری وجہ سے میں نے اپنی زندگی برباد کری۔ یہ تیرا ہی نخرہ ہے کہ میری ماں جس قسم کی عورت ہے، اس سے تو میرا باپ کوئی واسطہ نہ رکھے . . . بول کہا نہیں تو نے؟ یہ بیٹا ماں کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے وہ باپ کی بابت کیا کہے گا۔ روز تو ماں کو گالی دیتا ہوا نکل جاتا ہے اور جانتا ہے وہ گالی کیسے پڑتی ہے۔ وہ تجھے گالی دیتی ہے تو گالی کیسے پڑتی ہے؟ کیا اس گھر میں کوئی مالک نہیں؟ کوئی باپ نہیں؟ کیا ہوا جو ایک بار، زندگی میں صرف ایک بار

گھاٹا پڑ گیا۔ میں نے لاکھ روپیہ گنوایا ہے تو آج ہی لاکھ روپے کا کانٹریکٹ کیا ہے جس میں سے کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار بچ جائیں گے۔ تب تو تیری ماں بھی خوش ہوگی اور یہ لاڈو بھی، جو اس دن باپ کی بجائے مجھے انکل کہہ گئی ا۔۔۔ تو بھی خوش ہوتا اور فخر سے میرا نام لے گا۔ میرے پاس ہو ہو کر بیٹھے گا اور باتیں کرنے کی کوشش کرے گا لیکن میں۔۔۔۔ تم سب کو سمجھ گیا ہوں۔ منہ نہ لگاؤں گا کسی کو۔۔۔"

پال کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا بھی، تو صرف اتنا۔

"پر پتا! میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے؟"۔۔۔ سنت رام اور بھی بلند آواز سے چیخا۔ تم نے مجھے گالی دی ہے جو کسی نے نہیں دی۔ کسی کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ سب جانتے ہیں میں خالی ہاتھوں سے ان کی بوٹیاں اڑا دوں گا۔ تیری یہ ہمت کہ ایک سگریٹ تیرا پی جانے سے تو پورا پیکٹ میرے منہ پر دے مارے؟"

"ایک سگریٹ!" پال نے کہا۔

"ہاں" سنت رام نے کہا "تجھے پتہ ہی نہیں نا، میں نے تیرا ایک اسٹیٹ ایکسپریس جنج پی لیا تھا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔"

اس سے پہلے سنت رام جو کانپ رہا تھا، نیچے گر جاتا، بیٹے نے بڑھ کر تھام لیا اور اٹھا کر اسے اندر کے بیڈروم میں پلنگ پہ ڈال دیا۔ جبھی بابی اپنا بانس لئے چلا آیا اور آتے ہی اس نے پال کو جڑ دیں اور بولا۔۔۔ "تم پپا کو مالا۔۔۔ ہم تم کو مارے گا۔۔۔"

اگلے روز سنت رام حسبِ معمول صبح کے چار بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دھوبن کو ڈسٹرب کئے بغیر وہ ساتھ کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں پالی لاڈو اور اس کا بچہ بابی سوئے ہوئے تھے۔ سنت رام نے زیرو پاور کا بلب جلایا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی، مدھم سی روشنی میں وہ کتنے حسین لگ رہے تھے ایک سے ایک خوبصورت اور خوشبودار۔ آج بابی کی بانہہ ماں کے گلے میں نہ تھی وہ آزادانہ بے فکر سو رہا تھا۔

سنت رام نے سوچا، کالج بھیجنے سے پہلے میں نے اس بچی کو لیکچر دیا تھا۔ لیکن اگر یہ کوئی بے راہروی کرتی تو کیا میں اسے سڑک پر پھینک دیتا؟ پالی کا تجربہ ناکام ہوتا تو میں اسے زندگی کا کھیل نہ سمجھاتا؟ یہ اخلاق، یہ تہذیب، سب باتیں ہیں۔ یہ اندر یہاں سے باہر کے سب بچے ہیں جو کھیلتے میں گرتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھیلنے لگتے ہیں۔۔۔ دھوبن؟۔۔۔ دھوبن بے وقوف ہے وہ نہیں جانتی کچھ بھی، سوائے کپڑے دھونے کے۔۔۔۔

سنت رام نے اسٹیٹ ایکسپریس کا کارٹن نکالا اور اسے بیٹے کے سرہانے رکھ دیا۔ رات اس جھگڑے کی وجہ سے وہ اسے بیٹے کو دے ہی نہ سکا تھا۔ چلو یہ اور بھی اچھا ہوا۔ جاگے گا تو ایک دم پورا کارٹن پا کر وہ کتنا خوش ہو گا۔۔۔ پھر سنت رام بیٹے کے لائے ہوئے رشین سوبرانی کا پیکٹ ڈھونڈنے لگا۔ پیکٹ وہیں پڑا ہوا تھا جہاں وہ رات کو گرا تھا۔ سنت رام نے اسے اٹھایا اور اس سے پیار کیا۔ پھر اس میں سے سگریٹ نکالا، جلایا اور دھوئیں کے بڑے بڑے کش چھوڑے۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی پہلے ہی کچھ نہیں دیتی۔ اس پر دھوئیں

نے اور بھی منظر کو دھندلا دیا۔ بچے فرشتوں سے بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہے تھے۔ سنت رام کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر پال کے گھنے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرے۔ اس کا منہ چومے۔ لیکن کہتے ہیں سوتے میں بچے کا منہ نہیں چومتے جانے کیوں؟ اس وقت تو سنت رام نے یہی سوچا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جاگ جائیں گے۔

سو بوائی کے چو تھے کش میں کوئی نشہ تھا یا شاید ایسے ہی سنت رام کی آنکھیں بیٹے کی شراب سے چڑھ گئی تھیں۔ اس نے دھواں صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر پیار بھرے لئے پو جاگ کمرے کی طرف چل دیا۔۔۔

کرشن چندر

چندرو کی دنیا

کراچی میں بھی اس کا یہی دھندا تھا اور باندرے آ کر بھی یہی دھندا رہا جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا کوئی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں بھی سدھو حلوائی کے گھر کی سیڑھیوں کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سوتا تھا اور باندرے میں بھی وہیں سیڑھیوں کے عقب میں اُسے جگہ ملی تھی۔ کراچی میں اس کے پاس ایک میلا کچیلا بستر، زنگ آلود پترے کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹرنک، اور ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ یہاں پر بھی وہی سامان تھا۔ ذہنی لگاؤ نہ اُسے کراچی سے تھا نہ بمبئی سے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اُسے معلوم ہی نہ تھا۔ ذہنی لگاؤ کسے کہتے ہیں۔ کلچر کسے کہتے ہیں۔ حب الوطنی کیا ہوتی ہے۔ اور کس بھاؤ سے بیچی جاتی ہے۔ وہ ان سب نئے دھندوں سے ناواقف تھا۔ بس اُسے اتنا یاد تھا کہ جب اُس نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو سدھو حلوائی کے گھر میں برتن مانجتے، جھاڑو دیتے، پانی ڈھوتے، فرش صاف کرتے اور گالیاں کھاتے پایا۔ اسے ان باتوں کا کبھی ملال نہ ہوا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ کام کرنے اور گالیاں کھانے کے بعد ہی روٹی ملتی ہے۔ اور اس کی قسم والوں کو ایسی ہی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سدھو حلوائی کے گھر میں اس کا جسم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اور اسے روٹی کی شدید ضرورت رہتی تھی۔ اس لئے وہ حلوائی کے جھوٹے سالن کے ساتھ ساتھ اس کی گالی کو بھی سوٹی

کے ٹکڑے میں لپیٹ کے نکل جاتا۔

اس کے باپ ماں کون تھے۔ کسی کو شبہ نہ تھا۔ خود چندرو نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور سدھو حلوائی اسے گالیاں دیتا ہوا اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ چندرو کو سڑک پر سے اٹھا کے لایا ہے۔ اس پر چندرو نے کبھی حیرت کا اظہار نہ کیا نہ سدھو کے لیے شکریے کے نرم جذبے کا اس کے دل تک گزر ہوا۔ کیونکہ چندرو کو کوئی دوسری زندگی یاد نہیں تھی

اُسے بس اتنا معلوم تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے باپ ماں ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے   نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ گھر والے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ سڑکوں کے نیچے سونے والے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ گالیاں دیتے ہیں کچھ لوگ گالیاں سنتے ہیں۔ ایک کام کرتا ہے، دوسرا کام کرنے پر مجبور کرتا ہے بس ایسی ہے یہ دنیا اور ایسی رہے گی۔ دو خانوں میں بٹی ہوئی۔ نیچے اور اوپر۔ وہ جو اوپر بیٹھے ہیں دوسرے وہ جو نیچے۔ لیکن ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں ہے۔ اور جو ہے وہ کب، کیوں اور کیسے بہتر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ جب کبھی وہ اپنے ذہن پر بہت زور دے کر سوچنے کی کوشش کرتا تو اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس طرح وہ سٹے کے نمبر کا داؤ لگانے کے لیے کبھی کبھی جو اسی نکا اچھالا کے ناس کر لیتا ہے اس طرح اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لیے ناس کر لیا ہوگا اور اسے اس خانے میں ڈال دیا ہوگا جو اس کی قسمت تھی

یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چندرو کو اپنی قسمت سے کوئی شکایت تھی۔ ہرگز

نہیں! وہ ایک خوش باش، محنت کرنے والا بھاگ بھاگ کر جی لگا کر خوش مزاجی سے کام کرنے والا لڑکا تھا۔ وہ رات دن اپنے کام میں اس قدر مشغول رہتا تھا کہ اُسے بیمار پڑنے کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔

کراچی میں تو وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا مگر بمبئی میں آ کر تو اس کے ہاتھ پاؤں کھلے اور چوڑے۔ سینہ پھیلا۔ گندمی رنگ صاف ہونے لگا۔ بالوں میں لچھے سے پڑنے لگے۔ آنکھیں زیادہ روشن بڑی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں ضرور کسی بڑے گھر کی رہی ہو گی۔ اور پھیلے ہوئے سینے بانہوں کی مضبوط مچھلیاں اور کھردرے سخت ہاتھ دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا باپ ممکن ہے۔ اس خاندان کا کوئی جوان اور تگڑا نوکر رہا ہو گا۔ اس قسم کے تجربے بالعموم سڑک پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔

چندرو کی دنیا میں آواز کا اس حد تک گزر تھا کہ وہ سن سکتا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ عام طور پر گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف گونگا تھا۔ بہرہ نہ تھا۔ اس لئے حلوائی ایک دفعہ اُسے بچپن میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چندرو کا معائنہ کرنے کے بعد حلوائی سے کہا تھا کہ چندرو کے حلق میں کوئی پیدائشی نقص ہے۔ مگر آپریشن کرنے سے یہ نقص دور ہو سکتا ہے اور چندرو کو بولنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ مگر حلوائی نے کبھی اس نقص کو آپریشن کے ذریعہ دور کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہے کہ نوکر گالی سن سکے۔ اور اس کا جواب نہ دے سکے۔

چندرو کا یہی نقص اس کی نگاہ میں اس کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ اس دنیا میں مالکوں کی آدھی زندگی اس فکر میں گزر جاتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے نوکروں کو گونگا کر دیں۔ اس کے لئے قانون پاس کئے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹیں سجائی جاتی ہیں، اخبار نکالے جاتے ہیں۔ پولیس اور افواج کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں سن لو مگر جواب نہ دو۔

اور چندرو تو پیدائشی گونگا تھا۔ یقیناً سدھو ایسا احمق نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کروائے۔

سدھو بھی دل کا برا نہیں تھا۔ اپنے مخصوص حالات میں مخصوص حدود کے اندر اپنا مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتے ہوئے وہ چندرو کو اپنے طریقے سے چاہتا بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس بات پر نازش تھا اور اکثر اس کا فخریہ اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ اس نے چندرو کی پرورش ایک بیٹے کی طرح کی ہے۔ کون کسی یتیم بچے کی اس طرح پرورش کرتا ہے۔ اس طرح پالتا پوستا اور بڑا کرتا ہے۔ کون اس طرح اسے کام پر لگاتا ہے۔ جب تک چندرو کا لڑکپن تھا سدھو اس سے گھر کا کام لیتا رہا۔ جب چندرو ذرا لڑکپن کی پھلانگنے لگا تو سدھو نے اس کی خاطر ایک نیا دھندہ شروع کیا۔

حلوائی کی دکان پر تو اس کے اپنے بیٹے بیٹھتے تھے اس نے چندرو کے لئے چاٹ بیچنے کا دھندہ طے کیا۔ پہلے پہلے اس نے چندرو کو چاٹ بنانے کا فن سکھا دیا۔ جل جیرہ اور کانجی بنانے کا فن، گول گپے اور دہی بڑے بنانے کے طریقے، چٹخارہ پیدا کرنے والے تیکھے مصالحے کی کرکری پڑیا، اور چنے کا لذیذ چرچیلا سالن

بھٹورے بنانے اور تلنے کے انداز۔ پھر سموسے اور آلو کی ٹکیاں بھرنے کا کام۔ پھر چٹنیاں، لہسن کی چٹنی۔ لال مرچ کی چٹنی۔ ہرے پودینے کی چٹنی۔ کھٹی چٹنی۔ میٹھی چٹنی۔ ادرک کی چٹنی اور پیاز اور انار دانے کی چٹنی۔

پھر انواع و اقسام کی چاٹیں پروسنے کے انداز۔ دہی بڑے کی چاٹ۔ کانجی کے بڑے کی چاٹ۔ میٹھی چٹنی کے پکوڑوں کی چاٹ۔ آلو کی چاٹ۔ آلو اور آلو پاپڑی کی چاٹ۔ ہری مونگ کے گول گپے۔ آلو کے گول گپے۔ کانجی کے گول گپے۔ ہرے مسالے کے گول گپے۔

جتنے برسوں میں چندر نے یہ کام سیکھا تھا اتنے برسوں میں ایک لڑکا ایم۔ اے کر لیتا ہے۔ پھر بھی بیکار رہتا ہے۔ مگر سدھو کا گھر بیکار گریجویٹوں کو اگلنے کی یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چندر اپنے کام میں مشاق ہو گیا ہے اور جوان ہو گیا ہے تو اس نے چار پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی خرید دی۔ چاٹ کے تھال سجائے اور چندر کو چاٹ بیچنے پر لگا دیا۔ ڈیڑھ روپیہ روز پر۔

جہاں چندر چاٹ بیچنے لگا وہاں اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ سدھو نے نے بہت سوچ سمجھ کے یہ جگہ انتخاب کی تھی۔ کھار لنگ روڈ پر اور پالی کے نل کے چوراہے کے قریب ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے اس نے چاٹ کی چار پہیوں والی سائیکل گاڑی کو کھڑا کیا۔ یہ جگہ بہت بارونق تھی۔ ایک طرف یونین بینک تھا۔ دوسری طرف ٹیلی فون ایکسچینج۔ تیسری طرف ایرانی کی دکان۔ چوتھی طرف گھوڑ بندر روڈ کا ناکا۔ بیچ میں شام کے وقت کھاتے پیتے خوش باش خوش لباس

نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ چندرو کی چاٹ تازہ، عمدہ اور کراری ہوتی تھی۔

وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش ہوتی تھی۔ اس کا سودا ہمیشہ کھرا ہوتا تھا۔ بات صاف اور قول پورا۔ گاہک کو اور کیا چاہیئے۔ سو کی چاٹ اس نوآبادی میں چاروں طرف نازل ہوتی گئی اور شام کے وقت اُس کے ٹھیلے کے چاروں طرف نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ چندرو کو سدھو نے ڈیڑھ روپے روز پر لگایا تھا۔ اب اسے تین روپے روز دیتا تھا۔ اور چندرو جو ڈیڑھ روپیہ روز میں خوش تھا اب تین روپیہ یومیہ پاکر بھی خوش تھا۔ کیونکہ خوش رہنا اس کی عادت تھی۔ اُسے کام کرنا پسند تھا اور وہ اپنا کام جانتا تھا۔ اور اپنے کام سے اُسے لگن تھی۔ وہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا تھا۔ اور انہیں خوش کرنے میں اپنی خوشی محسوس کرتا تھا دن بھر وہ چاٹ تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ شام کے چار بجے وہ چاٹ گاڑی لے کر ناکے پر آجاتا۔ چار سے آٹھ بجے تک ہاتھ روکے بغیر، آرام کا سانس لئے بغیر وہ جلدی جلدی کام کرتا۔ آٹھ بجے اس کا ٹھیلہ خالی ہوجاتا۔ اور وہ اُسے لے کر اپنے مالک کے گھر واپس آجاتا۔ کھانا کھاکے سینما چلا جاتا۔ بارہ بجے رات کو سینما سے لوٹ کر اپنی چٹائی بچھاکر سیڑھیوں کے نیچے سو جاتا اور صبح پھر اپنے کام پر

یہ اس کی زندگی تھی۔ یہ اس کی دُنیا تھی۔ وہ بے فکر اور زندہ دل تھا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن۔ نہ بچے نہ بیوی۔ دوسرے لوگوں کے بہت سے خانے ہوتے ہیں۔ اس کا تو ایک ہی خانہ تھا۔ دوسرے لوگ بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ اور ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ہی ان کی شخصیت دیکھی جاسکتی ہے مگر

چندرو ایک ہی لکڑی کا تھا۔ اور لکڑی کے ایک ہی ٹکڑے سے بنا تھا۔ جیسا وہ اندر سے تھا ویسا ہی وہ باہر سے بھی نظر آتا تھا، وہ ذات میں بے جوڑ اور مکمل تھا

سانولی پارو کو، اسے پریشان کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بالے جھلاتی۔ پاؤں میں چھوٹی سی پازیب کھنکاتی جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ٹھیلے کے گرد کھڑی ہو جاتی تو چندرو سمجھ جاتا کہ اب اس کی شامت آئی ہے۔ دہی بڑے کی پتّل تقریباً چاٹ کر وہ ذرا سا دہی بڑا اس پر لگا رہنے دیتی اور پھر اُسے دکھا کر کہتی۔

"ابے گونگے، تو بہرہ بھی ہے کیا۔؟ میں نے دہی بڑے نہیں مانگے تھے۔ دہی پٹاگری مانگی تھی۔ اب اس کے پیسے کون دے گا۔ تیرا باپ ۔؟"

اتنا کہہ کر وہ اس بڑے کی تقریباً خالی پتّل کو اُسے دکھا کر بڑی حقارت سے زمین پر پھینک دیتی۔

وہ جلدی جلدی اس کے لئے دہی پٹاگری بنانے لگتا۔ پارو اس پٹاگری کی پتّل صاف کر کے اس میں آدھی پٹاگری چھوڑ دیتی اور غصّے سے کہتی۔

"اتنی مرچ ڈال دی۔۔۔ اتنی مرچ؟ ۔۔۔ چاٹ بنانا نہیں آتا، ٹھیلہ لے کر ادھر کیوں آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لے اپنی پٹاگری واپس لے لے۔"

اتنا کہہ کر وہ دہی اور چٹنی کی پٹاگری اپنے ناخن کے کونے میں پھنسا کر اس کے ٹھیلے پر گھماتی۔ کبھی اسے چھوٹی پٹاگریوں کے تھال میں واپس ڈال دینے کی دھمکی دیتی۔ اس کی سہیلیاں ہنستیں۔ تالیاں بجاتیں۔ چندرو دونوں ہاتھوں سے ناں

ناں کے اشارے کرتا ہوا پارو سے اپنی جھوٹی زمین پر چھینک دینے کا اشارہ کرتا۔

"اچھا سمجھ گئی۔ تیرے چموں کے تھال میں ڈال دوں" وہ جان بوجھ کر اس کا اشارہ غلط سمجھتی۔ جلدی جلدی جلدی گھبرائے ہوئے انداز میں چندرو زور زور سے سر ہلاتا۔ پھر زمین کی طرف اشارہ کرتا۔ پارو کھلکھلا کر کہتی۔

"اچھا زمین سے مٹی اٹھا کر تیرے دہی کے برتن میں ڈال دوں؟"۔ پارو نیچے زمین سے تھوڑی سی مٹی اُٹھا لیتی۔

اس پر چندرو اور بھی گھبرا جاتا۔ دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا کر منع کرتا۔

بالآخر پارو اسے دھمکاتی "تو چل جلدی سے آلو کی چھ ٹکیاں تل دے اور خوب گرم گرم مسالے والے چنے دینا۔ اور ادرک بھی۔ نہیں تو یہ پاپڑی ابھی جائیگی تیرے کالے گلاب جامنوں کے برتن میں۔ ۔ ۔"

چندرو خوش ہو کر پوری تیاری نکال دیتا۔ ماتھے پر آئی ہوئی ایک گھنگریالی لٹ پیچھے کو ہٹا کے تولئے سے ہاتھ پونچھ کے جلدی سے پارو اور اس کی سہیلیوں کے لئے آلو کی ٹکیاں تلنے میں مصروف ہو جاتا۔

پھر کبھی پارو حساب میں گھپلا کیا کرتی۔

سات پیسے کی ٹکیاں۔ تین پیسے کی پاپڑی۔ دہی بڑے تو میں نے مانگے ہی نہیں تھے۔ اس کے پیسے کیوں ملیں گے تجھے ۔ ۔ ؛ ہو گئے نو پیسے بس پیسے کل کے باقی ہیں ۔ ۔ ۔ ایک روپیہ"

کو رتا بند پیسے لینے سے انکار کرتا۔ وہ کبھی پارو کی شوخ چمکتی ہوئی

آنکھوں کو دیکھتا۔ کبھی اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں کپکپاتے ایک روپے کے نوٹ کو دیکھتا اور سر ہلا کر انکار کر دیتا۔ اور حساب سمجھانے بیٹھتا۔ وہ وقت قیامت کا ہوتا تھا۔ جب وہ پارو کو حساب سمجھاتا تھا۔ دہی بڑے کی سٹال کی طرف اشارہ کر کے اپنی انگلی کو اپنے منہ پر رکھ کر چپ چپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گویا اس سے کہتا۔

"دہی بڑے کھا تو گئی ہو۔ اس کے پیسے کیوں نہیں دو گی۔"

"تیس پیسے دہی بڑے کے بھی لاؤ۔" وہ اپنے گلے میں سے تیس پیسے نکال کر پارو کو دکھاتا۔ اس پر پارو چہک کر کہتی۔

"اچھا تیس پیسے مجھے واپس دے رہے ہو۔ ؟۔ لاؤ۔"

اس پر چندرو فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا۔ "نہیں،"

انکار میں وہ سر ہلا کر پارو کو سمجھاتا۔

"مجھے نہیں، تمہیں دینا ہوں گے، یہ تیس پیسے۔" وہ اپنی تہدیدی انگلی پارو کی طرف بڑھا کے اشارہ کر کے کہتا۔ اس پر پارو فوراً غصے سے ٹوک دیتی۔

"اپنا ہاتھ پیچھے رکھ . . . نہیں تو ماروں گی چپل۔"

اس پر چندرو گھبرا جاتا۔ پارو کی ڈانٹ سے لاجواب ہو کر بالکل بے بس ہو کر مجبور اور خاموش نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھنے لگتا۔ کہ پارو کو اس پر رحم آجاتا جیب سے پورے پیسے نکال کے اسے دے دیتی اور بولتی۔

"تو بہت گھپلا کرتا ہے حساب میں۔ کل سے تیرے ٹھیلے پر نہیں آؤں گی۔"

مگر دوسرے دن وہ پھر آجاتی تھی۔ اسے چندرو کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔

اور اب چندرو کو بھی مزہ آنے لگا تھا۔ جس دن وہ نہیں آتی تھی حالانکہ اس دن اس کی گاہکی اور کمائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی چندرو کو وہ دن سونا سونا سا لگتا تھا۔

جہاں پر اس کا ٹھیلہ رکھا تھا وہ اس کے سامنے کی ایک گلی سے آتی تھی پہلے پہل چندرو کا ٹھیلہ بالکل یونین بینک کے سامنے ناکے پر تھا۔ ہولے ہولے چندرو اپنے ٹھیلے کو کھسکاتے کھسکاتے پارو کی گلی کے بالکل سامنے لے آیا۔ اب وہ دور سے پارو کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ سکتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے ٹھیلہ یہاں لگایا تھا۔ تو پارو ٹھیلے کی بدلی ہوتی جگہ دیکھ کر کچھ چونکی تھی۔ کچھ غصے سے بھڑک گئی تھی۔

”ارے تو ناکے سے ادھر کیوں آگیا رے گونگے۔؟“

گونگے چندرو نے ٹیلی فون ایکس چینج کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں وہ اب تک ٹھیلہ لگاتا آ رہا تھا۔ ادھر کیبل بچھانے کے لئے زمین کھودی جا رہی تھی۔ اور بہت سے کالے کالے پائپ رکھے ہوئے تھے۔

وجہ معقول تھی۔ پارو لاجواب ہو گئی۔ پھر کچھ نہیں بولی۔ لیکن جب کیبل بچھ گئے اور زمین کی مٹی ہموار کر دی گئی تو پھر چندرو نے اپنا ٹھیلہ نہیں ہٹایا۔ تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ ہاں اس کے چنچل بچاؤ میں ایک عجیب تیزی سی آگئی۔ وہ اسے پہلے سے زیادہ ستانے لگی۔

پارو کی دیکھا دیکھی اس کی دوسری سہیلیاں بھی چندرو کو ستانے لگیں اور کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی مگر لڑکوں کو تو چندرو ڈانٹ دیتا۔ اور وہ جلدی سے

بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے پارو کی سہیلیوں سے عاجز آ کر انہیں بھی ڈانٹ بتائی تو اس پر پارو اس قدر ناراض ہوئی کہ اس نے اگلے تین چار روز تک چندر کو ستانا بند کر دیا اور اس پر چندر کو ایسا لگا کہ آسمان اس پر ڈھے پڑا ہو یا اس کے پیروں تلے زمین پھٹ گئی ہو۔ یہ پارو مجھے ستاتی کیوں نہیں ہے؟ طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے چاہا کہ پارو اسے ڈانٹ پلائے لیکن جب اس پر بھی پارو کے انداز نہیں بدلے۔ اور وہ ایک مہذب، متمدن لیکن چاٹ بیچنے والے چندر ایسے چھچھوروں کو فاصلے پر رکھنے والی لڑکی کی طرح اس سے چاٹ کھاتی رہی تو چندر اپنی گذشتہ حماقتوں پر بہت نادم تھا۔

ایک دفعہ اس نے بجائے پارو کے خود سے حساب میں گھپلا کر دیا۔ سوا روپیہ بنتا تھا۔ اس نے پارو سے پونے دو روپے طلب کئے، جان بوجھ کر۔ خوب لڑائی ہوئی۔ بالآخر سر جھکا کر چندر نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اور یہ گویا ایک طرح پچھلی تمام غلطیوں کی بھی تلافی تھی۔

چندر بہت خوش تھا۔ کیوں کہ پارو اور اس کی سہیلیاں اب پھر اسے ستانے لگی تھیں۔

بس اسے اتنا کچھ ہی چاہئے۔ ایک پازیب کی کھنک اور ایک شریر ہنسی جو پھلجھڑی کی طرح اس کی گذشتہ سنسان دنیا کے ویرانے کو ایک لمحے کے لیے روشن کر دے۔ پھر جب پارو کے قدم سہیلیوں کے قدموں میں گڈمڈ ہو کے چلے جاتے وہ اس کی پازیب کی کھنک کو دوسری پازیبوں کی کھنک سے الگ کر کے سن سکتا تھا۔ کیونکہ دوسری لڑکیاں بھی چاندی کی پازیبیں پہنتی تھیں۔ مگر پارو کی پازیب کی

موسیقی ہی کچھ اور تھی۔ یہ موسیقی جو اس کے کانوں میں نہیں اس کے دل کے کسی تہہ تاریک اور شرمیلے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا اور وہ اس میں خوش تھا۔

اچانک مصیبت نازل ہوئی۔ ایک دوسرے ٹھیلے کی صورت میں۔ کیا ٹھیلا تھا یہ! بالکل نیا اور جدید ڈیزائن کا۔ چاروں طرف چمکتا ہوا کانچ لگا تھا۔ اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف لال پیلے اودے اور نیلے رنگ کے کانچ تھے۔ گیس کے دو ہنڈے تھے جن سے یہ ٹھیلا بقعۂ نور بن گیا تھا۔ پتل کی جگہ چمکتی ہوئی چینی کی پلیٹیں تھیں۔ ٹھیلے والے کے ساتھ ایک چھوٹا سا چھوکرا بھی تھا جو گاہک کو بڑی مستعدی سے ایک پلیٹ اور ایک صاف ستھری نیپ کن بھی پیش کرتا تھا اور پانی بھی پلاتا تھا۔ چاٹ والے کے گلے کے گرد موگرے کے پھولوں کا ہار بھی لپٹا ہوا تھا۔ اور ایک چھوٹا ہار چاٹ والے نے اپنی کلائی پر بھی باندھ رکھا تھا اور جب وہ مسالا اور پانی میں گول گپے ڈبو کر پلیٹ میں رکھ کر گاہک کے ہاتھوں کی طرف سرکاتا تو چاٹ کی کراری خوشبو کے ساتھ گاہک کے نتھنوں میں موگرے کی مہک بھی شامل ہو جاتی اور گاہک مسکرا کر نئے چاٹ والے سے گویا کسی تحفے کی طرح اس پلیٹ کو حاصل کر لیتا اور نیا چاٹ والا گونگے چاٹ والے کی طرف تحقیر سے دیکھ کر پرنخوت آمیز آواز میں زور سے کہتا۔

چکھیے!!

ایک ایک دو دو کر کے چھندرو کے بہت سے گاہک ٹوٹ کر نئے ٹھیلے والے

کے گرد جمع ہونے لگے۔ تو بھی چندو کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پھر آجائیں گے۔ یہ اونچی دکان پھیکے پکوان والے کب تک چندو کی بھی اصلی اور صحیح مسالوں بچی ہوئی چاٹ کا مقابلہ کریں گے۔ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ اس نے دو ایک گاہکوں کو نئے چاٹ کی طرف جاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ بھی لیا تھا۔ اور اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ چکنی چمکتی پلیٹوں اور ہوٹل نما سروس کے باوجود انہیں نئے چاٹ والے کی چاٹ زیادہ پسند نہیں آرہی ہے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر اپنے کام میں جٹ گیا۔ یکایک اس کے کانوں میں ایک گھنگ سنائی دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک گیا۔

اس نے نگاہ اٹھا کے دیکھا۔

گلی سے پارو پازیب کھنکاتی اپنی سہیلیوں کے سنگ برآمد ہو رہی تھی۔ جیسے چڑیاں ایسے وہ لڑکیاں چہل رہی تھیں۔ کتنی ہی بڑی بڑی اور شوخ نگاہیں تھیں۔ فضا میں ابابیلوں کی طرح تیرتی ہوئیں وہ سڑک پار کر کے اس کے ٹھیلے کی طرف بڑھنے لگیں۔

اچانک پارو کی نگاہیں نئے ٹھیلے والے کی طرف اٹھیں۔ وہ رک گئی۔

اس کی سہیلیاں بھی رک گئیں۔

وہ سانس لئے بغیر پارو کی طرف دیکھنے لگا۔

پارو نے ایک اچٹتی سی نگاہ چندو کے ٹھیلے پر ڈالی۔ پھر نخوت سے اس نے منہ پھیر لیا۔ اور اک ادائے خاص سے مڑ کر اپنی سہیلیوں کو لے کر نئے ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گئی۔

"تم بھی — تم بھی — ؟ پارو تم بھی — ؟"

چندرو کا چہرہ غصے اور شرم سے لال ہو گیا۔ رگوں اور نسوں میں خون گونجنے لگا۔ جیسے اس کا حلق خون سے بھر گیا ہو۔ وہ کچھ بول نہیں سکا مگر اُسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بولنے کی کوشش کر رہا ہو وہ اس موٹی دیوار کو توڑ دے گا۔ جو اس کی روح کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس کے چہرہ کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے وہ ابھی چیخ کر کہے گا۔

"تم بھی۔ تم بھی — ؟ پارو تم بھی ؟"

مگر خون اس کے حلق میں بھر گیا تھا۔ اس کے کان کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی آوازیں سن رہے تھے۔ اور اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویائی کی آخری کوشش گویا کسی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی اور وہ سر جھکا کر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر اس بے چین پازیب کی کھنک ابھی تک اس کے دل میں تھی۔ پارو اور اس کی سہیلیاں نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع انواع و اقسام کی چاٹیں کھائے چلی جا رہی تھیں۔ اور بیچ بیچ میں تعریفیں کرتی جا رہی تھیں۔ ان سب میں پارو کی آواز سب سے اونچی تھی۔

"ہائے کیسی لذیذ چاٹ ہے۔ کیسے برابر کے مسالے ہیں۔ اس موئے (نام لیکر محض اشارہ کر کے)، پرانے ٹھیلے کو تو چاٹ بنانے کی تمیز ہی نہیں ہے۔"

"وہ اب تک جھوٹی تیلوں میں چاٹ کھلاتا رہا ہے۔"

"واری اس کے بات تو دیکھو۔ . . . . . " پارو نے جھک کر چندرو کی

کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسے گندے اور غلیظ ..... معلوم ہوتا ہے سات دن سے نہایا نہیں۔"

"ایک ٹیپ کی تو ہے نہیں اس کے پاس .... جب ہاتھ پر چھنے کے لئے مانگو دہی ..... اپنا گندا میلا تولیہ آگے کر دیتا ہے۔"

"اونہہ" پارو کے پتلے پتلے ہونٹ نفرت سے خم ہو گئے۔ "میں تو کبھی اس چاٹ والے کے منہ پہ تھوکوں بھی نا۔"

اس کے آگے چندرو کچھ نہ سن سکا۔ ایک لال آندھی اس کی آنکھوں میں چھا گئی وہ گونگوں کی سی ایک وحشت زدہ چیخ کے ساتھ اپنا ٹھیلا چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس نئے ٹھیلے والے کو جا لیا۔ اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ لڑکیاں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔

چندرو نئے ٹھیلے والے اور اس کے چھوکرے دونوں پر بھاری ثابت ہوا۔ چندرو ایک وحشی جانور کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے نئے ٹھیلے والے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے ٹھیلے کے سارے کانچ توڑ ڈالے۔ چھوکرے کی پٹائی کی۔ نیا ٹھیلہ مع اپنے ساز و سامان کے سڑک پر اوندھا دیا۔ پھر سڑک کے بیچ کھڑا ہو کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔

عدالت میں اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ عدالت نے اسے دو ماہ کی قید کی سزا دی اور پانسو روپیہ جرمانہ اور جرمانہ نہ دینے پر چار ماہ قید بامشقت۔

سدھو حلوائی نے جرمانہ نہیں بھرا۔

اور دوسرا کون تھا جو جرمانہ ادا کرتا؟

چندرو نے پورے چھ ماہ کی جیل کاٹی۔

جیل کاٹ کر چندرو نے پھر سدھو حلوائی کے گھر پہنچ گیا۔ کوئی دوسرا اس کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ سدھو حلوائی پہلے تو اسے دیر تک گالیاں دیتا رہا اور اس کی حماقت پر اُسے بے نقط سناتا رہا اور دیر تک چندرو سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اگر وہ گونگا بھی نہ ہوتا تو کس سے کیا کہتا۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے ایک ٹھیلے والے کو مارا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک پازیب کی کھنک سنی تھی۔

جب سدھو حلوائی نے خوب اچھی طرح گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ تو اس نے اُسے پھر کام پر لگا لیا۔ چندرو بے حد ایماندار اور محنتی اور اپنے کام میں مشاق تھا۔ اب جیل کاٹ کے آیا ہے۔ تو تھوڑی سی عقل آگئی ہوگی کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے دو تین دن کے بعد پھر سے چندرو کو اُسی اڈّا پر ٹھیلہ دے کر روانہ کر دیا۔

چندرو کی غیر حاضری میں سدھو نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ اس نے چندرو کے ٹھیلے پر نیا رنگ و روغن کرا دیا تھا، کانچ بھی لگا دیا تھا۔ پتلوں کی جگہ کچھ سستی قسم کی چینی کی پلیٹیں اور چمچے بھی رکھ دیئے تھے۔

چندرو چھ ماہ بعد پھر سے ٹھیلہ لے کر روانہ ہوا۔ آٹھویں، دسویں اور گیارھویں

سڑک پار کرکے لنگنگ روڈ کے نکڑ پر آیا۔ یونین بینک سے گھوم کر ٹیلی فون ایکسچینج کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا جہاں پر پہلے اس کا ٹھیلہ تھا۔ اب اس جگہ اس نئے ٹھیلے والے نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہی جو چھوکرا ہے، وہی ٹھیلے والا ہے۔ اس ٹھیلے والے نے گھور کر چندر و کو دیکھا۔ چندر و نے اپنی نظریں چرا لیں۔ اس نے نئے ٹھیلے والے سے کچھ فاصلے پر ایکسچینج کے ایک طرف اپنا ٹھیلہ روک دیا۔ اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔

چار بج گئے۔ پانچ بج گئے، کوئی گاہک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔ دو ایک گاہک آئے مگر وہ نئے تھے اور اُسے جانتے نہیں تھے۔ چار چھ آنے کی چاٹ کھا کر چل دیئے۔ افسردہ دل چندرو سر جھکائے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی تولیہ لے کر پانی چھڑکتا۔ ڈوئی ڈال کر گھڑے میں مسالا دار پانی کو ہلاتا۔ انگیٹھی میں آنچ ٹھیک کرتا۔ ہرے ہرے آلو کے بھرتے میں مرچ کے دانے اور مسالے ڈال کر ٹکیاں بناتا رہا۔

پھر یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی کھنک سی سنائی دی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ اپنے جھکتے ہوئے سر کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا مگر اس کا سر اوپر نہیں اٹھتا تھا...... پازیب کی کھنک اب سڑک پر آگئی تھی۔

پھر جسم و جان کا زور لگا کر اس نے اپنی گری ہوئی گردن کو اوپر اٹھایا اور جب دیکھا تو اس کی آنکھیں پاروہ پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ اس کے ہاتھ سے ڈوئی گر گئی۔ اور تولیہ اس کے کندھے سے اتر کر نیچے بالٹی میں بھیگ گیا اور ایک گاہک

نے قریب آکر کہا۔

"مجھے دو سموسے دو۔"

مگر اس نے کچھ نہیں سُنا۔ اس کے بدن میں جتنے حواس تھے۔ جتنے احساس تھے۔ جتنے جذبات تھے۔ سب کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آگئے تھے اب اس کے پاس کوئی جسم نہ تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔

یہ اس کا ٹھیلہ تھا۔ وہ چند قدم پر دوسرا ٹھیلہ تھا اور وہ تکے جا رہا تھا۔ پارو کدھر جائے گی؟"

ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لڑکیاں سڑک پر چلتے ہوئے ان دونوں ٹھیلوں کے قریب آرہی تھیں زیر لب بحث دھیرے دھیرے ساتھ چل رہی تھی۔

یکایک جیسے اس بحث کا خاتمہ ہوگیا۔ لڑکیوں نے سڑک پار کرکے نئے ٹھیلے والے کو گھیر لیا۔

مگر چندرو کی نگاہیں نئے ٹھیلے والے کی طرف نہیں پھریں۔ وہ اس خلا میں دیکھ رہا تھا۔ گلی اور سڑک کے سنگم پر۔ جہاں آج چھ ماہ کے بعد اس نے پارو کو دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے دنیا و مافیہا، گرد و پیش سے بے خبر ادھر ہی دیکھتا رہا۔

وہ پتھر کی طرح کھڑا صرف خلا میں دیکھ رہا تھا۔ یکایک بڑی تیزی سے پارو اپنی سہیلیوں سے کٹ کر اس کے ٹھیلے پر آگئی۔ اور چپ چاپ اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی ہوگئی۔ اسی لمحہ گونگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ آنسو نہیں تھے۔ الفاظ تھے، شکرانے کے۔ دفتر تھے

شکایتوں کے ۔ اُبلتے ہوئے آنسو فصیح اور بلیغ جملوں کی طرح اس کے گالوں پر بہتے آرہے تھے ۔ اور پارو سر جھکائے سن رہی تھی ۔

آج پارو گونگی تھی اور چندر و بول رہا تھا ۔ ارے وہ کیسے کیسے اس پگھلے ہے کہ پارو نے بھی تو چھ ماه انہیں آنسوؤں کا انتظار کیا تھا ۔

عصمت چغتائی

زہر کا پیالہ

میرے پیدا ہونے کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی۔ مجھ سے پہلے پانچ بھائی اور تین بہنیں وارد ہو چکی تھیں۔

اماں بچوں سے دب چکی تھیں۔ دو چار بچوں تک تو وہ ماں بننے کی خوشیاں مناتی رہیں پر جب بچوں سے گھر ہی دیکھ لیا تو وہ ماں بننے کو سزا سمجھ کر جھیلنے لگیں۔

میرے ابا میاں کو بچہ بازی کی لت تھی خواہ وہ مرغی کے چوزے ہوں یا کتے کے پلے وہ انہیں بڑے انہماک سے پالتے جونہی چوزے انڈا کھٹک کر باہر آتے۔ ابا میاں کی کوشش ہوتی کہ جلد سے جلد انہیں علیحدہ کر دیں تاکہ مرغی کڑک جھاڑ کر انڈے دینے لگے اسی طرح جونہی بچہ پیدا ہوتا وہ اگلے سے ایک، دو دھانہ کولن بلوا کر بچہ اس سے بدلا دیتے اور اماں نئے جیو کی تیاری میں الجھ جاتیں۔

میری انّا کا نام نیکو تھا۔ سانولی سلونی کمسن لونڈیا سی تھی۔ پہلوٹھی کا بچہ جس کو غریبی سے مقابلہ کرنے اسے چاول کی بیچ پر چھوڑ کر مجھے اپنا خون چسانے آنا پڑا تھا۔

دو چار روز اپنے بچے کی یاد میں روئی پیٹی پھر فراموش، رات ملا کچھ دھمکیاں ملیں تو ہار جھک مار کر ڈیوٹی پر جٹ گئی۔

جب کبھی میں اپنی آنا ٹیکو کا خیال کرتی ہوں تو میرا وجود شرم سے سرنگوں ہو جاتا ہے ادھر میں پھول پھول کر کپا ہوتی جارہی تھی۔ ادھر اس کا پہلوٹھی کا پوت رنجھ رنجھ کر موت کی طرف رینگ رہا تھا۔ جب چھ مہینے کے بعد وہ اگرا گئی تو اس کے کلیجا کا ٹکڑا سوکھ کر ہڈیوں کا ہار بن چکا تھا۔ یہ مٹکا سا پیٹ کھپچی سے ہاتھ پیر! الے سوکھے کی بیماری بڑی تیزی سے نکل رہی تھی جو جُئیں اس کے جسم پہ جونکوں کی طرح لپٹی رہا سہا خون چوس رہی تھیں۔ پلکوں تک میں لیکھیں بھر گئی تھیں۔ میں ہک ہک کر گشتیوں چلنے لگی تھی اور وہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد مردار تپلی کے مرض میں مبتلا کھری کھاٹ پر پڑا سانس کی دھونکنی چلایا کرتا تھا اس کے جبڑے دودھ کھینچنے کی طاقت کھو چکے تھے۔ جب آنا نے اس کے منہ میں دودھ دیا تو وہ اناڑیوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔ اور میں نے شک و حسد کی آگ میں بھسم ہوکر اسے کھسوٹ کر دور پھینک دیا اور خود جٹ گئی۔

انا سال میں دو بار اپنے گھر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ مغلانی بی اور بی دارو غہ جی مزید احتیاط کے لئے جاتے تھے۔ میں مغلانی کے ساتھ فرسٹ کلاس میں رکھی جاتی تھی اور اسٹیشنوں پہ انا بھاگم بھاگ مجھے دودھ پلانے آیا کرتی تھی۔ گرنی واڑے میں جب لاؤ لشکر پہنچتا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جمعدار کے مالک صاف صحن میں بانس کی نئی کھاٹیں خرید کر ڈالی جاتیں۔ جن پہ مغلانی بی اپنا صاف ستھرا بستر بچھا کر ناک سکیڑ کر بیٹھ جاتیں۔ نیا چھینٹ کا لہنگا پہنے انا اِدھر اُدھر منڈلاتی پھرتی وہ جتنی کوشش اپنی اہمیت جتانے کی کرتی، مغلانی بی بڑی صفائی سے کاٹ جاتیں اور رات کو اس کے ڈر سے کہ کہیں مردار اپنے خصم سے نہ مل بیٹھے، اس کی کھاٹ پٹی سے

ملا کر سوتیں۔ باہر کنڈی چڑھا کر داروغہ جی ڈٹ جاتے۔ اگر پھر سے کہیں گابھن ہو بیٹھی تو دودھ زہر ہو جائے گا اور میں نگوڑی ہڑک جاؤں گی۔

رات کو انّا کا شوہر دارو پی کر آتا اور بہت دند مچاتا۔ اس کی آواز سن کر انّا گرم کیتلی کی طرح بلبلا اٹھتی۔ مگر مغلانی کی مغلظات سن کر بس سسکیاں بھر کے دبک رہتی۔ شوہر خوب شور مچاتا لوگ باگ اکٹھے ہو جاتے۔ وہ ایک پل کو انّا کی صورت دیکھنے کے لئے گڑگڑاتا۔ اٹھارہ انیس برس کا لونڈا ہی تو تھا۔ بڑی منتوں سماجتوں سے داروغہ جی اسے اندر لاتے۔

”رانی“! وہ بھینسے کی طرح ڈکارتا۔

”سوامی!“ انّا اس کے پیروں کو چھونے بڑھتی اور وہیں سب کے سامنے وہ بولائے کتوں کی طرح ایک دوسرے کو جھنجھوڑنے لگتے

داروغہ جی بی مغلانی اور آٹھ روپے روٹی کپڑے درمیان میں کود پڑتے۔ شوہر کو اس کے بھائی بند گھسیٹتے لے جاتے اور انّا بے وقت ہی مجھے دودھ پلانے پر بضد ہو جاتی۔ مگر دودھ میں جیسے زہر گھل جاتا اور میں واویلا مچانے لگتی۔

صبح کی گاڑی سے لشٹم پشٹم واپس لوٹ آتا۔

دوسری دفعہ جب انّا گھر گئی تو میں پیروں چلنے لگی تھی۔ اس کا بچہ خود بیٹھنے لگا تھا۔ سوکھے کے ساتھ ہوکے کی بیماری بھی لگ گئی تھی بس کھائے چلا جاتا تھا۔ خاک مٹی، کوڑا کرکٹ، مرغیوں کی بیٹ، پھل، ترکاری کے چھلکے، غرض جو ہاتھ آ جاتا سوکھی سوکھی انگلیوں میں دبوچ کر منہ میں گھسیڑ لیتا۔ اسی وجہ سے اُسے مستقل دست آتے رہتے تھے۔ اس کے چاروں طرف پتلی پتلی غلاظت کی ایک جھیل سی بن جاتی،

جس کے کناروں پہ مکھیوں کی گوٹ جمی رہتی۔ بیچ میں وہ ایک سنسان بنجر جزیرے کی طرح ڈٹا بسیرا کرتا۔ المونیم کا ایک ٹیڑھا کبڑا پیالہ اس کی کل جمع پونجی تھی۔ اس پیالے سے اس کی کربناک زندگی کی جملہ رعنائیاں وابستہ تھیں۔ یہ پیالہ اس کی ماں کا تھا اور یہی اس کا اَن داتا۔ اگر گھڑی بھر کو پیالہ قطروں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ یتیموں کی طرح ہائے ویلا مچانے لگتا۔ اُسے کلیجا سے لگائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔

جب اُسے بھوک لگتی جو ہر وقت ہی لگی رہتی تھی۔ تو وہ دونوں ہاتھوں سے پیالہ بجاتا کبھی بندر کی طرح زمین پر گھستا۔ فقیر کی طرح لوگوں کو دکھا کر اس میں کھانا ڈالنے کی تلقین کرتا۔ کتنا بھی کھلا دو ازلی بھوک قائم رہتی۔ کیونکہ معدہ اور آنتیں ڈھلان کی نالی کی طرح تھیں، خوراک نہایت تیزی سے بھاگتی دوڑتی اس کے پیٹ میں سے اچھوتی نکل جاتی اور وہ پھر خالی کا خالی رہ جاتا۔

یہ پیالہ اس کا کھلونا بھی تھا ہمدم دو ساز بھی۔ گھنٹوں بیٹھا اُسے سوکھے سوکھے ہاتھوں سے ٹٹولا کرتا۔ جیسے بچے بسکٹ چباتے ہیں۔ ایسے دودھ کے ننھے ننھے دانتوں سے اس کے کنارے چبایا کرتا۔ پھر وہیں غلاظت کی جھیل میں کوڑے پہ منہ رکھ کر سو جاتا۔

ٹیکو کو دیکھ کر وہ بُری طرح سہم گیا کہ کہیں وہ اس کا پیالہ تو نہیں چھیننے آگیا ہے۔ خیر ابھی خون نے جوش نہ مارا اور ٹیکو کا خون اب اس کے جسم میں رہا بھی نہ تھا۔ کب کا جھیل میں بہہ چکا تھا۔

ٹیکو کو بھی اس پر ممتا نہ آئی بلکہ شاید اس کے وجود سے شرم اور گھن آتی ہوگی

میں سفید ولائتی جوتیاں پہنے سارے صحن میں ہڑبڑ بھاگتی پھرتی۔ محلّہ ٹولے کی عورتیں یہ عجوبۂ روزگار دیکھنے جوق در جوق آ رہی تھیں۔ اور ٹیکو حقِ ملکیت جتانے کے لئے بار بار شلوکے کے بٹن کھول کر مجھے لبھا رہی تھی۔ اس کا جسم میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ کبھی بھولے سے بھی اس کے شلوکے کا بٹن کھل جاتا تو میں اس پر ٹوٹ پڑتی۔ وہ مجھے چڑھانے کے لئے جسم کھولتی اور جب میں ہمک کر آتی تو شرارت سے اوندھی ہو جاتی اور میں بلک بلک کر اس کے نیچے گھسنے کی کوشش کرتی۔ وہ بے تحاشہ لوگوں کو دکھاتی پھر مجھے کلیجے سے لگا کر چومنے لگتی۔ دور اس کا بچہ جھیلوں کے بچوں بیچ بیٹھا لوہے کے چنے چبایا کرتا۔

رات کو حسبِ معمول اس کے شوہر نے دنگا مچایا خوب سی دارو چڑھا کر مستانے سانڈ کی طرح ڈکرانے لگا۔ جب جی بھر کے گالیاں دیں اس نے میرے ابا میاں تک کو نہ چھوڑا۔ انہیں ٹیکو کا یار بنا ڈالا۔ جب کسی پر بھی بس نہ چلا تو اپنی ماں کو لاتیں ماریں اور باپ کے سر پر لٹھ جما دیا۔ داروغہ نے فوراً ابا میاں کے دوست تھانے دار صاحب کو اطلاع دی وہ جھٹ دو کانسٹیبل لے کر موقعۂ واردات پر پہنچے اور شوہر نامدار کو دنگا فساد برپا کرنے کی پاداش میں پکڑ کر لے گئے۔ وہاں اس کی ایسی تاجپوشی ہوئی کہ جوی کا عشق ناک کے راستے نکل گیا۔

ادھر ٹیکو کنگنا رہی تھی۔ رو رہی تھی اور اس کے ساتھ میں بھی ہلکان ہو رہی تھی۔

ملانی بی درود پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

اور تنوا پیالہ پیٹ رہا تھا جیسے وہ طبلِ جنگ ہو۔

میں کوئی ڈیڑھ برس کی تھی۔ اماں نئے جیو کو جنم دینے کے لئے بھری بیٹھی تھیں۔

اب کے چھ ماہی پر ٹیکو نے گھر جانے کی بات سنی اَن سنی کر دی تھی۔ وہاں اس کے لئے سوائے کوفت کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ گھر جاتے کوفت ہوتی تھی۔ پہلے دو سال کی عمر میں میرا دودھ چھوٹ جائے تو پھر انّا کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

کچھ دن سے انّا بے حد چڑچڑی ہو گئی تھی۔ بات بات پہ جھنجھلا کھلاتی۔ راہ چلتوں کو چھیڑتی، مجھے لئے لئے گھومتی، کبھی باورچی سے کھٹ پٹ ہو رہی ہے کبھی دھوبی سے اُلجھ رہی ہے کہ للی کے کپڑے ٹھیک سے نہیں دھوتا۔

مگر میں دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی راتوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی، اس کی بوٹیاں چباتی۔ ہر وقت اس کے شلوکے کے گرد منڈلاتی رہتی۔ دوپہر کو عموماً بھس والی کوٹھڑی میں ٹھنڈا اپنا کرتی اور اپنی اوڑھنی بچھا کر مجھے اس پر سلا دیتی اور خود بیٹھے بیٹھے سروں میں کھجریاں الاپتی رہتی۔ شاید بھوسے کا کوئی تنکا چبھ گیا یا میری چھٹی حِس نے جاگ کر مجھے جگا دیا۔

اگر کوئی کتا بلی کھانے کے خوان پر جھپٹا نظر آئے تو انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے وہی خاکسار کی ہوئی ہوگی۔ میری لاڈلی انّا کے شلوکے کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور دارو غہ جی ــــــ

میری چیخوں کی آواز سن کر تمام نوکر دوڑ پڑے۔ شاید بٹیا کو سانپ نے ڈس لیا۔

مگر سانپ کی جگہ اژدہا دیکھ کر لوگ بھونچکے رہ گئے۔ جب ہی میری انّا کا دودھ زہر ہو رہا تھا۔

دودھ کی بوتل ٹوٹ جائے یا اسے کتا نجس کر دے تو کوڑے کے ڈبہ میں

پھینک دیتے ہیں۔ ٹیکو کو پہلی گاڑی سے آگرہ روانہ کر دیا گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر جوڑے۔ اماں کے قدموں پر ناک گھسی کہ اب وہ کسی کرم کی نہیں رہی۔ اسے برادری میں کون گھسنے دے گا۔ اور پھر داروغہ جی کا تحفہ وہ کس کے منہ پر مارے گی۔ مگر سنوائی نہ ہوئی۔

میرے ابا میاں جو مجسٹریٹ تھے اپنے انصاف اور حق پرستی کے لئے مشہور تھے سوچتی ہوں تو عقل کام نہیں کرتی کہ انہوں نے میری انا کو کیسے نکال دیا۔

اس وقت وہ ساڑھے سترہ برس کی تھی اس کی یاد میں میں نے اپنا کلیجہ نکال ڈالا۔ بہنیں مجھے کندھے سے لگائے رات رات بھر ٹہلتیں مگر میری انا کی یاد اس کے شلوکے کی گرم گرم مہک ہوک بن کر اٹھتی رہی۔ اور میں روتی رہی۔

یادداشت کا پہلا صفحہ الٹتی ہوں تو دھند ہی دھند ہے کوئی میلا میلا بھورا سا۔ ہیولا سا ہے کوئی سفید سفید چیز پیس رہا ہے۔ شاید کھیر کے لئے چاول ہیں۔ دور کہیں کہیں کوئی تھکی ہاری عورت بین کر رہی ہے۔

"ہائے مورا پوت!"

میرے پاس تو منوا کا پیالہ بھی نہیں جسے ٹٹول کر دل کی بھڑاس نکالوں۔ بس میں روتی ہوں۔ کس کا پوت؟ کہاں چلا گیا؟ میں کچھ نہیں جانتی بس روتی ہوں۔

میں اپنی منجھلی بہن کے سینے سے لگی صدیوں سے رو رہی ہوں۔ میں اس کے گریبان کے بٹن ٹٹولتی ہوں۔ شرم سے سرخ ہو کر وہ مجھے دور پھینک دیتی ہے۔ بڑی اماں نفل بجا جاتی ہیں۔ میری باجی مجھے پھر اٹھا لیتی ہے۔

"نہیں! توبہ ۔۔۔۔۔۔ توبہ!" وہ مجھے گریبان کی طرف گھورتے ہوئے

دیکھ کر تنبیہہ کرتی ہے۔

"نیش . . . . قبر . . ." میں تاکید کرتی ہوں، وہ ہنس پڑتی ہے نظروں کے سامنے سے رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں ہنستی گزر جاتی ہیں۔ باریک باریک روشن سلاخیں جال سا بنتی ہیں۔ میں بڑی ہو جاتی ہوں۔ اب حلق پھاڑ کر چلانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر بھی چلاتی ہوں۔ بھائیوں کی پلٹن کے ساتھ باغوں اور کھیتوں پر دھاوے بھی مارتی ہوں کبھی خربوزوں کی فالیز پر تو کبھی کچی کیریوں کی دھن میں گھنی امرائیوں میں سرگرداں پھرتی ہوں۔ زندگی ایک شور ہے ایک سریلا ہنگامہ ہے جس کا ماحصل نوچ کھسوٹ اور گتھم گتھا۔ ایک جھگڑتے چیختے ماحول کا ایک پُرمسرت پُرآواز حصہ میں بھی ہوں۔

خوب غل مچتا ہے برتن کھڑکھڑاتے ہیں ڈھول پٹتے ہیں۔ گھنگرو بجتے ہیں۔ اور باجی بیاہ کر چلی جاتی ہیں۔

میں پھر یتیم رہ جاتی ہوں جنگلوں جنگلوں ویران گھوم رہی ہوں روح اور جسم پہ بیل کی پیڑیاں جمتی جاتی ہیں۔ میں کسی کی لاڈلی نہیں۔ کسی کا بوجھ نہیں میری داداگیری سے لوگ عاجز ہیں۔ مرغیوں کو کھدیڑنا، کتوں کے ڈھیلے مارنا ہر ذی روح کو تنگ کرنا میرا مقصدِ حیات ہے۔ اماں جب پکڑ پاتی ہیں جی بھر کے میری دھول جھاڑتی ہیں اور اپنے جی کا غبار۔

آج کل کے والدین تو بچوں کی تربیت پر کتابیں پڑھتے ہیں۔ میرے زمانے میں کتابوں سے بچوں کو کوٹا جاتا تھا بشرطیکہ وہ ضخامت موٹی ہوں۔

سب عاجز آ کر کہتے۔ یہ کولن کی لونڈیا ہے اس کا خون رنگ لا رہا ہے

ہائے کولن مجھے پھینک کر کہاں چلی گئی ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ میں سانولی سلونی

ٹھوڑی پر گودنے کے تین سیاہ نکتے مجھے یاد رہ گئے۔ اب بھی جب مجھے یاد رہ گئے، اسے بھی تب کبھی میں تینوں نکتے گدنا ہوئی ٹھوڑی، دیکھتی ہوں، تو جی گھبرانے لگتا ہے تنہائی کا احساس امڈ آتا ہے۔

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھینس والی بڑی اماں کی مرغیوں کو ستا رہی تھی وہ ظہر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ اور قوقوں کے بولنے سے معذور تھیں۔ ایک دم میرے نام کی پکار پڑی۔ اماں کو بیٹھے بیٹھے مجھ پر پیار تو آیا نہ ہوگا پھر یہ کونسی شامت آگئی ہوگی! دالان میں اماں اپنی مخصوص جگہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ اور ان کے پیر پکڑے وہ بیٹھی تھی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میرے دل پر دھائیں سے موگری پڑی پیر پھیلنے لگے۔ ٹھوڑی کے تین نکتے! تین سنسناتی گولیاں میرے حواس جاتے رہے پلٹ کر بگٹٹ بھاگی۔

پر اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا۔

"ہائے موری چڑیا!"

وہ مجھے ننھی سی چڑیا کی طرح ہانپتی ہوئی چھوڑ کے گئی تھی۔ اس نے مجھے گود میں اٹھانے کی کوشش کی وہ چت گری اور اوپر میں، میں جو گیارہ برس کی عمر میں اس سے لمبی اور چوڑی تھی۔

میں نے اس کے پنجے سے چھوٹنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، نوچا کھسوٹا دھکے دیئے، مگر نہ جانے میرے ہاتھوں میں ست کیوں نہ رہا۔ وہ مجھے دبوچ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔

اور میں بھی رونے لگی۔

میں نے لمحہ بھر کے لئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بالکل وہ مجبور لمحہ! وہ اس کے شلوکے کی بھونی بھری مہک۔ جیسے میں ماں کے پیٹ میں سو رہی ہوں وہ مجھے گائے کی طرح چاٹ رہی تھی۔ دکھانے کو میں اب بھی کسمسا رہی تھی۔ مگر میری ساری طاقت اس کی گود میں پگھل چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔ ایک دم اس نے اپنے شلوکے کے بٹن کھول دیئے۔

"للی تو دودھ پئے گی؟" اس نے میرے منہ میں دودھ ٹھونس دیا۔

ہم عمر بچے مجھے گھیرے ہی لئے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ قہقہے مارنے لگے۔ میں نے اسے زور کا دھکا دیا اور سرپٹ بھاگی۔

"بی بی جی۔ للی دودھ نا پیتی؟" اس نے اماں سے شکایت کی اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کہ میں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

میں غسل خانہ میں چھپ کر خوب روئی۔ ٹیکو نے بھرے مجمع میں مجھے ذلیل کر کے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ سب نے مجھے اتنا چھیڑا کہ سسک سسک کر دعائیں مانگنے لگی۔ اللہ ٹیکو مر جائے۔ مر جائے۔ ٹیکو اماں تو مر جائے۔ ہائے ٹیکو اماں۔ ٹیکو میری چڑھ بن گئی۔

مگر ٹیکو نہیں مری۔ وہ سال چھٹے مہینے میرے لئے المونیم کے پیالے بیں چمچے، زمرمے شکر کے کھلونے۔ بھونڈی مٹی کی گجریاں۔ اور ہاتھی گھوڑے لایا کرتی۔ وہ میری رگ پہچان گئی تھی۔ سب چھیڑتے ہیں۔ اس لئے اکیلے میں دیا کرتی۔

پھر بڑی رازداری سے پوچھتی۔

"للی دودھ پئے گی؟"

میں روٹھ جاتی تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔

تب ہولے ہولے مجھے ابا اور اماں کی باتوں سے پتہ چلا کہ ٹیکو کے میاں کو جب اس کے کرتوتوں کا پتہ چلا تو اس نے اتنا مارا کہ بغیر دائی کی مدد کے اسے داروغہ جی کے تحفے سے نجات مل گئی۔ میاں نے ایک نٹنی ڈال لی تھی۔ ٹیکو بال بچہ بھی نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ اس لئے اسے مار کر نکال دیا۔

ٹیکو نے ننوا کو بہت رجھانے کی کوشش کی اسے دودھ بھی دینا چاہا مگر عورت کی چھاتیاں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ وہ اپنا پیالہ بجاتا رہا اور پھر اس پر منہ رکھ کر سو گیا۔ اور ایسا سویا کہ پھر جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

ٹیکو اس پیالے سے سر پھوڑ پھوڑ کر روتی رہی، بین کرتی رہی سسکتی رہی۔ یہ وہی زہر میں بجھا ہوا پیالہ تھا۔ جس میں وہ میرے لئے کھیلیں بتاشے لایا کرتی تھی۔ جس سے مجھے شدید گھن آتی تھی۔ جیسے ننوا کے مردہ نیلے ہونٹ اب بھی اس کے کناروں پر رینگ رہے ہوں۔

پھر کئی سال کے لئے ٹیکو غائب ہو گئی۔ اب مجھے اس سے چڑھ بھی اُتنا بڑا ہو گئی۔ اس بات پر کبھی شرم نہیں آتی تھی کہ میں نے کونسی کا دودھ پیا تھا کونسی جس نے مجھے دودھ پلانے کے جرم میں اپنی زندگی کا سب کچھ ہار دیا تھا۔ کونسی جو میری ماں تھی۔

پھر وہی چلچلاتی دھوپ بھری دوپہر تھی کہ گلی میں لونڈوں کا غل سنائی دیا باؤلے کتوں سے بدبچا چھڑانے کے لئے گرتی پڑتی۔ دروازے دھڑدھڑاتی ایک

جھرکٹ سی بڑھیا گھر میں داخل ہوئی۔

رام کسن کھڑے ہیرے دوار۔ ہم لجا سے جھکی جھکی جائیں۔" اس نے بیچ صحن میں

ہلکا ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھ کر تھرکنا شروع کر دیا۔

میں نے کتنی کہانیاں لکھیں! ہنستی کھلکھلاتی، روتی۔ بسورتی اور کاٹتی۔

بھنبھوڑتی، انہیں لکھتے وقت ہنسی بھی ہوں اور روئی بھی۔ اپنا خون بھی کھولایا ہے

مگر ٹیکو ماں کا ذکر لکھتے وقت جو کرب اور جو جھلاہٹ میں محسوس کر رہی ہوں اسے

لکھتے ہوئے میرا قلم ہم چھوڑ دیتا ہے۔ چاہتی ہوں کہ وہ ٹیسوں کے بگولے جو میرے

دماغ میں اٹھ رہے ہیں انہیں بانٹ کر ذرا اس بوجھ کو ہلکا کر دوں جو ہمیشہ ٹیکو کے

تصور سے میرا دم گھونٹنے لگتا ہے۔ مگر نہیں۔ یہ میرے امکان میں نہیں۔

سب ہنس رہے تھے! وہ پاگلوں کی طرح ناچ رہی تھی۔ اس کا درد میری

رگوں میں لاوا بنکر کھول رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھی سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔

ہمیشہ وہ مجھے دیکھ کر بہہ جایا کرتی تھی۔ آنکھوں میں مٹھاس بھر جاتی ممتا سے

جسم نڈھال ہو جاتا۔

"میری چڑیا!" کہہ کر وہ میری طرف لپکتی، اور میں چڑھ کر بھاگا کرتی۔

مگر اس دن اس کی آنکھوں میں زہر میں ڈوبی اجنبیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ لال

لال آنکھوں میں ممتا کی چتا دہک رہی تھی۔

اس کا گریبان ناف تک چاک تھا۔ نرم گرم سانولے سینے کے بجائے لیترے جھول

رہے تھے۔

"للّی دودھ نہ پئے گی ؟" اس نے نہ پوچھا۔

اس کی بغل میں وہی المونیم کا پیالہ تھا جس کے کناروں پر ننوا کے دانتوں کے نشان تھے اور جس میں وہ میرے لڑے نشکر کے کھلونے اور کھیلیں لایا کرتی تھی۔ وہ پیالہ زہر سے چھلک رہا تھا۔

"بجے بوٹی جہر بس پیالہ جو میں نے ننوا کو دیا۔" پیالہ زمین پر اوندھا کر وہ ایک پیر سے کھڑی ہو کر گھوم گئی۔

ٹھوڑی پر گدے ہوئے تین سیاہ نقطے ترشول بن کر میرے کلیجے میں اتر گئے اور وہ تمام کا تمام زہر جو اس کے وجود میں پھنکار رہا تھا۔ ہرے ہرے وجود میں رسنے لگا۔

لوگ تماشے سے اکتا کر اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے دور تک اس کے بین گرجتے رہے

"بجے بوٹی جہر بس پیالہ۔"

پھر وہ کبھی نہیں آئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے۔ وہ زہر میں بجھا ہوا پیالہ کہاں ہے؟ جس کے کنارے پر ننوا کے اودے اودے مردہ ہونٹ جنم جنم کی پیاس لئے اب بھی سسک رہے ہوں گے۔

ہاجرہ مسرور

پھر لہو گیا ہے

وہ بھی جاڑوں کی ایک شام تھی۔ اس دن گہرے دھوئیں جیسے بادلوں سے پھوار ایسی موہوم سے انداز سے گر رہی تھی۔ یہ پھوار پرانی متروکہ کوٹھی کی کچی چھت اور صحن میں پہلے ہموار طریقے پر گرتی رہی اور جذب ہوتی گئی۔ لیکن پرانے انداز کے ملبہ سے سرخ برآمدے کی کائی لگی منڈیروں اور کگروں پر بھی پھوار گرتی۔ تو سمٹ سمٹ کر بوندیں بن جاتیں۔ اور پھر نیچے پھیلے ہوئے پانی کے ننھے ننھے گڑھوں میں ٹپ سے گر جاتیں کہنے کو فرخندہ خانم کرسی پر بیٹھیں ایم۔ اے نفسیات کے آخری سال کا آزمائشی پرچہ حل کر رہی تھیں لیکن ان کا سارا وجود برآمدے کے ماتھے پر سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندوں میں جیسے نہار رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سردی میں صاف ہوا سے دماغ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کوئی حرج نہیں کہ جسم پرانے کوٹ میں ٹھٹھرتا ہے۔ لیکن دماغ نفسیاتی داؤ پیچ سلجھانے کے لئے آمادہ ہو سکے۔

ٹپ ٹپ پانی کی بوندیں فرخندہ خانم کے لئے گھڑی کی ٹک ٹک بن گئیں جس سے انہیں وقت کے گزرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ تب اسی ملبے سے برآمدے کے دوسرے سرے پر کوٹھی کے آخری کمرے سے ایک اجنبی شخص ربڑ کی چپل گھسیٹتا

باہر نکلا۔ فرخندہ خانم نے نیچی نظروں سے دیکھا اس کے بال احتیاط سے جمے ہوئے تھے اور عینک کے شیشوں کے پیچھے محتاط آنکھیں دور کچھ دیکھ رہی تھیں۔ گیلی گیلی شام کے اس سے وہ شخص فرخندہ خانم کو ایک دم ٹوٹ کر اچھا لگا۔ مگر فرخندہ خانم جس طرح بیٹھی قلم چلا رہی تھیں چلاتی رہیں۔ انہیں اپنا جی مارنا خوب آتا تھا۔ یہ اجنبی صاحب ریاضی کے لیکچرار عبادالرحمٰن تھے۔ جو صوبے کے ایک دور دراز کے کالج میں ملازم تھے ان کے ہاتھ میں ریاضی کی ایک کتاب تھی جو وہ پڑھتے پڑھتے تھک گئے تھے۔ وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے یہاں آئے تھے۔ تاکہ یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں سے مشورہ کر سکیں۔ بے حد محتاط پڑوسی کی طرح برآمدے میں خطِ تقسیم کے طور پر رکھے ہوئے گملوں کے اس پار انہوں نے ایک نظر ڈالی جہاں فرخندہ خانم بیٹھی نفسیات کا پرچہ حل کر رہی تھیں۔ جب عبادالرحمٰن کے لئے اس کا چھوٹا ماموں زاد بھائی چائے کی ایک پیالی لایا گیا تو عبادالرحمٰن کو خیال آیا کہ کوئی حرج نہیں اگر وہ اس بیچاری طالب علم لڑکی کو چائے کے لئے پوچھ لے۔

عبادالرحمٰن کے لئے کتاب پر جھکا ہوا ہر لڑکا اور لڑکی ان کے شاگرد کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ فرخندہ خانم نے کنکھیوں سے دیکھا کہ منضبط سے جھجک قدموں سے چل کر وہ گملوں کی دیوار تک آ گئے "آپ نے چائے پی کر نہیں؟"

عبادالرحمٰن نے سنجیدہ اور متفکر سی آواز میں پوچھا "ابھی نہیں۔" فرخندہ خانم نے بغیر چونکے آہستہ سے سر اٹھا کر عبادالرحمٰن کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا، جس میں چائے کی پیالی تھی۔ پھر اس چہرے کی طرف جس میں ایک عجیب سی سادگی اور خوبصورتی تھی "پھر یہ آپ پی لیجئے۔" عبادالرحمٰن نے کہا۔ اور فرخندہ خانم نے

ہاتھ بڑھا کر پیالی یوں لے لی جیسے واقعی چائے پر اُس کا حق فائق ہو۔ دونوں کی انگلیاں چھو گئیں۔ فرخندہ خانم نے اپنی آنکھیں جھکا کر چائے پینا شروع کر دی۔ لیکن فرخندہ خانم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی بڑی بڑی آنکھیں سانولے چہرے پر بُری نہیں لگتیں۔ لیکن جھک کر یہ کوئی خاص تاثر پیدا نہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کی پلکیں کچھ چھدری اور گری ہوئی سی تھیں فرخندہ خانم نے فوراً ہی اپنی آنکھیں اٹھائیں "امتحان پاس کرنے کے لئے پڑھنا بہت بورنگ (BORING) ہوتا ہے" عباد الرحمٰن نے جیسے اپنے آپ سے کہا "نہیں کچھ ایسا زیادہ بورنگ بھی نہیں ہے بلکہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا تصوّر ہی خیال میں دلچسپ ہوتا ہے۔" فرخندہ خانم نے ذرا اعتماد سے کہا پھر جلدی جلدی چائے کا گھونٹ اتارنے لگیں۔

موضوعِ گفتگو ختم ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ برآمدے کے کائی لگے ماتھے سے ٹپا ٹپ کر کے پانی کے قطرے ایک ہی سُر میں نیچے گر رہے تھے لیکن ان کی آواز میں فرخندہ خانم کو سرگم کے سارے سُر سنائی دیئے۔ سڑک پر سے چھم چھم کرتا کوئی تانگہ گزرا۔ فرخندہ خانم کو ایسا لگا جیسے کوئی لڑکی گھنگرو باندھے کہیں ناچ رہی ہو۔ سامنے لگے درخت پر ایک کوا پھڑ پھڑا کر پتوں میں ڈوب گیا۔ فرخندہ خانم کو پتوں کی سرسراہٹ بھلی معلوم ہوئی۔

پھر دور نالے کے پاس جھونپڑیا نکلے جا تو معانی کہ تور سے سوکھے پتوں کا نیلا دھواں پھیلا ای موہوم سی چادر کو چیرتا ہوا عنبر کی طرح اوپر اٹھنے لگا۔ فرخندہ خانم جیسے اسی نیلے دھوئیں میں لپٹی اوپر اٹھتی گئیں۔

پھر فرخندہ خانم کے ہاتھ کی پیالی میں چائے ختم ہو گئی اور خالی پیالی کو تھامے فرخندہ خانم نے ایک لمحے کو سوچا کہ اسے کیا کریں۔ پھر اس نے وہ پیالی عباد الرحمٰن کی طرف بڑھا دی۔

پہاڑوں کی اس بھیگی بھیگی شام کی یہ مختصر سی خاموش سی کہانی دوسرے دن ہی انجام کو پہنچ گئی۔ جب عباد الرحمٰن کی ممانی پہلی بار گلوں کی حد بندی پھلانگ کر فرخندہ خانم کے یہاں پہنچیں اور عباد الرحمٰن کے لئے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے فرخندہ خانم کا رشتہ مانگ لیا۔

فرخندہ خانم نے سنا تو جیسے بے انتظار اس کے سر پہ بجلی گر پڑی۔ اتنی بڑی بات اور پھر چند لمحوں میں انجام پا گئی۔ جب فرخندہ خانم کو ہوش آیا تو وہ اپنے گھر کے میلے دھندلے آئینے کے سامنے بڑی دیر تک کھڑی رہیں۔ انہیں ایکدم پتہ چلا کہ وہ سب لڑکے جو یونیورسٹی میں اس کے ساتھ پڑھتے تھے محض اس کے حسن سے مرعوب ہو کر دور دور رہتے تھے۔ امتحان کے ختم ہونے سے پہلے فرخندہ خانم بیگم عباد الرحمٰن بن گئیں۔ یہ سب اتنی جلدی اور اتنی سادگی سے ہوا کہ فرخندہ خانم کو اپنی اکلوتی عزیز سہیلی کی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ شادی ہو رہی ہے۔ گو عباد الرحمٰن نے صاف کہہ دیا تھا کہ شادی سادگی سے ہونا چاہیئے پھر بھی سب دھوم دھڑکے کی کمی محسوس کر رہے تھے۔

شادی کی رات کو فرخندہ خانم کا رُواں رُواں قوتِ سماعت سے لبریز تھا۔ وہ سننا چاہتی تھیں کہ تم بڑی حسین ہو، میں پہلی نظر میں تمہیں دل دے بیٹھا، میں تمہارے حصول کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

آخر عباد الرحمٰن نے بولنا شروع کیا۔

”ہم دو چار دن یہاں اور رہیں گے۔ آپ کو اگر ممانی سے کوئی تکلیف پہنچے تو محسوس نہ کیجئے گا۔“

”کیوں؟“ فرخندہ خانم نے پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

”وہ مجھ سے اور آپ سے دل میں ضرور ناراض ہوں گی۔ میں نے ان کی بیٹی کو نظر انداز کر کے آپ سے شادی کی ہے نا۔“ عباد الرحمٰن نے آہستہ سے بتایا۔

فرخندہ خانم کا دھڑکتا ہوا دل جیسے رک گیا۔ انہوں نے غور سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ان کا تمام جسم ایک تمتماتے ہوئے کان کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

"کیوں ؟" ۔ فرخندہ خانم کے تپتے ہوئے حلق سے جانے کیسے یہ لفظ نکل سکا۔ ان کا سارا جسم شرمانے اور مسرت سے پھپٹ پڑنے کو ٹپکنے لگا۔

اب وہ کہیں گے میں تم پر دیکھتے ہی مر مٹا۔ ہائے کیسی شرم کی بات ہے مگر عباد الرحمٰن نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"میں نے شمشہ کو اس لئے نظر انداز کیا کہ وہ ناپختہ ذہن کی لڑکی تھی۔ میں مرد اور عورت کے تعلق کو عقلی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ فطری طور پر عورت کو مرد کی اور مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شعر پڑھنے۔ چاند اور پھولوں کے مکالمے بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک سمجھدار عورت ایسی بے عقلی کی باتوں سے کیسے خوش ہو سکتی ہے۔ ہے نا؟"

عباد الرحمٰن جیسے حرفِ آخر کہہ کر خاموش ہو گئے، "آپ نے پھر ۔ مجھے ۔ مجھے کیوں ۔

فرخندہ خانم یہ سوال پیش کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن الفاظ ان کے قابو میں نہ تھے۔

"تم میں جو اعتماد اور سادگی تھی اس نے مجھے متاثر کیا" عباد الرحمٰن نے مسکراتے ہوئے کہا اور فرخندہ خانم کو لگا۔ آنکھیں اور چہرے کتنا جھوٹ بولتے ہیں۔ "تم کون تھیں اور کیا تھیں مجھے تمہارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ آئندہ ہو گی، تم مجھے اس لمحے اچھی لگیں۔ یہ لمحہ میرے لئے اہم ہے فرخندہ خانم"! عباد الرحمٰن نے کہا اور فرخندہ خانم نے یوں محسوس کیا کہ عباد الرحمٰن نے میرے وجود کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اس کے ماضی کو ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح افق میں گر کر کھو گیا اور وہ اس نئی ادھوری شکل میں جیسے دوبارہ پیدا ہوئی۔

"اگر میں آپ کو قبول نہ کرتی تو کیا ہوتا" فرخندہ خانم جیسے ٹوٹا ستارہ ڈھونڈنے لگیں "شاید مجھے تھوڑا افسوس ہوتا۔ مگر یہ سوچ کر خوشی بھی ہوتی کہ تم اپنی رائے پر عمل کرنے کی قوت بھی رکھتی ہو۔ میں زندگی بھر تمہیں احترام سے یاد کرتا" عباد الرحمٰن نے خلا میں آنکھیں ڈبو کر

بڑے پیارے انداز سے کہا۔ "جی۔ جی۔" فرخندہ خانم نے اس طرح یہ الفاظ ادا کئے جیسے وہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت کر رہی ہوں۔ وہ نفسیات کی طالب علم تھیں اور نفسیات کا علم محبت کی ساری معصومیت، ساری نزاکت کو الجھے دھاگوں کا گچھا بنا ڈالتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ عورت ہر کتاب پڑھنے کے باوجود اس کتاب سے منحرف نہیں ہوتی جسے اس کی فطرت تحریر کرتی ہے اور جو دل کے محفوظ ترین طاق میں سجی ہوئی ہے مگر فرخندہ خانم نے بڑے وثوق سے خود کو یقین دلایا کہ عبادالرحمٰن نے ان کو حسین زاویے سے دریافت کیا ہے۔ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں۔ وہ دونوں بہت جلدی محانی کے گھر سے دور اپنا گھر بسانے چلے گئے۔

لیکن یہ عجیب بات تھی فرخندہ خانم دن بھر اپنا گھر لیپا تیں پھر بھی انہیں یوں لگتا کہ اس گھر سے اٹھ کر ان دونوں کو کہیں اور جانا ہے۔

وہ ایم۔ اے کر کے ملازمت ضرور کر لیتیں، اگر ان کے بچہ نہ ہونے والا ہوتا۔ کیونکہ عبادالرحمٰن ان لوگوں میں سے تھے جو عورت کو برابر کی چیز جانتے ہیں۔ اور عورت کی معاشی آزادی کو ترقی کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں۔

وہ فرخندہ خانم سے کبھی تو کہتے کہ قمیض میں بٹن لگا دیجئے یا پانی کا گلاس دیدیجئے۔

یہ دوسری بات تھی کہ فرخندہ خانم دیوانگی کی حد تک سگھڑ بیوی ثابت ہوئیں۔ اتنی کہ جب وہ اور عبادالرحمٰن کسی بے حد دقیق علمی مسئلے پر بات کر رہے ہوتے تو انہیں یاد آتا۔ ارے ٹک ثیلیت پر تو آج جھاڑن ماری ہی نہیں۔ کوئی آجائے تو کیا کہے گا۔

جب عبادالرحمٰن کالج جانے کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہن کر روانہ ہوتے تو فرخندہ خانم کے جسم میں احساس کمتری کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ اس سے بچنے کے لئے

وہ ساری کا پلّو کمر میں کھونس کر ایک ایک چیز کی جھاڑ پونچھ شروع کر دیتی اور ساتھ ساتھ چھوٹے سے ملازم لڑکے پر اتنا چلاتی اتنا برستی کہ اس کی معمولی سی مشکل اور بگڑ جاتی۔ لیکن عبادالرحمٰن کی کالج سے واپسی سے قبل فرخندہ خانم منہ ہاتھ دھو کر انسان کی شکل بن جاتیں۔ سلونے رنگ پر گہری عنابی لپ اسٹک سے وہ اپنے نچلے ہونٹ کو بڑی اچھی تراش دیتیں اور بڑی بڑی کالی آنکھوں کو کاجل کے حصار میں قید کر لیتیں۔ انہیں اب اپنی گری گری سی پلکوں کو مسکارا کے ذریعہ اٹھانا بھی آ گیا تھا۔ "کوئی خبر؟ ..." فرخندہ خانم مسکرا کر ہمیشہ دروازے پر ہی عبادالرحمٰن سے پوچھا کرتیں۔

"میں آ گیا ہوں"۔ عبادالرحمٰن ہمیشہ ہنس ہنس کر ایک ہی جواب دیتے اور عبادالرحمٰن کی شخصیت پھیل کر جیسے گھر کے ذرّے ذرّے پر چھا جاتی۔ فرخندہ خانم اس شخصیت کے سائے میں سمٹ کر بیٹھی رہ جاتیں۔

راتوں کو دونوں اپنی اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو عبادالرحمٰن بڑے دلچسپ انداز سے اپنی باتیں شروع کر دیتے۔ اپنے کالج، اسٹاف کی باتیں، طالب علموں کی حرکتیں، اور فرخندہ خانم ایسی دلچسپی سے یہ باتیں سنتی اور ان پر تبصرہ کرتی جیسے وہ ہر بات اپنے سامنے ہوتی دیکھ رہی ہو۔

عبادالرحمٰن کی کچھ مشکلیں بھی تھیں۔ مثلاً وہ جس گریڈ کا حقدار تھا اسے دینے میں خواہ مخواہ دیر کی جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ پرنسپل صاحب کی خوشامد نہیں کرتا تھا۔ "ہنھ ابھی آپ ملازمت چھوڑ دیں تو پتہ چلے گا انہیں ریاضی کے پروفیسر ملتے کہاں ہیں"۔ فرخندہ خانم بڑے فخر سے کہتی اور عبادالرحمٰن کو اپنی مشکلیں اتنی مشکل معلوم نہ ہوتیں۔ عبادالرحمٰن کبھی کبھی اپنے قصے سناتے۔

"میں جب چھوٹا سا تھا کیا ہوا کہ پتنگ لوٹنے کو کوٹھے پر چڑھ گیا"۔ عبادالرحمٰن کہتے جاتے اور فرخندہ خانم اس کے پیچھے پیچھے جیسے تخیل میں ہاتھوں کا سایہ کئے گھومتی رہتیں "ہائے تم پتنگ لوٹنے منڈیر پر کیوں چڑھتے تھے۔ اور جو خدانخواستہ گر جاتے"۔ فرخندہ خانم بہت پریشان ہو کر

کہتیں "ہاکی کھیلتے ہوئے جو پنڈلی پر چوٹ لگی تو" عبادالرحمٰن سناتے "ہائے چوٹ دکھتی تو نہیں اب۔ تو یہ اس طرح کے کھیل بڑے ہوتے ہیں۔ فرخندہ خانم کو چوٹ کی کھسک اپنے دل پر محسوس ہوتی۔ اور عبادالرحمٰن لمبی لمبی سانس لیتے۔ مسکراتے بہاؤ کے خلاف تیرتے۔ اپنے ماضی کے اندھیرے تالابوں میں ڈوبتے۔ اُبھرتے کنولوں کی طرح ہاتھ بڑھاتے تھے۔ فرخندہ خانم کو کبھی کبھی حیرت ہوتی کہ عبادالرحمٰن اپنے ماضی کا ذکر اتنے مزے سے کیوں کرتے ہیں۔ پھر وہ سوچتیں شاید اس لئے کہ اس دونوں کی اپنی مشترکہ زندگی اتنی مکمل اور بھرپور ہے کہ اس بارے میں بات بھی کیا ہو سکتی ہے؟

باتوں باتوں میں فرخندہ خانم عبادالرحمٰن کی گزشتہ زندگی سے اتنی واقف ہو گئیں جیسے وہ بچپن سے ان کے ساتھ رہی ہوں جیسے وہ ان سے بڑی ہوں، جیسے خود فرخندہ خانم نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہو۔ بڑے ہونے کا یہ احساس اس حد تک بڑھا کہ وہ عبادالرحمٰن کو کالج جانے کے لئے رخصت کرتے وقت کہا کرتیں۔

"دیکھئے سائیکل سڑک کے کنارے کنارے چلایئے گا۔ اور پرنسپل سے بحث نہ کیجئے گا۔"

راتوں کو فرخندہ خانم نیند سے آنکھیں میں ستاروں کی مدھم روشنی میں سوئے ہوئے عبادالرحمٰن پر جھک جاتیں۔ ان کے گھنے ریشمی بالوں کو ہولے ہولے چھوتیں۔ ان کا ہاتھ بے طور کہیں دبا ہوتا تو اسے اٹھا کر آرام سے رکھ دیتیں اور انہیں دیکھے جاتیں جب سوتے میں عبادالرحمٰن ان کی طرف سے کروٹ بدل لیتے تو فرخندہ خانم کے دل کا گداز تنہائی کے احساس تلے دب جاتا۔

اندھیری رات میں فرخندہ خانم مدتوں کے بچھڑنے سے نحوست کا خیال آتا۔

چھوٹی چھوٹی دیواروں پر چوروں کے جھانکتے ہوئے سروں کا وہم ہوتا۔ پیٹ میں آنے والی زندگی کی حرکت سے تو وہ لرز جاتیں۔ انہیں بچے کو جنم دینے کے خیال سے ڈر معلوم ہوتا۔ فرخندہ خانم کا جی چاہتا کہ عبادالرحمٰن کو ان کے یہ سارے وہم یہ وسوسے اور خوف معلوم ہو جائیں۔ لیکن

پھر ڈر جاتی کہ عباد الرحمٰن انہیں کیا سمجھے گا۔ کتنے شرم کی بات ہے۔ کہ وہ اور عام عورت کی طرح سمجھی جائے، کاش کبھی عباد الرحمٰن کے سامنے وہ اپنے بچپن کا ذکر کر سکتیں۔ اس بچپن کا جہاں ان کے وسوسوں کی جڑیں تھیں۔ لیکن عباد الرحمٰن نے تو پہلے دن ہی فرخندہ خانم کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ بات وہ بھول نہ سکی تھیں۔ ایک دن فرخندہ خانم کے سر میں درد تھا وہ دن بھر بستر پر یوں ہی اجڑی پڑی رہیں۔

"میں تمہارے لپ اسٹک لگا دوں۔" عباد الرحمٰن نے اچانک اُن سے پوچھا۔ "کیوں۔۔؟"

عباد الرحمٰن نے اس کیوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسپرین کا پیکٹ ڈھونڈنے لگے۔ فرخندہ خانم کے دل میں بد صورتی کا احساس سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اور دماغ پر ٹپ ٹپ کر کے جیسے دُکھ ٹپکنے لگا "میں جانے کیا سوچا کرتی تھی جب کنواری تھی اتنے بہت سے خیالات تھے۔ ایسے نرم جیسے دُھنکی ہوئی روئی کے گالے۔" فرخندہ خانم نے کہنا شروع کر دیا اور پھر اپنی آنکھیں خلا میں ڈبو کر عباد الرحمٰن کے اس سوال کی منتظر رہیں۔ کہ وہ کیا سوچتی تھیں فرخندہ خانم نے خود بھی نہ بتایا کہ وہ کیا سوچا کرتی تھیں۔ شاید وہ دونوں ہی جانتے تھے۔ کہ عورت کے تخیل کی اڑان کے ڈر سے مرد کا ذہن گرفتہ ہو جاتا ہے۔

پھر مُنا کے گھر آگیا ان کی باتوں میں منے کی غوں غاں بھی شامل ہو گئی۔

فرخندہ خانم کو اب آئینے کے سامنے جانے کی فرصت ہی نہ تھی۔ شادی کے ایک سال کے اندر ہی وہ خود کو اتنا بڑا اتنا سنجیدہ اور عقل مند سمجھنے لگی تھیں کہ اس بوجھ سے تھکی تھکی رہتیں۔ ہر دن ایک سا دن معلوم ہوتا اور ہر رات ایک سی رات۔ پھر یہ یکسانیت فرخندہ خانم پر برف کے گالوں کی تہہ پر تہہ گرنے لگی گرتی چلی گئی۔ ہر گزرا ہوا دن ان تہوں کے تلے دبتا گیا چھپتا گیا۔ اچانک فرخندہ خانم کو اپنا ادھورا ایم۔ اے یاد آیا اور وہ پڑھنے میں جُٹ گئیں۔

رات گئے جب وہ پڑھ کر بستر پر لیٹتیں تو عباد الرحمٰن کو میٹھی نیند میں غرق دیکھتی وہ انہیں رحم بھرے نظروں سے دیکھتی۔ جانے کیوں فرخندہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے اور عباد الرحمٰن کے درمیان کوئی ایسی شے ہے جو نہیں ہونا چاہئے تھی۔

ہمدردی کے احساس سے مغلوب ہو کر وہ عباد الرحمٰن کو چھوتی اور پھر یہ سوچتی ہوئی سو جاتی کہ اسے عباد الرحمٰن کا زیادہ خیال کرنا چاہئے۔

دسمبر کی چھٹیاں ان دونوں کی اسی کوٹھی میں لے آئیں۔ جہاں ان کی کہانی شروع ہو کر فوراً ختم ہو گئی تھی۔ تو اب کہانی ختم ہونے کے بعد کیا چیز تھی جس کی کمی فرخندہ خانم کی رگ رگ میں بس گئی تھی۔

ابھی اس نے اکلوتی عزیزہ سہیلی کو بتایا تھا کہ وہ دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہے اور اس کی سہیلی نے بھی اس کا دکھڑا دیا تھا کہ اس کا میاں اُس پر نہ صرف حکومت کرتا ہے۔ بلکہ شکی مزاج ہے۔ فرخندہ خانم آج بھی نفسیات کی

کتاب لئے برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ گملوں کی حد بندی ۔ جیسے میکے اور سسرال کی علامت تھی۔ وہ اپنے میکے کی پرانی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس دن بھی خوب زور کی بارش ہو کر تھمی تھی۔ بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے اور ایک موہوم سی پھوار نرم نرم نہاتی ہوئی مٹی میں جذب ہو رہی تھی۔

عبادالرحمٰن چپلیں گھسیٹتے عمانی والے حصے کے آخری کمرے سے نکلے۔ فرخندہ خانم نے آنکھیں نہ اٹھائیں۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے ہوئے عبادالرحمٰن نے اُن کی انگلی پکڑنا چاہی۔

چھن چھن کرتا ہوا تانگہ سڑک پر سے گزر گیا۔ کوّے درخت پر بسیرے کے لئے شور مچاتے رہے اور رانی جانو نے وقت پہ اپنا تنور گرم کرنا شروع کر دیا۔ تو سوکھے پتوں کا دھواں مرغولے بن کر فضا میں مینار کی طرح بلند ہو گیا۔ مگر فرخندہ خانم ویسی کی ویسی بیٹھی تھیں۔ ٹپ ٹپ ٹپ کائی لگی منڈیروں اور لکڑوں سے پانی کے قطرے نیچے گڑھوں میں گر رہے تھے۔ تب ایک اسکوٹر کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوا۔ فرخندہ خانم نے آنے والوں کو نہیں دیکھا۔

اسکوٹر دیوار کی آڑ میں رُک گیا۔

فرخندہ خانم یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔

پھر برساتی میں لیٹے ہوئے ایک شخص سامنے آ گئے آ کر دعوتی کارڈ انہیں پکڑا لیا۔ بچے کی سالگرہ کا بلاوا تھا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" فرخندہ خانم نے نام پڑھ کر پوچھا۔

"وہ آپ کو جانتے ہیں۔ بریلی میں آپ سے گھر کے پاس رہتے تھے۔ وہ خود ساتھ آئے ہیں۔"

"بلاؤں انہیں؟" اس شخص نے پوچھا اور فرخندہ خانم کو وہ صاحب یاد آ گئے۔ سارا بوجھ جھٹک کر وہ گملوں کی حد بندی پھلانگتی اپنے سسرال والے حصے کی طرف بھاگیں۔ اسکوٹر کی آواز سن کر باہر آئے ہوئے عبادالرحمٰن سے فرخندہ خانم ٹکرائیں۔

"میں نہیں جانتی۔ وہ کون ہیں۔ بس کہہ دیجئے وہ آ جائیں گے انہیں ٹال دیجئے" فرخندہ خانم نے نیلے تھرّاتے ہونٹوں سے یہ الفاظ بہ مشکل ادا کئے اور بستر پر گر گئیں۔

جب عبادالرحمٰن واپس اندر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ فرخندہ خانم آتشدان میں جلتی ہوئی آگ پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔

"تم کسی چیز سے ڈر گئی ہو۔ تمہیں کیا ہوا۔" عبادالرحمٰن نے ان کا ہاتھ چھوا اور فرخندہ خانم گیلی دیوار کی طرح بستر پہ ڈھ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ عبادالرحمٰن نے پریشان ہو کر فرخندہ خانم کے جسم پہ لحاف ڈال دیا اور فرخندہ خانم شدید سردی میں کپکپانے لگیں "گیارہ بارہ سال کی کسی لڑکی کے پاؤں کوئی دھلا دے تو گناہ ہے" فرخندہ خانم نے کپکپاتی ہوئی ہذیانی آواز میں پوچھا۔ "نہیں تو" عبادالرحمٰن نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "اس زمانے میں مجھے ننگے پاؤں پھرنے میں مزا آتا تھا ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ آ

گندی لڑکی تیرے پاؤں دھلاؤں۔ مجھے بڑی گدگدی ہوئی میں نے اس کے بال پکڑ لئے یہ کوئی گناہ تھا؟ — نہیں تو۔"

"پھر۔ . . . عبادالرحمٰن نے اس سے بھاری آواز میں پوچھا۔

"پھر میں بڑی ہوئی تو اس نے شادی کا پیغام بھیجا۔ میری امی نے نہیں کر دی۔" فرخندہ خانم نے تھرتھراتے ہونٹوں سے کہا۔

"تم ہاں کرنا چاہتی تھیں" عبادالرحمٰن نے جانے کیسے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مگر اب وہ میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔ وہ کیوں آیا ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے وہ مجھے نہیں بھولا۔" فرخندہ خانم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور بے تحاشا رونے لگیں

"اوہ۔ تمہیں کوئی بھول سکتا ہے فردؔ۔ مجھے دیکھو ایک دفعہ تمہیں دیکھا تھا پھر کیا ہوا؟"

عبادالرحمٰن نے فرخندہ خانم کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں جھانک کر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔ اور فرخندہ خانم کی آنکھیں منڈ نے لگیں یہ بیچارہ کہاں سے تمہیں ڈھونڈنے آ پہنچا۔ تم کیوں ڈر گئیں؟ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔" عبادالرحمٰن نے کہا اور اپنی بانہیں فرخندہ خانم پر پھیلا دیں۔ اور زندگی میں پہلی بار فرخندہ خانم نے اپنے آپ کو دنیا کے ہر خطرے سے محفوظ سمجھا۔ پہلی مرتبہ وہ ان بانہوں کے بوجھ تلے ننھی سی ضدی بچی کی طرح سسکتی ہوئی نرم نرم روئی کے گالوں جیسے پُر لطف خواب میں ڈوب گئیں عبادالرحمٰن کے منہ سے چند بول سننے کے لئے ہی جیسے وہ پچیس سال کی عجیب سی بے خوابی میں مبتلا تھیں۔ انہیں یوں لگا جیسے عبادالرحمٰن کی بانہیں لمبی ہوتی گئیں۔ بہت لمبی یہاں تک کہ انہوں نے ساری کائنات کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے۔

اور عبادالرحمٰن اس کے ٹھنڈے ماتھے پر اپنا گال رکھے پانی کے ٹپ ٹپ کرتے ہوئے

قطروں کی جل ترنگ سنتا رہا اور سوچتا رہا۔

ہنہ ڈر گئی، پگلی کہیں کی۔ اور بال تو دیکھو کتنے گندے ہو رہے ہیں۔ سویرے اس کا سر دھلاؤں گا۔ شدید پیار کے جذبے سے صباء الرحمٰن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور پھر فرخندہ خانم کی پیشانی ان آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

فرخندہ خانم نے آنکھیں کھول کر صباء الرحمٰن کو دیکھا اور پھر لوٹیں آنکھیں بند کر لیں جیسے اس کی پیاسی رُوح سیراب ہو گئی ہو۔

عبدالرحمٰن چغتائی

گورے گورے ہاتھ

طے پایا تھا وہ دہلی کے اسٹیشن پر ملیں گے۔

جب وہ اسٹیشن سے باہر نکلے تو دونوں کی گردنیں فخر اور تمکنت سے بلند تھیں۔ آنکھوں میں جراءت، چمک اور کشش تھی۔ پروین کے بائیں بازو پر اس کا برقع تھا وہ دونوں اس خوبصورتی سے قدم اٹھائے بے تکلفی سے بڑھے چلے جا رہے تھے جیسے ان کی منزل ان کے سامنے ہے اور دیکھنے والوں کو یہ گمان ہوتا تھا۔ وہ بازوؤں میں بازو ڈالے اپنے رشتے کو آپ سے آپ سراہ رہے ہیں۔ نوخیز نوعمر پروین کے شانوں پر اس کے گھنے گھنے بال ہلارے لے رہے تھے۔ یہ بال اس نے بڑے چاؤ سے ترشوائے تھے۔ جن کی خوشنمائی پر اسے ناز تھا۔ لٹوں کی لٹیں جب اس کے تمتاتے ہوئے گالوں کو چھو کر پھر شانوں سے آ لگتیں، اور لمحہ بھر کے لئے رُکتیں تو وہ کچھ کمی محسوس کرتی جیسے اس کے گالوں پر سے جلتے ہوئے لب اُٹھ گئے ہیں، وہ چلتے رہے۔ ان کی اجنبیت ان کا ساتھ دیتی رہی۔ برقع اوڑھ لینے سے کہیں زیادہ اس وقت برقعے کا سلجھاؤ اور حسن اس کے تناؤ میں

اس کا مددگار بن رہا تھا۔ جس سے اس کے کھیلنے کا سلیقہ اور زیادہ نمایاں ہو کر کچھ کا کچھ بنتا جا رہا تھا اور کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر اپنے برقع کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ یا وہ اس کو جزوِ حسن سمجھ رہی تھی۔ وہ خود ہی نقاد تھی اور خود ہی حسن برقع ہر بار اس کے بازو کی لوچ لچک سے سینے کے لاکٹ کی مانند مچلتا۔ سانس لیتا اور اس کے ذوق کی آئینہ داری کرتا۔ گہرے اودے رنگ کا برقع اس کے لباس کا حصّہ تھا۔ وہ مسکراتی تو ایک دنیا مسکراتی اور اس کے آگے بڑھتے میں آنکھیں بچھاتی تھی۔ جو دیکھتا تھا۔ اس پر اس کا عکس پڑتا اور اس کی مسکراہٹ اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ پروین قدم قدم پر ہر اس ردعمل سے دوچار تھی جو اس کا مان تھا۔

پروین کے دراز قد میں ایک دلکش اجنبیت تھی۔ رفتار میں لوچ لچک اور بھٹان تھی۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ کہ اس نے اپنا برقع محض جذباتی طور پر یا کسی خنداں آرزو کے تحت اتار کر بازو پہ ڈال لیا ہے۔ اس کے الفاظ میں فطری طور پر اس کے لئے جذباتی ہونا مشکل ترین کام تھا۔ خلافِ معمول اس نے آج ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ برقع سے ملتا جلتا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ فٹ پاتھ پر وہ اکیلی نہیں۔ اس کے ہمراہ اس کا ساتھی بھی ہے اس نے اسے چنا ہے جو اس کی ہر آرزو پہ چھا گیا ہے۔ چالیس کے

لگ بھگ، ایک بڑی شخصیت کا مالک۔ اس کے سلجھاؤ میں پروین، تازہ دم اور نوخیز، پروین ایک نیا آہنگ محسوس کر رہی تھی۔

اس کی رفتار میں عزم تھا۔ جوں جوں وہ بڑھتے گئے خوشیوں کے نشان اور زیادہ ابھرتے گئے۔ جھکی ہوئی آرزوئیں۔ دوش بدوش اس سمت چلتی رہیں۔ جس منزل کی طرف ان کا رُخ تھا۔ قدم قدم پر بھکاری اور بھکارنیں ہاتھ پھیلاتیں۔ دعاؤں پر دعائیں دیتیں "بی بی کی گود ہری ہو سہاگ دونے ہوں" "جوڑی بنی رہے" کی صدائیں دیر تک ان کا پیچھا کرتی رہیں ہر کوئی اس کے گورے گورے ہاتھوں سے خیرات لینے کو ترس رہا تھا۔ ہر کوئی بی بی کو سراہ رہا تھا۔

وہ فٹ پاتھ پر رُکے۔ کولتار کی سڑک ان کی رفتار میں مخل ہوئی تو انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور تانگے والوں نے بڑھ کر ان کی منزل کا اندازہ لگانا چاہا۔ سنتری نے بھی ممنون کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سڑک کو چیرتے ہوئے پار اتر گئے۔ سامنے والے فٹ پاتھ پر پہنچ کر انہوں نے ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھا۔ پھر آگے کو بڑھے۔ کس منزل کی طرف؟ یہ پروین کو معلوم نہ تھا۔

قطب مینار سے نیچے اترے تو پروین نے اپنے حسین بالوں کو ہلارا دیتے ہوئے ایک معصومانہ انداز سے گردن کو بلند کیا اور اپنے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی۔ ان گنت سیڑھیوں سے اتر آنے کے بعد اسے کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ کتنی بلندی اور کتنی پستی یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا ہمیں اتنی بلندی پر اس پستی کا احساس بھی نہ ہوتا تھا جہاں وہ کھڑی تھی اس کا ساتھی ایک بھکارن سے پروین کا پیچھا چھڑانے کی کوشش میں تھا۔ پروین نے دیکھ کر ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ تو وہ اسے دیکھنے لگا۔ قہقہے کا موقع تھا یا نہیں

وہ بہر حال چاہتی تھی اس خوشی کو آگے دے جس سے وہ مچل رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کیساتھ لگ گئی۔ اُن کی آن میں اس کے پریشان اور بکھرے ہوئے بال صاف اور درست ہو رہے تھے۔ سر سے ساڑھی کا پلو سرک گیا تھا۔ لیکن وہ قطب مینار کی بلندی کو شرمائی اور للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

یہ جگہ "قوتِ اسلام" کہلاتی ہے۔ تاریخ نے ہمیشہ ایسی یادگاروں کو بار بار اُبھارا اور تازگی بخشی ہے۔ یہ ناقابلِ فراموش یادگار ہے اور تاریخ گواہ ہے۔ وہ بولی میں نے اس سے پہلے کبھی زندگی کو ان زاویوں سے نہیں دیکھا نہ اتنی لطف اندوز ہوئی ہوں۔ ایسا نظر آتا ہے۔ یہ مسجد قوتِ اسلام ہمارے اس تاریخی واقعہ کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ وہ مسکرائی اور پھر اس بلندی کو چھونے لگی۔ جہاں کھڑے ہوئے اس نے انسانی عظمت اور صلاحیتوں کی نشو و نما پر غور کیا تھا۔

سائے ڈھلنے شروع ہو چکے تھے اور وہ قطب مینار کے سائے میں کھڑے ان وقتوں کا تصور کر رہے تھے۔ جب اس یادگار کی بنیاد رکھی گئی تھی اور بنیاد رکھتے وقت یہ نہیں سوچا گیا تھا کہ محبت اس کے سایہ میں لطف اندوز ہونے کے لئے مضطرب رہے گی۔ لیکن کبھی سرگرداں نظر نہ آئے گی۔ اور ہم کبھی اس تخلیق پر قیاس آرائیاں کرنے کی جرأت نہ کر پائیں گے ان کے پاس اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ قطب مینار اور اس کے تاریخی پس منظر پر تبصرہ کر پاتے۔

قطب مینار کے سامنے کھلے میدان میں وہ ان کے ساتھ لگی۔ بالکل لیٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور اس کے تراشے ہوئے بال پیار کے انداز میں ان کے سینے سے لگے ہلکے ہلکے سانس لے رہے تھے۔ اب ہمیں کہاں جانا ہوگا وہ اور زیادہ ان پر دباؤ ڈالتی ہوئی بولی اور کھل کھلا اٹھی جیسے قطب مینار نے جھک کر اس کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ دی ہے اور اسے اس سے اتفاق ہے۔

یاد نہیں آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ آج شام مقبرہ ہمایوں پر گزرے گی یہ خیال آتے ہی اسے اس نے اس قدر بشاش بنا دیا تھا کہ وہ اُٹھ کر رقص کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی اس کے بازو ہمایوں کی مانند پھیلتے چلے جائیں یہاں تک کہ وہ قطب مینار کو بازوؤں میں لیکر بھینچ لے اور پتھروں کو اس قدر بوسے دے کہ اس کی اپنی جبین بشارتوں اور خوشبوؤں سے چمک اٹھے۔

پروین نے نہایت بے تکلفی سے اپنے خوش رنگ برقع کو سبزہ پر بچھا دیا۔ وہ دونوں بیٹھنے ہی کو تھے کہ ان کی نگاہیں جمنا کے اس پار درختوں کے جھنڈ پر سے بہت دور حد نگاہ سے بھی آگے نکل گئیں اور اس منظر کو بھول گئیں جو مقبرہ ہمایوں کو اپنے دامن میں لئے تھا۔ آگے پیچھے مقبرے ہی مقبرے اور سامنے جمنا کا کنارہ، جس کا سراغ لگانا مشکل تھا۔ اپنے آپ کو ماحول سے متاثر پاتے ہوئے وہ برقع پر بیٹھ گئے۔ ایک ساتھ ایک دوسرے کو مس کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ یہ منظر یہ ماحول یہ تاثر کسی وقت بھی تو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور پھر یہ کہ ان سے طبیعت سیر بھی تو نہیں ہوتی، برقع کی سلوٹ نکالتے ہوئے مندھی مندھی آنکھوں سے پروین نے کہا۔ اب اس کا یہی حشر ہوتا رہے گا جب ہم بمبئی پہنچیں گے تو میں اسے سمندر کی لہروں پر بچھا دوں گی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اسے کسی فوری جذبے نے روک دیا ورنہ اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے ان کے اور نزدیک ہو گئی اس نے آنکھوں کو جھکا لیا اور چہرے پر اپنے خیالوں کے زیر اثر کوئی تبدیلی نہ ہونے دی جب انہوں نے اس کے تراشے ہوئے بالوں کو چھوا تو اس کی آنکھوں کے سامنے ان کے ہاتھ اس طرح آن رکے جیسے کالج کی اونچی اونچی دیواریں جنہیں بنے ہوئے برسوں گذر گئے تھے اور وقت کے ہاتھوں نے ان میں جگہ جگہ بڑے بڑے جھرنے اور دراڑیں ڈال دی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گرمائی ہوئی نظروں سے بڑے اجنبی انداز سے دیکھا۔ پروین چاہتی تھی۔ اپنی جوانی،

زندگی، اپنا مستقبل اور پیار سبھی کچھ ان کے قدموں پر ڈال دے جنہیں اس نے بڑی زندہ صلاحیتوں کے مدِ نظر انتخاب کیا تھا۔ اور وہ ذرّے آفتاب بن گئی ہے۔ اس کی تعلیم، اس کی سوجھ بچار، ان سب حقیقتوں کا حاصل! آج وہ اپنے عروج پر تھی۔

تعلیم حاصل کرنے میں ذہانت اور اعتماد تو تھا لیکن دوسروں کی باتیں سننی پڑتی تھیں اور باوجود ہزار باتوں کے اس نے تعلیم سے منہ نہ موڑا۔ اور اپنی انتھک کوششوں سے وہ جگہ حاصل کر لی تھی جس کی خاطر وہ تعلیم حاصل کر رہی تھی، وہ مطمئن تھی۔ ایک کالج کی تمام ذمہ داریوں کو سر لیتے ہوئے جن ذمہ داریوں کا حلف اٹھایا تھا وہ ان فیشن ایبل لڑکیوں کی طرح تھوڑی سی تھی جنہوں نے تعلیم کو فیشن کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ اور محض تعریف اور ظاہری سج دھج پر اپنا مستقبل بھینٹ چڑھا دیا تھا اور نہیں سمجھتی تھیں کہ ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ پروین کو یاد تھا کہ اس نے اپنی تعلیم کا آغاز کرتے وقت صرف ایک ہی بات سوچی تھی اور وہ یہ کہ اپنی کوششوں سے اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گی۔ اور یہ اس کی کامیابی تھی کہ وہ آج اپنی زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنے کا حق لئے اپنے ایک ایسے ساتھی کے ساتھ تھی جو پروین کی کامیابیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی اس کی شخصیت کا اقرار کرتا تھا وہ اس کی سوجھ بچار کا نتیجہ تھا۔ وہ دنیا کی تمام نعمتوں سے اسے افضل سمجھنے پر مجبور تھی۔ اور عورت کی ہر فطرت سے بالا وہ اس بات پر نازاں تھی کہ کن بلند آہنگ اعلیٰ و ارفع جذبات کے تحت وہ اپنا انتخاب کرنے پر مجبور تھی۔ ہلکی ہلکی دھند فضا میں پھیلتی چلی گئی اور دور کی چیزیں دھندلی دھندلی نظر آنے لگی تھیں۔ اس نے محسوس کیا وہ اور اس کا محبوب ایک دوسرے کے قریب، دل سے بھی قریب تھے۔ اس نے خود کو ان کے بازوؤں میں پڑا پایا۔

ہر معاملے کو اپنے منہ پر ڈال دینا پروین کی عادت میں شامل تھا لیکن آج اس کا فیصلہ تھا کہ

وہ اپنی خوشیوں اور آرزوؤں میں خود کو موقع دے گی کہ وہ جی بھر کر سیر ہو اور اپنی چھٹیوں کو اپنے محبوب کی صحبت میں گزارے اور کسی دوسرے وقت کا انتظار نہ کرے اور اپنی عادات کے مطابق کسی بھی مسرت کو آئندہ پر نہ ڈال دے۔ قطب مینار سے چلتے وقت اس نے اپنی وارفتگی کا ثبوت انہیں جذبات سے دیا تھا اور کہا تھا۔ قطب مینار اونچا اور بھی اونچا ہوتا ہ آپ اس کی بلندی پر چڑھتے چلے جاتے۔ آپ آگے اور میں پیچھے۔ یاد ہوگا میں آپ کا پیچھا کرتی چلی جارہی تھی اور کبھی ہم ایک ہی سیڑھی پر نظر آتے تھے کتنا سرور تھا اور کتنی ترنگ تھی جب ہم قطب مینار کی سیڑھیوں پر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش میں غلطاں تھے۔ قطب مینار اب تو آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا جارہا ہے پھر موقع آیا تو اس مینار کی سیڑھیاں نہ ہوں گی فضا ہوگی، کہکشاں ہوگی اور ہم اس میں کمندیں ڈالے ہلاتے رہے ہوں گے اور دیکھتے دیکھتے اس افق کے قریب ہوں گے جہاں سے قطب مینار بھی ہمیں دیکھ نہ سکے گا۔ بالوں کو پیچھے کی طرف گراتے ہوئے وہ ان سے لپٹ گئی۔ اس نے شانوں کو بے نیازی سے جھٹکا۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر سکوت طاری تھا اور وہ ان کی گود میں پُر امید ان کی بے نیازیوں سے ہم کنار تھی۔

وہ خوشی سے بے قابو ہوتی جارہی تھی۔ لبوں کو دباتے ہوئے مسکراہٹوں کو جھٹکتے ہوئے ان کو دیکھتی رہی۔ ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہے۔ اس زندہ انسان کے حضور میں ہمیں جھکنا چاہیئے مجرا بجالانا چاہیئے۔ یہ درگاہ یہ یادگار ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی آرزوؤں کا مرکز ہے ہم بھی تو زندگی کے معاہدہ کی تکمیل کے لیئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یہ شام برسوں کی سنج بچار کا نتیجہ تھی۔ مرد اور عورت دونوں کمزور ہیں۔ اس نے ان کے مخلص اور متعز چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ آپ کو بیگم صاحبہ یاد آرہی ہوں گی۔ اس کے اندر گدگدی سی

نے کروٹ لی۔ ہنستے ہنستے آنسو نکل آئے۔ کتنی اچھی تھیں وہ۔ انہوں نے آپ کی زندگی میں بڑا ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی گزشتہ زندگی ان سے مدتوں وابستہ رہی مجھے بھی ان کی سیرت وصورت نے متاثر کیا اور ان کی شخصیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کالج کی الجھنوں اور ذمہ داریوں میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں نے پروین بھی بیگم بن سکتی تھی۔ پروین کو بھی دل ملا ہے۔ اس کو بھی اپنی زندگی کا حق حاصل ہے۔ اس نے گردن بلند کرتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔ پروین میں جرأت ہے۔ وہ اثر انداز ہو سکتی ہے۔ وہ جس آزمائش میں چاہے اپنے آپ کو ڈال سکتی ہے۔ وہ اس لئے کھو نہیں گئی کہ وہ محض ایک کمزور عورت ہے وہ اپنے الفاظ اور کئے پر مطمئن ہے۔ وہ ایک بڑی شخصیت کی ملکیت ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ کسی معاملے کو آئندہ پر نہیں ڈال سکتی۔

فخر اور خوشی سے بھرپور امنگوں میں اس کی آنکھیں جگنو کی طرح جگمگا اٹھیں جو کچھ جھکی تھی دہراتی رہی اور ذرا نہ ڈگمگائی آنسو پلکوں میں آکر رک گئے جو اس کی اندرونی کیفیات کا اظہار تھے۔ جن سے وہ ہمکنار ہو رہی تھی۔

وہ فرط انبساط میں ایک دوسرے سے لگے جھومتے رہے۔ ان کی روحیں ایک دوسرے سے اپنی شناسائی کا اظہار کرنے میں پیش پیش تھیں۔ ہر آزمائش میں پوری اتری ہوئی اس کی انفرادیت تابندہ ہے۔ اس کے اپنے اعتماد کی سیلاب اس کے روئیں روئیں سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں کا احساس بلند سے بلند تر اڑائے لئے جا رہا تھا تھا۔ یہ دیوان خاص ہے۔ یہ تہذیب کا مسکن ہے۔ آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ دیکھئے جمنا کا پانی تاریکی میں تھرتھرا رہا ہے۔ رات پھیلتی چلی جائے۔ وقت تھم جائے اور ہم جنوں کے نقوش اپنی آج کی نشست کو لازوال بنا دیں۔ ایسی خوشگوار تاریکی جس میں

اچھکیں سی امنگیں ہوں، ان نظروں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ زندگی کی امنگوں اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں سے تھکن کا خیال بھی نہ گزرتا تھا۔

ہم زندگی کی ہلکی سی جنبش سے کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں، ہم ایک خوشگوار طوفان سے دوچار ہیں۔ پروین انگڑائی کے انداز میں ذرا تن کر سکڑ گئی۔

آٹھ دس دن کے اندر جو انہوں نے دہلی میں گزارے تھے، پروین نے اپنے آپ کو ایک دوسری پروین پایا۔ ہر نیا دن اس کے لئے ایک نیا پیغام لاتا۔ کچھ سیکھنے کے لئے کچھ کہنے اور سننے کے لئے پروین چاہتی تھی، اپنی دوسری کامیابیوں کے پہلو بہ پہلو وہ اپنے آپ کو گرہستن اور ایک اچھی ساتھی ثابت کرنے میں کسی قیمت پر پیچھے نظر نہ آئے، بلکہ اس کا انتخاب ایک فخریہ انتخاب کا پیش خیمہ ہو۔

انہیں آگرہ کے بعد پھر دہلی پہنچنا تھا۔ دہلی سے بمبئی جانے کے لئے سبھی سامان مکمل کرکے وہ تاج محل آگرہ دیکھنے گئے تھے۔ جب وہ آگرہ کے اسٹیشن پر اترے تو ایسا نظر آتا تھا جیسے ان میں فطری اختلافات نے ابھرنے کی راہیں پیدا کرلی تھیں۔ ان کی افراتفری میں دیکھ بھال کے خد و خال گہرے اور واضح تھے۔ جب وہ اپنے نظریوں کی رو میں داد طلب کرتی بھی تو اس میں اس کے اپنے جذبات کا کوئی گہرا تعلق نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے محسن اپنے آقا کو خوش کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھی۔ اسے یاد تھا وہ کالج کی لڑکیوں کے جذبات کچلنے میں پیش پیش تھی اور ہمیشہ اپنی ذہانت کو ترجیح دیتی تھی اور خصوصیت سے وہ لڑکیاں جو اس کے جذبات سے کھیلنا چاہتی تھیں انہیں وہ کبھی موقع نہ دیتی تھیں کہ ایسا کرنے سے کالج کے وقار میں کمی واقع ہو سکتی تھی اور اب بھی ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ وہ مٹی کی مورت تھی آج بھی اس پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں جن سے وہ گزرتی چلی آئی تھی۔ اس کے

باوجود وہ اس قدر و منزلت کو ان جذبات سے گڈمڈ نہ ہونے دیتی تھی جن میں اس نے ان کا انتخاب کیا تھا۔ پروین اپنی اداکاری میں اپنے اطمینان اور سکون کا سامان تلاش کرنے میں کچھ زیادہ محتاط اور ترجمانی کا دعویٰ رکھتی تھی۔ انداز گفتگو سے، پُرترنم اور حسین آہنگ سے وہ آپ اپنی تعمیر کر رہی تھی۔ اس کی انفرادیت راہ گزاروں کو بھی متاثر کرنے میں کبھی پیچھے نہ رہی تھی۔ اس نے جذبات کی رعنائی سے کبھی چشم پوشی سے کام نہ لیا تھا، وہ چاہتی تھی ہمارا یہ سفر کسی قیمت پر اکتاہٹ کا شکار ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ ہر قربانی کے لئے مستعد اور چشم براہ تھی سوٹ کیس سے ان کا پاؤں ٹکرایا تو اس طرح لپکی جیسے انہیں گرتے ہوئے دبوچ لے گی۔ انہوں نے اسے ظریفانہ انداز میں ایک متحرک کھلونے کی مانند پاؤں کی لپیٹ میں لے لیا دونوں پلیٹ فارم پر اس بے تکلفی سے ملے اور انہوں نے یوں قہقہوں پر قہقہے لگائے کہ سارے کا سارا اسٹیشن متوجہ تھا۔

تاج محل کو دیکھتے ہی دونوں کی آنکھوں میں روشنی کے آثار ابھرے اور یہ روشنی ان روشنیوں سے قطعی مختلف تھی جو وہ ایک دوسرے کو چھو کر متاثر ہو کر پیدا کر لیتے تھے۔ اس نے اس کا اندازہ کرتے ہوئے مطمئن نگاہوں سے اپنے مقابل کو دیکھا یہ تخلیق ہے۔ تفریح نہیں۔ جب وہ تاج کی روشوں پر چل رہے تھے تو ان میں وہ تازگی اور بے نیازی تھی، جب وہ دہلی کے اسٹیشن سے باہر نکلے تو سڑک پر اس بے تکلفی سے چلنے لگے۔ جیسے دہلی میں آج سوائے ان دونوں کے دوسرا نہیں۔ وہ رک گئے۔ اس وقت ان کے انداز میں کوئی حارج نہ تھا۔ سوائے ان گہرے تاثرات کے جو تاج محل دیکھتے ہوئے انہوں نے قبول کئے تھے۔ اسے یاد تھا اس نے کہا تھا۔ یہ سچ ہے۔ تاج محل آگرہ آپ نے آج پہلی دفعہ تھوڑا دیکھا ہے۔ وہ ان کے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس کے بال اس کے رخسار دل پسے

بوسوں کی مانند کھیل رہے تھے۔ ان جذبات سے اس انداز سے جیسے ان کا واسطہ انہیں سے رہا ہے۔ وہ خود بخود یوں چلنے لگی جیسے اسے اپنے ساتھی کے ساتھ کا احساس جاتا رہا ہے یا کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ جمنا ہے، گنگا ہے۔ وہ اپنی موج میں بہے جا رہی ہے۔ اس نے اپنے محبوب سے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ مرمری سلیں گھورتی نہیں۔ آنکھیں جھپکتی ہیں۔ کامل سکوت سے آنے جانے والوں کو تک رہی ہیں ہم ان کے لئے اجنبی نہیں۔ خدا جانے کتنے مجبور لوگ، کتنے بلند آہنگ پُر وقار لوگ محبت میں رچے ہوئے لوگ یہاں آئے ہوں گے۔ اور حسرت بھری نگاہوں سے اس مقدس یادگار کو دیکھتے ہوئے یونہی چلے گئے ہوں گے۔

مسافروں میں بے کلی بڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن اسے تاج محل کی یاد یاد بن کر آ رہی تھی۔ وہ نمایاں طور پر صحیح جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے چل پہل سے بالوں کی لٹوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اسی روشنی سے وہ چار تھی جس روشنی کو اس نے تاج محل کو پہلی نگاہ سے دیکھتے ہوئے دہرایا تھا۔ کون تھا جس نے کہا تھا اگر میرا ایسا مقبرہ بنا دیا جائے تو میں ابھی مرنے کو تیار رہوں۔ کون تھا وہ جس نے کہا تھا شاہجہاں نے اپنی آرام گاہ کا تصور پیش کیا ہے پھر مجمع میں کون بول اٹھا تھا۔ شاہجہاں نے ممتاز محل کی یاد میں جس قدر آنسو بہائے تھے، یہ تاج محل ان میں سے ایک آنسو ہے جو منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ دیکھو دیکھو عورتوں کے حقوق نے کیا مقام پایا ہے؟

اس نے گردن اٹھائی۔ وہ ہنگامہ خیزی میں کھو گئی۔ اس نے دیکھا دہلی کا ریلوے اسٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر لوگ اس طرح جمع تھے جیسے کسی سیاسی لیڈر کی آمد آمد ہو۔ ہر کوئی فرنٹیئر میل کے انتظار میں تھا۔

ایک بوڑھا نیم اندھا تاج محل کا ماڈل لئے ان کے عین سامنے آکھڑا ہوا وہ بہتر سے بہتر ماڈل خرید کر کے پیک کر چکی تھی۔ بوڑھا نیم اندھا ماڈل فروخت کر کے بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ غالباً اسے پہلی بار منہ مانگی قیمت مل گئی تھی۔ وہ آناً فاناً ماڈل کو لئے ہجوم کو چیرتے ہوئے بڑھتی گئی۔ جیسے اسے بوڑھے کی تلاش ہو وہ تیز چلتی گئی۔ اس کی انفرادیت نے اس کی اجنبیت نے بہتوں کو متوجہ کیا۔ ہر دیکھنے والا دیکھتا رہا۔ وہ دور نکل گئی۔ اس کا مطلب اس بوڑھے کو ڈھونڈ نکالنا تھا۔ جس سے اس نے ماڈل حاصل کیا تھا تاج محل کا ماڈل واپس دیتے ہوئے اس نے بڑے پُر ترنم الفاظ میں کہا تم اسے امانت رکھو یہ ہماری امانت ہے۔ اور ہم بمبئی سے واپسی پر اسے لے لیں گے۔ بوڑھے کی جھریاں نمایاں ہو گئیں۔ اس کا انگ انگ کانپ رہا تھا۔ وہ لوٹ گئی اور اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوتے ان کو دیکھا تو سنبھل نہ سکی۔

گاڑی آنے کا سگنل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کتنے محبوب اور کتنی محبوبائیں آ رہی تھیں۔ اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک مشہور ایکٹرس بھی بمبئی جا رہی تھی۔ یہ آوازیں ہر گھڑی پر دیپ کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ ہجوم کا ذہن انتظار سے اکتا کر ایکٹرس کے متعلق نئے نئے زاویے اختراع کرنے میں معروف ہو جاتا۔ اس کے مداح آرٹ اور فلم کے آرٹ پر تبصرے کرتے اور اسے موجودہ تہذیب کا ایک درخشاں ستارہ کہہ کر اچھالتے اور کہتے اس کے کردار نے سوسائٹی کی ذہنیت بدل ڈالی ہے۔ آج گھر گھر اس کے چرچے ہیں۔ اس کی وضع قطع چال ڈھال گفتار خدوخال سے محفلیں روشن ہیں۔ یہی نظر آتا تھا جیسے پلیٹ فارم جس پر فرنٹیر میل آنے والی تھی۔ اس کو رخصت کرنے اور اس کا اعتماد بڑھانے کو دنیا حاضر ہے۔ ہر للچائی ہوئی نگاہ اسے یقین دلانے کی انتہائی کوشش میں تھی کہ بھی کچھ

اس کے دم سے ہے۔ شائد وقت کچھ کم تھا کہ ایک وینا نے اسے اپنے جمگھٹ میں لیا تھا اس پر ایسے تاثرات موجود تھے کہ وہ فخر سے گردن اٹھائے اپنے مداحوں کو دیکھتی اور اس طرح گھومتی کہ ہجوم میں ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ کچھ عیسائی لڑکیاں دور کھڑی اس پر نکتہ چینی کر رہی تھیں۔ ویسے تو عیسائی لڑکیوں کو تنقید کی عادت ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔ مگر وہ سنگار اور فیشن کو اپنانے میں بڑا کمال رکھتی ہیں۔ وہ بلند قد بالوں والی سرمئی سی لڑکی نے دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ تو کر لیا تھا مگر ایکٹریس کو وہ بھی برابر گھور رہی تھی۔ اس کے لبوں پر کچھ سوال کچھ خیال ناچ رہے تھے۔ مگر وہ ایکٹریس سے بڑھ کر اپنا تعارف کیسے نہ کراتی اسے اپنی انا کا بہت پاس تھا۔ پھر اس کی سج دھج نے دیکھنے والوں کو مسحور بھی کر رکھا تھا۔ اس کے بالوں کی بندش جس سے اس کی پیشانی کا حسن نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھیں ناچتی، رقص کرتی اپنی شوخی میں آپ کھو جاتی تھیں۔ دیکھنے والے کہتے تھے عیسائی لڑکی کا میک اپ ایکٹریس سے کہیں اچھا ہوا ہے اور وہ اس کی سنجیدگی کا شکار ہو گئے۔

پروین کو یہ منظر گھما گھمی اور پھر الٹی سیدھی باتیں کچھ ایسی پسند نہ آئیں۔ وہ اصل موضوع اور اپنے خیالوں میں بھٹک سی گئی تھی۔ اور اس کشمکش میں یوں نظر آتی تھی جیسے اس کے کان بج رہے ہیں۔ وہ سوچتی تھی۔ آخر آگرہ سے واپس دہلی آنا کیا ضروری تھا؛ اسے ہزاروں انسانوں کی ذہنیت کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ مگر وہ اس مطالعہ سے کچھ ایسی اکتائی اور گھبرائی کہ اس کا جی چاہا اسٹیشن سے باہر نکل جائے۔ اور دور کسی دوسری فضا میں جا دم لے۔ کوئی بھی تو اس موڈ میں نظر نہیں آ رہا کہ اسے گاڑی کا انتظار ہے یہ تو ایک تہوار ہے اور لوگ دور دور سے اس تہوار کو منانے آئے ہوئے ہیں اور پھر اسے ایسے بے ہنگم تہواروں کو دیکھنے کا موقع بھی کم ملا تھا، جب وہ چھوٹی سی تھی

تو اس کے والدین اس کی تعلیم پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ لہٰذا جب وہ بڑی ہوئی تو وہی اس کی اعلیٰ تعلیم کے مخالف رہے۔ باوجود ہزار مخالفتوں کے وہ کالج کی چار دیواری میں پہنچ گئی۔ ان دنوں کالج میں ایک لڑکی کا تعلیم کی غرض سے جانا ہزاروں کٹھن سے مقابلہ کرنا تھا۔ وہ حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ خود ایک کالج کی پرنسپل بن گئی۔ اسے تقریباً ہم عمر لڑکیوں سے، وقت کے تقاضوں سے نپٹنا پڑتا تھا، وہ اقتصادی اور سماجی زندگی سے گزرتی ہوئی اپنی عادت کے مطابق ہر اس تقاضے کو آئندہ پر ڈالتی رہی۔ تاکہ اصلاح کا نظام درہم برہم نہ ہو۔ اگر تعصبات پر ہی مستقبل ہوتا اور جذبات سے لبریز زندگی رواں دواں نظر آتی تو وہ ایسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی۔

اب مس سی کریچن لڑکی پورے جاہ و جلال سے ایکٹریس سے آٹوگراف حاصل کر رہی تھی۔ وہ اس کے بناؤ سنگار اور اٹھان سے خود بھی دبی جا رہی تھی۔ اس منظر نے خود پروین کو بھی متاثر ہونے کا موقع دیا تھا۔ جب وہ ضرورت سے کچھ زیادہ محسوس کرتی تو اپنے ساتھی کے اور قریب ہو جاتی۔ اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے چہرے کے خدوخال دھات اور پتھر سے تراش کر نکالے گئے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے گوشت پوست کی مورتی کسی بڑے دیوتا کے سامنے کھڑی جذبات میں پیچ و تاب کھا رہی ہے۔

پروین ایکٹریس کے سرخ پوڈر آلود چہرے کے اندر جھانک کر اس کی اندرونی کیفیات کا جائزہ لینے کی کوشش میں بار بار لپ اسٹک کی تہوں میں کھو جاتی رہی اور کہتی رہی کہ اس کے چہرے پر احساسِ کمتری کی تہیں زیادہ دکھائی دے رہی

ہیں۔ وہ اس قدر شناسی اور مداحوں کے باوجود ان کو چھپا نہیں سکی۔ وہ چاہتی تھی، تبادلۂ خیالات میں نہ اُلجھے۔ مگر وہ خود بھی تو ان کی شخصیت کی معترف تھی۔

پروین پر اپنے ساتھی کی سنجیدگی کا گہرا اثر تھا۔ وہ ایسے بے ہودہ سوالات سے خود کو گرد آلود کرنا بھی پسند نہ کرتی۔ اور اگر مصر ہوتی بھی تو اپنی عادت کے مطابق معاملے کو آئندہ پر ڈال دیتی اور ایسے واقعات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی، جو اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اس عادت اسے اکثر ایسی الجھنوں سے دور رکھا یہ عادت ہوتے ہوتے پختہ تر ہو گئی تھی۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتی جیسا کہ اس کی ساتھ والیاں کرنے کی عادی تھیں، تو اسے آج وہ سکون وہ مسرت حاصل نہ ہوتی، جس نے اس کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو سمجھ رہی تھی، بجز اس ایکٹرس کے جو اسے سرمئی کرسچن لڑکی سے بھی گئی گزری نظر آ رہی تھی۔

ایکا ایکی ایک نئی نویلی دلہن بھی اسے نظر آئی جسے اس کی ہمجولیاں پیچھے کی ساتھی رخصت کرنے اس کے گرد جمع تھیں۔ اس کی اجنبیت اور سنجیدگی نے پانسہ بھی بدل ڈالا تھا۔ کھسر پھسر - جدھر دیکھو پلیٹ فارم پر اب ایکٹریس کی ظاہر داری سے ہٹ کر اس راز کو جاننا ضروری ہو رہا تھا۔ جو دلہن کے چہرے پر اور اس کے ارد گرد کھسر پھسر نے پیدا کر دیا تھا۔ دلہن کی چپ میں ہزاروں جواب مضمر تھے۔ ہمجولیاں اس انداز سے اس پر جھک جاتی تھیں۔ جیسے پہلے سوال کے بعد دوسرے سوال کا جواب چاہتی ہیں جس کو چپ میں راز داری تھی۔ ایک نے اس کے گلوبند کو سیدھا کیا۔ دوسری نے کان پھول کو الٹا پلٹا کیا تیسری اس سے کھل کھیلنے لگی، ماتھے پر جھومر اسے کیسا بھلا

معلوم ہو رہا تھا ایک اُس نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔ پروین یہ سب کچھ دیکھ
رہی تھی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ دلہن ہی تو ہے۔ کیوں کچھ کہے۔ یہ آخر دلہن ہی تو
ہے۔ اور دلہن کو سمجھنے کے لئے دلہن بننا ضروری ہے۔ مڑ کر دیکھا تو وہ بچے
جن کے مان پر اس قدر قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔
ایکٹرس دلہن اور کرسچن لڑکی کو وہ کیا سمجھتی، ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ گویا زندگی کا
سرمایہ ڈھونڈ رہی ہے۔

جب انہیں دور سے اپنی طرف آتے دیکھا تو کھل کھلا اٹھی۔ چہرے پر
رونق آ گئی۔ وہ بشارت جو اس کے کردار کا حسن تھی۔ دوسروں نے بھی دیکھی
محسوس کی، مگر وہ بے قابو ہو کر ان کی طرف بڑھی۔ ان کے ہاتھ میں تاج محل
کا ماڈل تھا۔ اسے اپنے ساتھی کی تلاش تھی۔ مگر تاج محل کا ماڈل دیکھ کر اس کی
تمام کیفیات پر پانی پھر گیا۔ بوڑھے نیم اندھے کو وہ ماڈل بطور امانت کے دے
آئی تھی۔ بوکھلائی بھی مگر سنجیدہ بن گئی۔ اور ان کے اس فعل پر اتنی لطف اندوز
ہوئی۔ جواب نہ بن پڑا کہ کیا ہے۔ اپنے دماغی توازن کا جائزہ لینے اور موڈ کو بہتر
بنانے کے لئے وہ پھولے نہ سماتی۔ آخر اس نے یہ سفر اسی خیال کے زیرِ اثر اختیار
کیا تھا۔ بچوں کی مانند نادان سی نظر آ رہی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ بغیر پوچھ گچھ کے
ان کے مطلب کو پا جائے۔ اس نے کہا یہ وہ ماڈل تو نہیں جو فروخت کرنے کے لئے
بوڑھا مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ برہم سی ہو گئی۔ کتنے ماڈل پیاس بجھائیں گے ہماری
اس سے بہتر تاج محل کا ماڈل بنانا تو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ آخر یہ تخلیق
تھوڑی ہے۔ موجودہ پس منظر میں کیا عجیب معلوم ہو رہا ہے، یہ ماڈل تاج محل کا۔

حصے میں امانت کہہ کر سونپ آئی تھی۔ اس بوڑھے کو جیسے مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ نیم اندھا ہے۔ بنانے والے یہ ماڈل ممتاز محل کو سامنے رکھ کر تو نہیں بناتے۔ انہیں خریداروں کی تعداد کو بڑھانا ہے۔ تاکہ ماڈل اور اصل میں امتیاز چلتا رہے۔

وہ قدم قدم چلنے لگے۔ لازمی تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگ جاتے۔ ایک ہو جاتے۔ انہیں اپنے پیچھے بڑی لمبڈی سی توند والا ایک لالہ آتا دکھائی دیا عجب قسم کا شور تھا۔ اس کے دفتر میں آگے پیچھے خدمت گار ہی خدمت گار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ رکتا تو سبھی رک جاتے وہ ادھر دیکھتا تو خدمت گاروں پر نزع کا عالم چھا جاتا تھا۔ وہ چلتا تھا تو ایسا نظر آتا جیسے پلیٹ فارم سارے کا سارا ہل رہا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی دیو داسی کی صورت جیسے اس کے ساتھ پروئی ہوئی ہو، سہارا دیتی قدم قدم اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کچھ اس صورت سے کہ قدم اٹھتے۔ اور نہ دھرتی چلتی تھی۔ وہ بھی اس قافلے کے قریب سے گزر گئے۔

پروین کو ان ان گنت یادوں کا بڑا مان تھا۔ جن میں کوئی تاریک دیوار حائل نہ تھی وہ دن جو اس نے ان کے ہمراہ دلی میں ادھر ادھر کی مصروفیتوں میں گزارے تھے ان کے خواب ابھی کے لیے بڑے سہانے تھے۔ وہ قدم اٹھاتے اس رُخ چلتے رہے جہاں سے انہیں سوار ہونا تھا۔

آپ نے دیکھا بدرین کتنی خوش، کتنی مسرور اور کتنی متکبر ہے۔ جس کا قدم پُر تبسم آپ کے سایہ میں اپنے ارتقا کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پروین کا دل و دماغ پروین کا تھا۔ وہ بڑی نکتہ رس اور دُور اندیش واقع ہوئی تھی۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے کو بھی بےکار سمجھ کر ٹال سکتی تھی۔ اور وہ

اپنی اس فطرت میں کامیاب بھی تھی۔ کہ ہر معاملے کو فیصلہ کرنے تک آئندہ پر ڈال دیتی اور کوئی اس کی اس مجبوری کو گرفت میں بھی نہ لا سکتا تھا۔

چالیس کے لگ بھگ ایک بڑی شخصیت کا مالک اس کا ساتھی، اس کا محبوب وہ اس کے ساتھ بہکی بہکی باتیں کرنے سے گریز کرتی تھی۔ ہر اس معاملے میں محتاط رہتی تھی جس سے کمتری کا کوئی احساس اسے جھنجھوڑے۔ وہ ہمیشہ ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔ کیوں کہ انہوں نے اسے بڑے پیار سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "پروین تم جس قدر مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گی، اسی قدر مجھے اپنے قریب پاؤ گی۔"

اس وقت پروین اپنی پوری اٹھان سے، اپنے حسن کی تازگی اور تمکنت سے دوبالا ہو رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ کھڑے ایک ایک کو پرکھنے کی کوشش میں ہیں، جو خود اپنی پروین کی رعنائی سے متاثر تھے۔

جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور ان کا سامان حسب دلخواہ ترتیب سے لگا دیا گیا تو قلی نے ادب کو ملحوظ رکھتے بڑے امیدوارانہ انداز سے کہا۔ "سرکار یہ ڈبے سیدھے بمبئی جائیں گے۔" پروین اپنی جگہ سے اٹھی تو قلی نے سر سے پاؤں تک اُسے دیکھا۔ خوبصورت گورے گورے ہاتھ جن سے وہ اپنا پرس کھول دیتی تھی۔ مزدور نے جھک کر شکریہ ادا کیا اور دعا دی یہ ہاتھ اسی طرح سخاوت اور برکتوں سے بھرپور رہیں۔

جب وہ کوپے میں اطمینان سے بیٹھ گئے تو انہوں نے جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے چھو رہے تھے جیسے برسوں کے بعد آج ان کا ملاپ ہوا اور آج وہ بغلگیر ہیں۔ پروین نے ذرا سی شوخی سے

ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا برقع ابرقع کہہ کر ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ چپ رہی ہے۔ لیکن وہ برابر ان کو دیکھتی رہی۔ تکتی رہی اور ذرا سنجیدہ صورت بنا کر پرس کے اندر جھانکی۔ مجھے برقع پیارا ہے۔ وہ میرا عمر ساتھی مجھ سے کبھی جدا نہ ہوگا آپ جانتے ہیں جب میں برقع اوڑھ لیتی ہوں تو کس قدر کھلی معلوم ہوتی ہوں۔ وہ جواب سنے بغیر برقعے کی تعریف، برقعے کے رنگ، برقعے کے ڈیزائن کے متعلق بیان کرنے لگی۔ اس کے ڈیزائن کرنے میں مری ذہانت اور ذوقِ حسن کا دخل ہے کوئی خوبصورت چیز اس وقت تک کیسے خوبصورت لگ سکتی ہے۔ جب تک اس میں جمالیاتی نظر سے کچھ سمو نہ دیا جائے۔ میرے سلیقے اور ذوق کی داد تو دیجئے۔ وہ کہتے کہتے لوٹ گئی۔ عورت ہی سے متمدن ملک متمدن ہیں۔

اسے یاد تھا جب پہلی بار اس نے انہیں خط لکھا تو خط کے تاثرات کا نچوڑ محض اپنے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے اس خط میں اپنے برقعے کا ذکر بھی فخریہ انداز میں کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ میرا یہ خط زندگی کی اکتاہٹ کا نچوڑ ہے جس کو سوز و ساز تپش اور خلش کی ضرورت ہے۔ میں جس کائنات میں رہتی ہوں اس کے افق پر کبھی کوئی ایسی روشنی نہیں ابھری کہ میں بے تاب ہو کر بازو پھیلائے اٹھ بھاگتی۔ وہ جھک گئی۔ سوٹ کیس کھولا۔ برقعے کو ساڑھیوں اور جمپروں کے نیچے بڑے سلیقے سے دبا دیا۔ اور اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ وہ چھوٹا سا جدید وضع کا آئینہ جو اٹیچی کیس کے پاس پڑا تھا بے معنی سمجھتے ہوئے اسے بھی چھپا لیا اور والہانہ انداز میں بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کو ہونٹوں میں دبا لیا۔ اور ان کی کیفیات کا مطالعہ کرنے لگی، جو اس کی مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے گاڑی سے باہر گاڑی کے گرد چکر

کھاتے ہوئے درخت دیکھنے میں محو تھے۔ آئینہ پھر نکالا اور اس کو سامنے رکھ لیا۔ زندگی یہی زندگی تو ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب، قریب اور قریب تر بیٹھے ہیں۔ اس نے اپنے ان الفاظ کو بڑے اعتماد سے پھر دہرایا اور جھک کر شرارت سے آئینہ ان کے ہاتھوں میں دے دیا اور مخروطی انگلیوں سے ان کے بگڑے ہوئے بال درست کرنے لگی۔ وہ اسے گدگدانے لگے۔ اور ان کے لبوں پر دیوتاؤں کا سا رس ابھر آیا۔

وہ چھیڑ چھاڑ سے گدگدا اٹھی تو انھوں نے چپ سادھ لی۔ چپ سادھ لینا اور کم بولنا بڑے لوگوں کا حصہ ہے۔ قہقہے کی آواز کسی دوسرے کان نے نہ سنی وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئے تو خود گم سم سی ہو گئی۔ اور بے تکلفی کے اظہار میں کالج کی ذمہ داریاں اور کالج کی سلیقہ شعار مقبول ترین لڑکیوں کا ذکر کرنے لگی۔ خصوصیت سے رابعہ کا جس کے پیچھے بھتے خاوند تھا۔ بڑی سخت جان تعلیم کو جاری رکھنے کے جتن۔ خیالات کا تسلسل اور ذرا آگے بڑھا تو پیچھا چھڑانے کی غرض سے پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو کچھ وہ کہتے رہے بڑے دھیان سے سنتی رہی۔ اسے سننا ہی تھا۔ معصوم نگاہیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ ٹریں لویں چلتی نظر آ رہی تھی جیسے حسین خوابوں سے اسے کوئی لگاؤ نہیں۔

اچھا تو آپ ترقی پسند لڑکیوں کے حق میں ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ اصل میں آپ کو مقبولیت کا جنون ہے۔ آرٹ ہو، موسیقی ہو، یہ تو آپ کی من بھاتی غذا ہے۔ اس کے بغیر آپ کا دل بھی تو نہیں بہلتا۔ انھوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر ایک بار پھر اپنے پہلو کے قریب سرکا لیا۔ ایسی کتاب ضرور لکھئے شائد میں بھی کچھ مدد دے سکوں۔ اس سفر کے بعد کیا کیا ہاتھ آنے والا ہے۔ ابھی

سے نظر آرہا ہے۔ پھر کتاب، کتاب کی تصنیف شہرت کا بھی تو بڑا ذریعہ ہے۔ اور ایکٹریس کا باب تو بڑا ہی نمایاں ہوگا اور وہ کرسچن لڑکی جس کو آپ پہروں گھورتے رہے تھے۔ اس کی میک اپ ایکٹریس سے تو کہیں بہتر تھی، پر کتنا شکوہ تلاطم خیز رویہ تھا۔ اس کی گفتگو کا۔ میں بھی تو اس کی سبک خرامی کو نظر انداز نہ کر سکی تھی۔ اس کے خد و خال اور اس پر غازہ اور اس کا سجاؤ۔ اس کے خاموش لبوں نے اسے سحر آفریں بنا دیا تھا۔ آپ کو تو غالباً اس سے کہیں زیادہ ایکٹرس پسند آئی ہوگی ۔بمبئی اترتے ہی آپ کا تعارف کرا دیا جائے گا۔ وہ گھتم گھتا ہو گئے۔ باہر کی فضا پر اندھیرے نے ضرورت سے زیادہ قبضہ جما لیا تھا۔

وہ چپ سادھے بیٹھے تھے اور اندھیرے میں انہیں سوائے بمبئی کے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس نے ایک دل آویز قہقہہ لگا کر ان کا چہرہ اندر کی طرف موڑ لیا۔

خیالات کا ہیجان پھر رابعہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ "تعلیم کو جاری رکھوں گی۔" تعلیم کو جاری رکھے گی۔ یہ چار بچوں کی ماں قلیل آمدنی، آمدنی کے ذرائع محدود کتنی وفادار ہے۔ رابعہ اپنے خاوند کی۔ خاوند دنیا کی پہلی اور آخری نعمت ہے۔ کیا شادی امداد باہمی کا ذریعہ ہے جو رابعہ نے تلاش کر لیا ہے۔ باوجود ہزار پریشانیوں کے رابعہ نے برداشت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ وہ کتنی مطمئن ہے۔ ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں اس نے ہمیشہ میری رہبری کی ہے۔ تعلیم کے پہلو بہ پہلو خاوند کے جذبات بچوں کی محبت پرورش کتنے بوجھ ہیں۔ اس غریب کے سر پر، آخر پروفیسر ہو کر دم لے گی وہ۔ اس نے فیصلہ کیا وہ کالج پہنچتے ہی اس کی تمام ذمہ داریوں کو سر آنکھوں پر اٹھائے گی۔ رابعہ نے نجات کو بہت قریب سے دیکھا

ہے۔ اس کی جدوجہد ہی نجات ہے اور جب وہ سنتی تھی کہ کالج کی ذمہ داریاں کالج کی چار دیواری کے اندر ہی ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کا اٹل فیصلہ تھا کہ پھر فرائض خانگی کو جٹ کیسے کر سکیں گے۔ رابعہ عورت ہے۔ یقیناً خاوند کا اقتدار وہ اپنی عادت کے مطابق رابعہ کی کی ہر بات کو آئندہ پر ڈال دیتی کیوں کہ اسے اپنے ساتھی، اپنے محبوب پر بڑا مان تھا۔ وہ جہاں پہنچی ہے، اس پر ایک بڑی شخصیت کا سایہ ہے۔

پو پھٹی۔ صبح کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے اپنی محویت کا عالم پھر توڑا آنکھوں میں روشنی لے کر کروٹ لی۔ وہ خاموش سنجیدہ صورت کھڑکی سے باہر درختوں اور تار کے کھمبوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے، جیسے ابھی ابھی ایک دوسرے سے گلوگیر ہو جائیں گے، دیکھتی رہی، پروین نے تھکان سے الجھنے والی آرزؤں کو روکا۔ اس کے بکھرے ہوئے بالوں سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ لٹیں لٹوں میں مِل جل کر گتھم گتھا ہو گئی تھیں آنکھوں میں بمبئی دیکھنے، بمبئی پہنچنے کی للچاہٹ موجود تھی۔ پروین کی کیفیات کا مطالعہ ہر لحظہ صاف شفاف تھا۔ ہر لمحہ جو گزر رہا تھا وہ پروین کو بمبئی کے قریب لئے جا رہا تھا۔ اس کا دماغی توازن فراست سے بھرپور تھا۔

دن کافی سے زیادہ چڑھ آیا تھا۔ اس نے کسی سوچ کے زیر اثر ہلکی ہلکی انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ میں ناشتہ نہیں کروں گی۔ رات کی رات میں گاڑی نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آپ تو شب جی بھر کر سوئے۔ کچھ خبر نہیں رہی آپ کو۔ اب وہ دونوں بڑی بے تابی سے بمبئی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

گاڑی پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ راجپوتانہ کا خشک علاقہ اور ریتیلے میدان اوجھل ہو چکے تھے۔ سبزہ کی دلکشی چھوٹے چھوٹے آبشاروں کی رعنائیوں اور زیبائیوں

نے مسکرانا اور مچلنا شروع کر دیا تھا۔ چاروں طرف مناظر ابھر رہے تھے۔ اور وہ دونوں کوپے کے اندر بیٹھے مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ذرا اکتاہٹ سی محسوس ہوئی تو وہ اٹھے اور انہوں نے اپنے بستر کے نیچے سے مطالعہ کی کتاب نکالی۔ اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ چونک اٹھی اور کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی جیسے اس کے لئے اجنبی ہے "ایسا نظر آتا ہے۔ آپ نے جی بھر کر مطالعہ کیا ہے اس کا۔ مہینوں میرے مطالعہ میں رہی ہے۔ کتنی بصیرت افروز ہے مصنف نے کیسی کیسی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے۔ ان نعمتوں کے مل جانے ہی سے ہم نے دنیا کو اپنایا اور پیار کے قابل پایا ہے۔

"نسیمہ نے محبت کو امانت کہا ہے۔ اس نے اپنے انتخاب کی روحانی قوتوں کا کتنا دعوائے پیش کیا ہے۔ نسیمہ کی ناچیز ہستی اور اس کی ان گنت خوشیاں اس کے محبوب کی پیداوار ہیں۔ کتنے خوبصورت الفاظ میں نسیمہ کا کردار پیش کیا ہے نسیمہ خود بھی تو تخیل کا کرشمہ ہے کہ میں جب چاہوں تجھے پاؤں تجھے چھو لوں۔ تجھے دیکھ لوں۔ تو مرے کس قدر قریب ہے۔ اس کے جس تلاطم میں اپنے آپ کو ڈالا ہے۔ وہاں ترے گرم گرم سانسوں اور ترے خوش آہنگ گیتوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میری منزل نامعلوم نہیں۔ سب کچھ سہی مگر ہر لمحہ ترے قریب ہوں۔ اگر میں ترا پیچھا کر رہی ہوں، تو تو بھی میرا دامن پکڑنے کے لئے بازو پھیلائے ہے۔ یہ نہ خواب ہے نہ تخیل۔ یہ حقیقت ہے۔ مرا قصور ایک فطری جذبہ ہے۔ لب سے لب مل رہے ہوں۔ وہ ایک طویل بوسے کے لئے ترس رہی تھی۔ نسیمہ کے الفاظ ایک ایسی لڑکی کے الفاظ ہیں جس نے محبت کو امانت سمجھا ہے اور اس کا دل گرد آلود نہیں سلگ

رہا تھا۔ اور اس وقت تک سلگتا رہے گا جب تک وہ امانت کے بوجھ سے باخبر ہے اور امانت امانت ہے۔ ہیروئن کے الفاظ کردار کے الفاظ کھلاتے ہیں۔ بہت دیر تک پروین گزرے دنوں کی یاد تازہ کرتی رہی۔

بمبئی، آگرہ اور دہلی کا نقشہ ہی تو ہوگا۔ سونے چاندی کا شہر۔ تجارتی شہر، آج انسانی حقوق اور اس کی ذمہ داریوں کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ جمالیاتی تصور نے انسانی شعور کو کتنی نشوونما بخشی ہے۔ کتنے ارتقائی مراحل انسانی تخلیق نے طے کئے ہیں۔ سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک وہ یوں مجھے تکتے رہے جیسے میں نے کوئی بڑی بات کہہ دی ہے۔ وہ میری بات کو تول رہے تھے۔ اور میں بمبئی کی شاہراہوں پر گھوم رہی تھی۔

سگنل نہ ہونے سے گاڑی ایک ویرانے میں رکی۔ مگر فضا کچھ ایسی متاثر تھی کہ مسافر یکے بعد دیگرے سبھی باہر نکل رہے تھے۔ جیسے سب کے سب بمبئی پہنچنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ دہلی سے چلنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے محسوس کیا مسافر کس تعداد میں سوار تھے۔ گاڑی میں اور ان کا سفر کیسے کٹ رہا تھا۔ وہ برابر سن رہی تھی۔ یہاں سے چل کر گاڑی اب بمبئی جاکر دم لے گی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اونچی اونچی عمارتیں، بڑی بڑی سڑکیں گھوم رہی تھیں۔ سمندر کا نیلا نیلا پانی، موجوں کی بے نیازیاں، یہ اتنا واضح تصور تھا کہ وہ دونوں ایک بار پھر دوش بدوش کھڑے ہو گئے۔ کس خلوص نیّت سے نسیمہ نے اپنے ناول کے محبوب ہیرو کا تصور تخلیق کیا تھا، اور اپنی آرزو کو ان حقیقتوں سے تعبیر کیا تھا، جنہیں خواب بھی بیان کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ نسیمہ کی عبارت یاد آتے ہی وہ مچھلی کی طرح پانی

کے چڑھاؤ کو دیکھنے لگی۔ جیسے زندگی کے تمام مراحل طے کر چکی ہے۔ اس کی زندگی کی تکمیل اس کے پہلو میں تلملا رہی ہے کس کی تکمیل کے لئے وہ ہمسفر تھے اس لئے بھی کہ اس کا اپنا محبوب اس کے سانس سے بھی زیادہ قریب اس کے ساتھ لگا کردار نگاری کا حق ادا کر رہا تھا۔

جب وہ بمبئی کے سٹیشن پر اترے تو ان کے جلال و جمال میں وہی خود اعتمادی تھی جو انہیں دہلی میں لئے پھر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر نے چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ دیر تک قدم قدم ان کے ساتھ چلتی رہی۔ لب کھلے کے کھلے تھے خنداں کشادہ پیشانی پر ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ ان کا بازو زور سے پکڑ لیا چمٹ سی گئی۔ گویا مقناطیسی قوت سے چھٹکارا مشکل تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک اودھم مچا ہوا تھا۔ کوئی کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ہر عورت ساڑھی پہنے تھی۔ اور لطف یہ کہ ہر ایک کا انداز اپنا تھا۔ وہ بار بار کوشش کرتی رہی کہ دونوں کے شانے ایک دوسرے سے ملے رہیں اور وہ اس گھمسان میں ایک جسم ایک جان ہو کر چلتے رہیں۔

اس نے بمبئی کو دہلی سے قطعی مختلف پایا بمعہ وہاں کے بسنے والوں کے۔ اس کا ان سے ایک پل کے لئے بھی جدا ہونا قطعی مشکل ہو رہا تھا۔ اگر کبھی کسی راہ گزر پر اس کا قدم ادھر سے ادھر ڈھلک جاتا تو وہ ایسا محسوس کرتی جیسے اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔

پہلا نام بوری بندرگاہ ہے۔ باقی سب نام بعد کی پیداوار ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے اِدھر سے اُدھر پھرتے رہے اور آج کے پروگرام کے مطابق اپنا سفر طے ہوتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہ پہنچ کر پروین پر کچھ بے معنی سا احساس طاری تھا وہ ہر قدم پر اپنے دوسرے قدم کے متعلق سوچتی محسوس ہوتی تھی۔ سامان بردار جہاز دوسرے

جہاز جو اپنے پورے جاہ و جلال سے لنگر انداز تھے۔ یہاں سے اٹلی، فرانس، انگلینڈ جانے والے تھے۔ پروین کی دلچسپی کا سامان آج اسے وکٹوریہ جو جہازوں میں بالکل جدید قسم جدید طرزِ زندگی کا نمونہ تھا۔ دیکھنا تھا اور اسے دیکھنے کے لئے انہوں نے باقاعدہ اجازت حاصل کر رکھی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے اندر باہر پھرتے رہے، لطف اندوز ہوتے رہے۔ انہوں نے ہلکی پھلکی چائے بھی پی اور جہاز کے چند افسروں سے بھی ملے۔ پروین نے ان مغربی لوگوں کو اپنی مشرقیت سے بڑا متاثر کیا۔ اس کا اندازِ دلبری اس کا اپنا تھا۔ جب وہ باہر نکلے اور سیڑھیوں سے قدم قدم اترے تو انہیں ایک بڑے جہازران نے الوداع کہا دعا دی۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت روشنی نمودار تھی اور وہ اس انداز سے چلی تھی کہ جیسے ساڑھی کا پلو اٹھائے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ایسی نظر آتی تھی جیسے اجنتا کے غاروں سے کوئی دیوی زندہ باہر نکل آئی ہے۔ اور اب اس دنیا کی تلاش ہے جہاں سوائے اطمینان اور سکون کے کچھ نہیں۔ اس نے گردن اٹھا کر جب ماحول کا جائزہ لیا تو اسے یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ اس کی پوجا کی جائے، اس سے مرادیں مانگی جائیں۔ وہ مڑ کر دیکھنے لگی وہ اس وقت اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی، انہیں سمجھا رہی تھی، آنکھوں سے، لبوں سے، اشاروں سے کہ وہ اب ان غاروں میں واپس جانے کے قابل نہیں جہاں سکوت کا عالم ہے۔ لبوں پر مہرِ خاموشی ہے۔ وہ اس ساحر اور جادو نگری سے بچ نکلی ہے۔ وہ اجنتا کے غاروں سے زندہ نکل آنے والی دیوی، پوتر ساحرہ، سمندر کی ان لہروں کو دیکھ رہی تھی جو بڑے بڑے جہازوں کو اڑا کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل پر پہنچا دیتی ہیں۔

کل شام انہوں نے مالابار ہل پر گزاری تھی۔ بمبئی میں ان بسنے والوں کا جائزہ لیا تھا جو دولت سے سرشار زندگی کی جمالیاتی لذتوں سے بھی بہرہ ور ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کے پہلو میں بھی دل ہے مالابار کی بلندی سے چوپاٹی کی ہماہمی، عوام کی سرگرم زندگی، اس پر ان کی نگاہیں بڑے عمیق انداز میں

پڑ رہی تھیں سمندری ہواؤں کا رخ اس وقت تھمتا جا رہا تھا۔ ایک معصوم سا بچہ اپنے جھولے میں بیٹھا اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ مچھیروں کو ادھر سے ادھر لے جانے میں اپنی توانائی کا اظہار بڑی سرگرمی سے کر رہا تھا۔ اس نے سمجھا پروین اسے بلا رہی ہے۔ وہ لمحہ بھر میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ پروین نے سوال کیا پانی کتنا گہرا ہے؟ اس کی سطح پر سیاہ مٹی کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ سیاہ مٹی میں نے دیکھی ہے لیکن کبھی اس کی سطح کو میں نے چھوا نہیں۔ اسے کوئی راز معلوم نہیں وہ ان چھوٹے بڑے سمندروں کی آپ بیتی سے بالکل واقف نہیں۔ چھوٹا مانجھی بڑا ہوشیار تھا وہ سمجھتا تھا ملابار اجنبیوں کی سیر گاہ ہے۔ پروین نے چھوٹے مانجھی سے باتیں کرتے وقت کچھ ایسا محسوس کیا۔ اگر وہ اس وقت اپنے برقعے میں ہوتی تو زیادہ لطف اندوز ہوتی۔ اسے اس مانجھی سے باتیں کرتے ہوئے گمشدہ جنت کا راز معلوم ہو جاتا۔

پروین نے اسے کچھ کمتر خیال کرتے ہوئے مذاق سے کہا تم تو چپو اچھالنے میں بڑے اناڑی معلوم ہوتے ہو۔ میری ماں ہر صبح مجھے یہ کہہ کر یہاں چھوڑ جاتی ہے تم ان پانیوں سے واقف نہیں پہلے ان سے دوستی پیدا کرو۔ ان کو اپنے بے رنگ راگ سے متاثر کرتے رہا کرو تمہارا بابو تمہیں مل جائیگا۔ تمہارا بابو مر رہا تھا تو اس نے کہا تھا اس بچے باورے کو کشتی چلانے سے کبھی نہ روکنا۔ وہ ایک روز پانی کی تہہ سے ان تمام مونگوں اور موتیوں کے رول لے گا جو بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ پروین کی چمکدار آنکھیں نیم وا ہو کر رہ گئیں اور وہ مانجھی کو مجبور کرنے لگی۔ کہ وہ اپنا چپو اتھرن سے باندھ کر ان کے پاس پہنچ جائے۔ مانجھی بولا اب شام ہونے کو ہے اور میری ماں آنے والی ہے۔ اور وہ مجھے گھر لے جائے گی۔ اور وہ یہ کبھی نہیں پوچھتی کہ میرے بچہ باورے تم نے آج سارے دن میں کیا کمایا ہے۔ مانجھی گنگناتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ پروین اور وہ وہیں بیٹھ گئے۔ جیسے دونوں تھکن سے چور چور تھے اور مانجھی نے ان کی آرزوؤں میں توانائی بھر دی تھی۔

وہ ایک پُر تکلف ریسٹوران میں جا بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دونوں تازہ دم اور ہشاش بشاش تھے۔ پروین نے خلافِ معمول آج شلوار پہن رکھی تھی وہ اپنے فاخرہ لباس میں آج بڑی اُجلی اُجلی ان تمام قیود سے آزاد تھی جو دہلی اور آگرہ میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔ تجارتی شہر تجارتی لوگ، ہر چہرے پر تفکرات لکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تھکن اور بے اطمینانی یہاں کے بسنے والوں کے اوصاف تھے۔ اسی سے ان کی بوجھل زندگی رواں دواں تھی اور وہ فخریہ کہتے تھے سونے چاندی سے ہر وحات ہلکی ہے۔

ریسٹوران میں دائیں بائیں۔ آگے پیچھے آئینے قرینے سے لگے تھے اور یہ ٹریڈ مارک تھی کی چھاپ ہے۔ جدھر دیکھتی اپنا ہی عکس پاتی تھی۔ اگرچہ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا اور یہی ایک سبب تعاجب اپنے عکس کے آگے پیچھے آنے جانے والوں کا عکس دیکھتی تھی تو آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ دروازے کے سامنے جو آئینہ لگا تھا۔ اس میں آنے جانے والوں کا بے پناہ ہجوم نظر آیا تو اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھی مگر یہ تانا بانا بدستور یونہی چلتا رہا۔ وہ سمٹتے سمٹتے سکڑ گئی۔ دم گھٹا گھٹا محسوس ہو رہا تھا۔ چاہتی تھی اٹھ کر باہر نکل جائے اور تازہ ہوا میں جا دم لے۔ اس نے دوپٹے کو درست کرتے ہوئے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا لیکن انہوں نے بیٹھے رہنے کی تلقین کی اور وہ بیٹھی رہی۔

قریب ہو کر شکایت کے طور پر کہنے لگی مرا دل چاہتا ہے ہم یہاں سے اٹھ کر باہر کھلی اور تازہ ہوا میں چلے جائیں۔ یہ کہہ کر اس نے کئی تیور بدلے۔ اس کے چہرے پر اپنی برتری کے نشان اور احساسات ابھرتے رہے۔ اس کا ابھی بدتمیزیوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھتی رہی کہ اتنے میں ریسٹوران میں ایک نیا جوڑا بے تکلف داخل ہوا۔ عورت مغربی تھی اور مرد ہندوستانی، جس کے چہرے سے اس کی بے اطمینانی ظاہر تھی۔ کوئی ایسا

نشان تک موجود نہ تھا جس سے اس کے اطمینان کا ثبوت مل سکتا۔ عورت اپنے جدید لباس میں بڑی مرعوب دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا خاوند اسے ریسٹوران میں دیکھ کر کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسے غلط جگہ پر لے آیا ہے۔ وہ مغربی عورت جب اپنی تہذیب کا کچھ مان پیش کرتی تو اس کے چہرے پر جھریاں اس قدر نمایاں ہو جاتی تھیں کہ وہ اسوقت بیوی کے بجائے اس کی ماں نظر آنے لگتی تھی۔

پروین کے لئے ریسٹوران کی فضا کسی قیمت پر بھی قابلِ قبول نہ تھی وہ متنفّر ہوتی گئی اس کی نگاہ باسی پھولوں کے گلدستے پر جا پڑی۔ خدا جانے وہ کب سے میز پر پڑا بوند پانی کے لئے ترس رہا تھا۔ پھولوں کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ جب مرجھائے ہوئے پھول گزرتی ٹرام کے دھماکے سے ہلتے تھے تو پروین کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اسے یاد آیا۔ کالج کا مالی جس کی معصوم بچی اس کے لئے تقریباً ہر روز تازہ پھولوں کا گلدستہ تیار کرتی اور اسے بڑی عقیدت سے پیش کرتی تھی اور جب وہ اس کے کمرے سے واپس لوٹتی تھی، تو بی بی سلام کہہ کر رخصت ہوتی تھی۔ وہ اسے بہت بھلی معلوم دیتی تھی۔ اس کی تعلیم کے لئے سوچتی تھی مگر کوئی راہ نہ پاکر چپ کی چپ رہ جاتی تھی۔ اسے یاد آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ بچی نے اسے الوداع کہتے ہوئے اسے نرگس کے پھولوں کا ایک گلدستہ دیا تھا اور دعا دی تھی کہ بی بی کی چھٹیاں مبارک ہوں اور ہماری بی بی اپنے کالج خیریت سے واپس لوٹ آئے اسے یاد آیا کہ بوڑھا مالی دور کھڑا یہ منظر انہیں آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کا اپنا لکھا ہوا کھیل سٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔ معصوم بچی نے جس کامیابی سے اپنا پارٹ ادا کیا تھا وہ اسے بھولنے والی نہ تھی۔ ساتھ ہی ایک کر کے درجنوں لڑکیاں اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں جن کا مدعا پرنسپل کو رخصت کرنا تھا۔ جب وہ ان کے گھیرے میں تھی تو نرگس کا گلدستہ جو اسے بطورِ تحفہ پیش کیا

گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھا۔ معصوم بچی کو اس نے اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا۔ لڑکیوں نے مل کر اس کی عظمت کے نعرے لگائے تھے۔ اس کی چھٹیاں پُر لطف گزریں۔ اس کے لئے مبارک پیغام لائیں۔ وہ ہر چھوٹی بڑی لڑکی سے بے تکلفانہ انداز میں ہم کلام تھی۔ اس نے معصوم بچی کو انعام دیا تھا۔ اس کے گال تھپکے تھے اور اقرار کیا تھا کہ وہ چھٹیوں کے بعد ان کی تنخواہ بڑھائے گی۔

میز پر پڑا ہُوا گلدان اور اس کے پھول نفرت کا موجب بن گئے تھے۔ سانس رکتا تھا تو آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ وہ اٹھی اور اس نے مرجھائے ہوئے گلدستے کو باہر پھینک دیا وہ مسکرائی، دنیا مسکرائی، ہر آئینہ اس کی جرأت پر مسکرایا۔ اس نے ان کی مدوجزر کا جائزہ لیا تھا تو ابھی تک مسکرا رہے تھے۔ ایک بوڑھا جو بالکل اکیلا تھا، اپنی نمائش کی غرض سے ان کے عین سامنے والی میز پر آکر جم گیا۔ پروین کو اس کی حرکت ناگوار گزری۔ وہ پروین کو اور اس کے محبوب کو برابر گھور رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے فعل کا مالک ہے۔

ریستوران کی چار دیواری میں اودھم مچا ہُوا تھا۔ اس میں کوئی موزونیت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ سب کچھ پروین کے لئے نیا تھا اس کا ان مضحکہ خیزیوں سے لطف اندوز ہونا ناممکن تھا۔ مگر اس کی نفاستِ طبع نے کسی بھی ایسی چیز کو گوارا نہ کیا تھا جس سے اس کے حسنِ اخلاق میں بال آجاتے۔ اس کی دونوں نگاہیں متوجہ تھیں کہ وہ ریستوران سے باہر نکل جائیں۔

ایکا ایکی ریستوران میں ایک شور بلند ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی نے ایک یورپین کے طمانچہ مار دیا ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ دونوں باہر کی طرف اٹھ بھاگتے۔ سڑک پر چلنے والے بے سوچے سمجھے اوپر کی منزل پر چڑھ آئے۔ یہ ہندوستانی ریستوران ہے۔ پیرس تھوڑا ہے۔ جہاں ہر عورت کو ننگے اور اپنی عریانی کا مظاہرہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

خواہ مخواہ تماشہ دکھانے سے کیا ہاتھ آئے گا۔ یہ ریسٹوران ہے۔ یہاں سب کو آنے جانے کا حق حاصل ہے۔ یہاں ابھی تک عورت کو عورت کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔

جی ہاں یہ خطہ ہی ایسا ہے جہاں بیویاں رہتی ہیں۔ بوڑھا جو عین پروین کے سامنے آن بیٹھا تھا۔ چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا۔ اور پروین کو گھورنے میں دم سادھ لیتا تھا۔

مغربی بیوی کا خاوند اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی بیوی کو ساتھ لئے ریسٹوران سے باہر نکل گیا تھا۔ کتنا سہما ہُوا تھا وہ۔ بتر بتر ہر چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا جا رہا تھا۔

"سچ ہے" بوڑھے نے اچھل کر کہا۔ "وہ دیکھو" اس کا اشارہ پروین کی طرف تھا۔

"ابھی ہم میں ایشیائی خون موجود ہے۔ غیرت اور شرافت کا پاس ہے۔"

کوئی دوسرا بولا۔ "یہ سب حرامی ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کو کو بھی عریانی سکھانا چاہتے ہیں۔ اور انہیں اپنی عورتوں کی آوارگی سے ناپتے ہیں۔"

بوڑھا چلاّیا اور بازو بلند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ایسے جوڑوں کا ہندوستانی ریسٹوران میں داخلہ ممنوع قرار دے دینا چاہیئے۔

وہ ہندوستانی نوجوان جس کی بیوی مغربی تھی۔ اپنی بیوی کو سہارا دے رہا

تھا۔ کیونکہ وہ اس ہندوستانی ریسٹوران میں ہندوستانیوں کی بدتمیزی سے گھبرا کر
بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ بہت سے لوگ اس کی طرف اس انداز سے توجہ
دے رہے تھے کہ ان کا فعل خود ہندوستانیوں کے لئے باعثِ شرم ہے۔
نوجوان کے چہرے کا رنگ نیلا پیلا ہو رہا تھا۔ اور عورت بے حس و حرکت بے جان
سی معلوم دے رہی تھی۔

ہمارے خطے کی عورت باعصمت ہے۔ ان مغربیوں کی تہذیب ہماری،
ذہنیت ابھی اتنی رنگ آلود نہیں ہوئی کہ ہم اپنی حیا اور شرافت سے ہاتھ دھو
بیٹھیں۔ یورپین خود تو ریسٹوران سے باہر جا چکا تھا۔ مگر اس کی عورت ابھی
تک باتہذیب ہندوستانیوں کے نعرے اور الفاظ سن رہی تھی۔ کیا کوئی ایسا
بھی غیرت مند ہندوستانی ہے جو اسے عورت سمجھ کر اپنی پناہ میں لے لے۔ آخر وہ
اخلاق اور مروّت کی حقدار ہے۔

چھٹیاں آدھی سے زیادہ گزر چکی تھیں۔ ان کے سفر کے مقاصد بھی
قریباً ختم ہو چکے تھے۔ پروین بمبئی کے بازار صرافہ سے اکتا چکی تھی۔ رات
بھر پروین واقعات پر غور کرتی رہی۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، کتنا شرمناک
تھا۔ وہ کن خوشی کن جذبات کے تحت ریستوران میں داخل ہوئے
لیکن انہیں جو عظیم صدمہ ان لوگوں کی ذہنیت سے ہوا وہ ناقابلِ
برداشت تھا۔ پروین ان بے ہودگیوں کا کیا جواب دیتی۔ بمبئی میں اس
کا نظریۂ جہالت ہی بدل گیا تھا۔ اسے کیسے یاد نہ آتا کہ جب وہ جہاز
دیکھنے گئی تھی تو مغربی جہاز رانوں نے اس کا کس خندہ پیشانی سے

خیر مقدم کیا تھا۔ اور انہوں نے کس سنجیدگی اور سلجھے ہوئے انداز سے اپنی مہمان نوازی کا ثبوت دیا تھا۔ بمبئی اسے یوں نظر آ رہا تھا جیسے یہاں صرف روپے پیسے کی لوٹ نہیں بلکہ انسانوں اور انسانیت کی بھی لوٹ کھسوٹ برابر جاری ہے۔ وہ چاہتی تھی، دوسرا سانس آنے سے پہلے اپنے آپ کو آرزوؤں کو اور اپنے محبوب کو لے کر بمبئی سے نکل جائے تاکہ اس کے آئیڈیل اور اس کے اپنے معیارِ زندگی میں سرِ مو فرق نہ آنے پائے۔

جب وہ اس آئینوں والے ریسٹوران میں ان کے ہمراہ داخل ہوئی تھی اور اسے اپنا عکس دکھائی دیا تھا۔ وہ اس سے تقریباً لپٹ گئی تھی۔ اس نے انہیں اس فضا سے نکل جانے کا اشارہ بھی کیا تھا، اس کو یقین تھا۔ یہاں اسے اپنے عکس کے برابر کئی ایسے مکروہ عکس بھی دیکھتے ہوں گے جو اس کی بلندیوں کو کچل ڈالیں گے۔ اس نے تو سوچ لیا تھا کہ یہاں ہر دن ایک نیا دن ہوگا۔ زندگی کی ہر کروٹ نئی اور خوشیوں سے معمور ہوگی۔ اور وہ زندگی کو سرسبز کر کے ہی بمبئی سے رخصت ہوں گے۔ مگر ابھی تک اس کے دل پر بوجھ موجود تھا۔ جو اس نے دیکھا اور بڑی شدت سے محسوس کیا تھا اور وہ بغیر کسی اظہار کے ریسٹوران سے باہر نکل گئی تھی۔

آج شام وہ باب الہند کے عین سامنے کھڑے تھے۔ تاج محل ہوٹل قریب ہی نظر آ رہا تھا وہ حسبِ اپنی عادت کے مطابق بمبئی کی تاجرانہ فضا، اس کے تاج محل ہوٹل پر نکتہ چینی کر رہی تھی اسے ہوٹل کا نام خاص طور پر مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس نے کہا تاج محل ہوٹل کو دیکھ کر اس کے نام سے مجھے زبردست جھٹکا لگا ہے۔ میری رائے میں اس ہوٹل کا نام تاج محل رکھنا بدمذاقی

کے علاوہ ایک بہت بڑی سازش بھی ہے۔ اس کا نام بدل دینا چاہئے۔ وہ چلتے چلتے بغیر کسی ارادہ کے پاس پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئے —— اس نے گردن بلند کرتے ہوئے کہا۔ مجھے تاج محل آگرا پھر دیکھنا ہوگا۔ جب ہم وہاں سے گزریں گے۔ تو چاند چودھویں کا ہوگا ہم یقیناً پہلے سے بھی زیادہ لطف اندوز ہوں گے۔ ہم اس کی روشوں پر اس کے کھلے کھلے صحنوں پر چلتے رہیں گے اور ایک لافانی محبت کی کہانیاں دہرائیں گے۔ شاہ جہاں نے تاج محل آگرا تعمیر کرکے مغلوں کے ذوق کو کتنا بلند کیا ہے۔ مغل تہذیب ہی تو ہے جسے دیکھنے کے لئے دنیا بھر کے سیاح جوق در جوق یہاں چلے آتے ہیں۔

سمندر کی لہروں کا شور دھندلی دھندلی شام میں بلند ہوتے ہوئے ایک آہنگ بن جاتا تھا اور وہ دونوں ایک بنچ پر بیٹھے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے اور اتنے قریب ہو جاتے تھے جیسے ان دیکھے بازوؤں نے انہیں بھینچ کر ایک کر دیا ہو۔

ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی پروین اپنے آپ کو یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ پرنسپل کے کمرے میں بیٹھی آنے جانے والی لڑکیوں کی راہ دیکھ رہی ہے۔ کتنا ہجوم رہتا تھا۔ ان معصوم بچیوں کا جن کے کردار جن کے مستقبل کی وہ ذمہ دار تھی۔ آئینہ میں جب اپنی شکل دیکھی تو مجسم تمنا ہو گئی۔ چھٹیاں گزر گئیں اور وہ اپنے سفر کی تمام لطافتوں سے دوچار کچھ تھک کر پھر مستعد ہو گئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو اس کی دھرتی بدل گئی۔ بستر پر جا لیٹی تکان سے چور چور تھی۔ کچھ اکتاہٹ۔ کچھ زندگی کی رنگ آمیزیوں کا تصور دیر تک چپ کی چپ رہی۔ دیر تک دونوں

سستاتے رہے۔ پروین نے پہلو بدلا اور ان کو بڑے غور سے دیکھنے لگی یہ اکتاہٹ یہ تکان بڑے شہروں کا ایک بڑا تحفہ ہے۔ بوڑھے کی سفلانہ حرکات، لوگوں کی ذہنی پستی کا احساس، اس نے بڑے ضبط سے کام لیا تھا۔ اس کا دل چاہا بار بار چاہا کہ ان پہ قہقہے لگاتی چلی جائے پر اس نے نکتہ چینی نہ کی اور ضبط کر کے ٹال گئی اور اس ادب سے پہلو بدلا بات بدلی اور بمبئی کی خرافات کو نہ دہرایا۔ دہلی کا خیال آتے ہی اس نے ان کی طرف دیکھا اور اس کا اس طرح دیکھنا بہت کمیاب ہوتا ہے وہ بھی سستا رہے تھے۔ وہ بھی تو یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ ان کے پہلو میں لیٹی رہی اور اس نے چپ کو اور زیادہ موقع دیا تاکہ وہ ان کے آرام میں مخل نہ ہو۔

نسیمہ کا کردار اس کے ابعاد اس کا اپنے ہیرو کے ساتھ رابطہ اور اپنے متعلقات کا خاکہ اپنی ذہنی نشوونما کے مطابق تیار کرنے لگی اس نے اپنے آپ کو اس کردار سے مختلف اور مضبوط پایا کہ اپنے کردار کی خود تعریف کرنے لگی۔ رابعہ اس کے نیچے اس کے ارادے اس کی کم آمدنی وہ اپنے مستقبل کو شاندار بنانے میں کتنے اعتماد سے کام لے رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی اس نے اپنے آپ کو اس قدر مختلف پایا کہ ان کے پہلو سے اٹھ کر پھر آئینہ کے سامنے جا بیٹھی۔

ہوٹل کے ملازم نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر دستک دی اور واپس لوٹ گیا۔ ہوٹل کے منیجر نے ان کا بل ملازم سے واپس لیتے ہوئے پر معنی ہنسی سے پوچھا۔ کتنی بار دستک دی تھی۔ تم نے یہی کوئی دو تین بار، ملازم نے کہا رات تو بمبئی چھوڑنے کے لئے کہہ رہے تھے دہلی

کچھ پسند نہیں آیا ان کو۔ منیجر نے ان کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— دیکھنے کو تو بہت جنٹلمین ہیں۔ مگر بھائی ان کے آنے کا مقصد کون جانے۔ منیجر نے بل شیشے کے پیپر ویٹ کے نیچے دبا دیا اور خود سیٹھ کے نمبروں کا انتظار کرنے لگا۔ ورفون اٹھا لیا۔

فیصلہ ہوا تھا وہ بمبئی سے سیدھے تاج محل دیکھنے آگرا جائیں گے اور یہی ایک اہم پہلو ان کے سفر کی تکمیل اور مستقبل کا سہانا خواب تھا۔ کیوں کہ پروین کا فیصلہ تھا: بمبئی کے صرافہ بازار اور اس کی اکتاہٹ کو ختم کرنے کے لئے تاج محل دیکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں وہ ان محبتوں کو پھر سے تازہ دم پائیں گے جن کی خاطر ان کا یہ سفر طے پایا تھا۔ اسے دہلی اور آگرا دنیا کی افضل ترین یادگاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ محبتیں زندگی کی تکمیل اور مستقبل کے اضافے بھی ہیں۔

یہ کیسے باور کر لوں تعلیم کمزور اور بزدل بنا دیتی ہے وہ ذرا بھی سوچتی ہے تعلیم ہی تو الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے میں انسان کی مددگار ثابت ہوتی ہے ہیں کیا، میرے جیسی ہزاروں عورتیں ان کی بھینٹ چڑھ سکتی ہیں۔ شاید صدیوں کے بعد فطرت ایسی شخصیت پیدا کرتی ہے جس پہ قربان ہونے کو جی چاہتا ہے یہ کوئی احسان تھوڑا ہے۔ میرے لئے فخر ہے میرا ہی تو رتبہ ہے کہ انھوں نے مجھے چنا اور اپنے دل میں جگہ دی۔

ہر کوئی محبوب بن کر ہی بیوی بننے کا حق حاصل کرتا ہے۔ پروین ان کی محبت سے ان کی توجہ سے پروین ہے۔ میری زندگی کی تمام بہاریں ان کی زندگی پہ ان کے اخلاق پہ ان کی پروقار شخصیت پہ نثار ہیں۔ میرا مستقبل ان کا مستقبل ہے۔ آنے والے واقعات کے زیر اثر مضطرب ہوتی گئی کروٹیں بدلتی رہی کر رہے

گئے سکوت میں امی نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ اس کی اپنی بے چینی سے اضطراب پیدا ہونا ممکن ہے۔ اُٹھنا چاہا لیکن جوں کی توں لیٹی رہی۔ اسے صرف ان کا احترام تھا۔ اس کا یہ نظریہ تھا کہ وہ میری امانت ہی تو نہیں۔ مجھ سے زیادہ وہ ایسی شخصیت کے مالک اور قوم کی امانت ہیں۔ اسے ان کی خدمات کا احساس آج رات کچھ اس شدت سے ہوا جیسے وہ آج پہلی بار اپنے اس نظریے کو دہرا رہی ہے۔ اس نے اپنے سانس تک کو روک لیا اور چپ کی چپ لیٹی رہی۔ بیڈ سوئچ پلنگ کے ساتھ کچھ ایسے جیسے بے ضرورت پڑا ہوا لٹک رہا تھا۔ بچوں کی مانند اس سے کھیلنے لگی جیسے اس کے سہارا تلاش کرنے کے درپے ہو۔

وہ بیڈ سوئچ سے ساتھ دل بہلاتی رہی اور وہ پہلو میں پڑے سستاتے ہی نہ رہے تھے۔ بلکہ ان پر نیند غالب آگئی تھی۔ بمبئی کی تھکن اور اکتاہٹ نے انہیں چور چور کر دیا تھا اور ان کی پروین آزردہ خاطر تھی، وہ پروین کے لئے کیا کچھ نہیں سوچنے لگی انہوں نے اس کے لئے کیا کچھ کرنا ہے۔ کیا کچھ پیش کرنا ہے یہ پروین جانتی ہے۔ آج کے حالات کتنے روح پرور اور کتنے بلند پرواز ہیں۔ کاش آج ان کی بیگم صاحبہ زندہ ہوتیں۔ تو میرے لئے کتنے فخر کا مقام ہوتا۔ پھر یہ مقام ایک عورت کے لئے کتنا صبر آزما اور اس کے امتحان کا موقع ہوتا ہے وہ تو اپنے وقت کی ایک مقدس ہستی تھیں۔ وہ بہت مخلص تھیں۔ ان کی یاد سے روحانی سرور ہوتا ہے۔ میں نے کیا نہیں دیکھا تھا۔ ان کو وہ بچوں سے دل بہلاتی ہیں مجھے یاد ہے انہوں نے جب میں فقط ایک طالب علم تھی۔ پیار سے میرے گالوں کو تھپکا تھا اور ایسا نظر آتا تھا۔ وہ دل بہلانے کی راہیں تلاش کر لیتی تھیں۔ میں ان کے

پاؤں چومتی۔ وہ پرستش کے قابل تھیں۔ جذبات میں کھو گئی تو بیڈ سوئچ دب گیا اور کمرے میں اندھیرے کی تہیں چڑھتی نظر آئیں۔ میں انہیں پیار کرنے میں ان کا ادب بجالانے میں دنیا کی ہر عورت کو پیچھے چھوڑ جاؤں گی۔ اسے خیال آیا۔ نسیمہ کی طرح اگر وہ خود بھی روپوش ہو جائے تو بزدلی ہوگی۔ میں ہر قیمت پر ان کی غیر معمولی شخصیت سے وابستہ رہوں گی۔ چاہے میرا انجام ان کی لاپروائی سے کتنا بھی سبق آموز نہ ہو جائے۔ نسیمہ کا کردار پختگی اور مقابلے کی منزل تک پہنچ ہی نہ سکا تھا تو وہ اپنے محبوب کی نیت کا اندازہ ہی کیسے کر سکتی تھی۔ اور یہ بھی اسی کی کمزوری کا اظہار تھا۔ کہ یہ لکھ کر بستر کے سرہانے خط چھوڑ گئی کہ میں آپ کو یاد آتی رہوں گی۔ میں آپ کے ذرّے ذرّے میں سما گئی ہوں۔ تشنگی محبت کی روح ہے اور تشنگی سے محبت زندہ ہے۔ اس نے ہلتے ہوئے بیڈ سوئچ کو دبایا اور منتظر دیکھتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا محبوب روشنیوں کی دنیا ہے۔ اس میں حال۔ ماضی اور مستقبل کا سوال نہیں۔ ممتاز اور کامیاب انسان وہی ہے جس کے دل اور دماغ ممتاز اور سر بلند ہیں۔ میں ہرگز ہرگز ایسا نہ کروں گی۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مرد عورت جلد اکتا جاتے ہیں۔ اس میں عورت کی شخصیت اور اس کے اعتماد کو بھی دخل ہے۔ عورت خود اکتاہٹ کی ایک شکل ہے یہ خیال آتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہے اور وہ کسی سے بغل گیر ہے۔

وہ دہلی سے کہیں زیادہ عرصہ بمبئی میں ٹھہرے تھے۔ اکتاہٹ کو ختم کرنے کے لئے۔ مگر دہلی کبھی نظر سے اوجھل نہ ہو سکا۔ ہمایوں کا مقبرہ اور پرقع: بازوؤں اور گھٹنوں کے درمیان منہ کو یوں چھپا لیا۔ جیسے جھروکے سے دیکھ رہی ہے۔ اسے یاد

تھا وہ بے تحاشہ قطب مینار کی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ یوں چڑھتی چلی گئی جیسے ستاروں کو چھو لے گی اور ان کی مدھم مدھم روشنیوں میں مدغم ہو جائے گی۔

تاج محل اور مقبرہ ہمایوں میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے ہمیں یہاں سے سیدھا آگرہ جانا ہے۔ جہاں تاج محل صدیوں سے جمنا کے کنارے کھڑا ہندوستان کے جنت نشان ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ کتنی وسعت۔ کتنا پھیلاؤ ہے ان مرمریں سلوں میں جو ایک دوسرے کے ساتھ ازل سے پیوست ہیں۔ ان جالیوں کے پیچھے اس کو تخلیق کرنے والوں کے سائے ابھی تک اپنی دوام کا یقین دلاتے ہیں۔ ان کی پاکیزہ روحیں آنے جانے والوں کو تکتی رہتی ہیں، تازہ دم ان میں اکتاہٹ اور افسردگی نام کو نہیں۔ وہ شان و شوکت کے وارث کتنی پرشکوہ زندگی کا تصور رکھتے تھے۔ عشق و محبت کی وہ دل نواز گھڑیاں پھر کبھی واپس نہ آسکیں۔ کس قدر ہنر شناس اور ہنر پرور تھے وہ لوگ جن سے انسان کی عظمت اور انسانیت کا وقار زندہ ہے۔ ان ولولہ انگیز تصورات میں اسے وہ شام و سہانی گھڑیاں بھی یاد آئیں۔ جب وہ خوش رنگ رقع بچھا کر بڑے بے تکلفانہ انداز میں اس پر پورے اطمینان سے بیٹھے تھے اور ایسا نظر آتا تھا اس کا یہ رقع ساری کائنات کو اپنے گھیرے میں لئے ہے۔ وہ جادو کے قالین سے کیا کم تھا۔ جہاں وہ چاہتے تھے پل کے پل میں پہنچا دیتا تھا۔ وہ نئی سے نئی فضا میں خوشبوؤں سے معطر ہواؤں، شہروں کی وسعتوں، میناروں کی بلندیوں سے بھی بلند تر اڑے جا رہے تھے۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا کیا وہ رات پھر واپس آسکے گی۔ وہ مقبرہ وہ جمنا کا پانی! وہ رک گئی۔ اسے عین اس وقت اپنے کالج کی

چار دیواری نظر آئی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سایہ رینگتا ہوا نظر آیا۔ وہ سایہ ایک طالبہ سوسن کا تھا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پرنسپل ایک ذمہ دار پرنسپل کی حیثیت سے وہ اسے تنبیہہ کرنے پر مجبور تھی کہ وہ رات کو کالج کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ان دروازوں سے باہر نہ جھانکا کرے۔ سوسن کی یہ حرکت یاد آتے ہی اسے کالج کی تمام ذمہ داریاں بری طرح سے جھنجھوڑنے لگیں۔ ریحانہ کی یاد آتے ہی آنسو نکل آئے۔ سب کے کمروں میں باری باری جھانک آئی تھی۔ لڑکیاں اپنے اپنے ماحول کے ساتھ کس طرح نپٹ رہی ہیں۔ وہ چپ تھی۔

جو بھی یاد آیا دبا گئی۔ کالج کا نام آتے ہی وہ اس کے خیالوں کو بدلنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس پر بھی اسے ریحانہ کی صورت و سیرت یاد آنے لگی اور اس کے سسکنے کی آوازوں سے اس کے کان بجنے لگے۔ وہ یقیناً ایک ذہین اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اس نے پرنسپل سے شکایت کی تھی۔ اس کے والدین اس کی بے وقت شادی کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑے۔ اس نے ریحانہ کے سامنے اپنا آپ بطور مثال پیش کیا تھا کہ وہ اپنی ہٹ کی کتنی پکی تھی۔ اس نے اپنے ارادوں کو پورا کیا اور اس نے کبھی والدین کو موقع نہ دیا تھا کہ وہ اس کی تعلیم کے سلسلہ میں سنگ راہ بنیں۔

زندگی کی ایک ہی شگفتہ آرزو تھی کہ وہ کسی دن کسی کالج کی پرنسپل ہو جائے گی۔ اسے طاہرہ کا کردار پسند تھا۔ وہ جب موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ لگائے ایک

مغرور طوطے کی طرح اِدھر اُدھر گردن اٹھائے آنکھوں کو پھیرتی تھی تو ایسا معلوم دیتا تھا کہ وہ ہر دیکھنے والے پر طنز کر رہی ہے۔ چشمہ اس کی بلند پیشانی اور بڑی بڑی آنکھوں پر بہت بھلا معلوم دیتا تھا۔ اور اس نے سنجیدگی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔

عطیہ جب بھی اسے کالج کے برآمدوں یا کوریڈور میں دیکھ پاتی تھی۔ تو ایک شکایت ہونٹوں پر لاتی تھی کہ ابھی تعلیم میں وہ بلند نگاہی نہیں آئی کہ لڑکیاں آزادی سے اپنے مستقبل سے جنگ جاری رکھ سکیں۔

اس دن سارا کالج قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ جب اس نے مذاق سے کہا تھا۔ تم سب کی سب کنواری رہ جاؤ گی۔ سوائے طاہرہ کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور اس پر اس کے خیالوں کی تہیں چڑھ رہی تھیں۔ خیالات اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ اِدھر اُدھر کی یادوں سے دل بہلانے لگی۔ مگر ایک ہجوم تھا جو امنڈا چلا آرہا تھا۔ جیسا کہ اس کا طریق تھا وہ معاملے کو پھر پڑتال دیتی تھی۔ چاہتی تھی ایسا کرنے میں کامیاب ہو مگر ذمہ داری بھینٹ چڑھتی نظر آتی۔ موقع کی نزاکت سے متاثر ہوتی گئی۔ اٹھنا چاہا مگر مضمحل ہو کر رہ گئی۔ اپنے آپ کو خیالوں کے ہجوم سے چھڑا نہ سکی۔ انہوں نے کروٹ لی۔ وہ سوچ دبا تے دبانے دبا نہ سکی۔ انہوں نے اسے سہارا دیا اور بے تکلفانہ اس کے گرد بانہہ پھیلا دیئے۔ "اب ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے۔ مجھے کالج پہنچنا ہے۔ اگر ہم صبح بمبئی سے رخصت نہ ہوئے تو میں وقت پہ کالج نہ پہنچ سکوں گی۔ مجھ پر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔"

"اور اگر تم وقت پر کالج نہ پہنچ سکی تو؟"

"تو پھر کبھی نہ پہنچ سکوں گی۔" نسرین۔ سوسن۔ رابعہ۔ ندیم۔ طاہرہ۔ فرین سبھی یاد آئیں۔ اس کے آنسو نکل آئے اور اس نے اپنے گورے گورے بے جان ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیئے۔

مسعود مفتی

چاند تارا

سڑک کے کنارے عارضی کھمبے کھڑے کیے گئے جو لوہے کے پائپ کے تھے۔ یہ دو مزدوروں نے لگائے تھے۔ جب مزدوری لینے کے لیے انھوں نے رجسٹر میں انگوٹھے لگائے تو اُس صفحے پر پندرہ فرضی انگوٹھے بھی لگے تھے۔

جس بیل گاڑی میں یہ کھمبے لائے گئے تھے اُس کے گاڑیبان نے دس روپے کرایہ مقرر کیا تھا۔ مگر رسید بیس روپے کی بنا کر دی تھی۔ ادائیگی کرنے والے نے اُسے پانچ روپے فالتو دیئے اور پانچ روپے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیے۔

جن دکان سے یہ پائپ لائے گئے۔ اُس کے پچھلے گودام میں لوہے کا اور بھی سامان تھا۔ مثلاً مشینوں کے پرزے جو بڑی محتاط سمگلنگ کے بعد وہاں پہنچے تھے۔

جس سڑک پر یہ کھمبے لگائے گئے تھے۔ جب وہاں سے جلوس گزرا۔ تو تمام کھمبوں پر جھنڈے لہرا رہے تھے جن پر چاند تارے کا اسلامی نشان تھا۔

عبدالرحمٰن صدیقی

عبدالباسط کی زندگی کا ایک دن

صبح معمول سے کچھ پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے اور زبان بالکل تالو سے چپکی معلوم ہو رہی تھی۔ منہ کا ذائقہ بھی عجیب واہیات سا تھا۔

"OH HELL!" عبدالباسط نے پلنگ پر پڑے پڑے انگڑائی لی۔ اس مندی کے عالم میں ایک زبردست جمائی لی۔

"کیا مصیبت ہے بھئی۔" خمار سا اس کا تمام جسم ٹوٹے جا رہا تھا۔ کنپٹیاں اتنی بھاری ہو رہی تھیں جیسے ان پہ کسی نے دس سیر کے پتھر چڑھا دیے ہوں۔ ٹھنڈے پانی کی ایک پوری بوتل وہ اپنے حلق میں انڈیل لینا چاہتا تھا۔ مگر بستر سے اٹھنے کی ہمت بھی کس میں تھی! چنانچہ وہ یونہی پڑا رہا۔ اس امید میں کہ شاید اس کی بیوی یا گھر کا کوئی دوسرا آدمی آ جائے اور بغیر اٹھے ہی اس کا کام بن جائے۔

مگر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اندھیرے سے صاف ظاہر تھا کہ ابھی بہت سویرا ہے اور کسی کے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت سے بہت پانچ بجے ہوں گے۔ وہ جھنجھلا سا گیا۔ آخر اس کی آنکھ اتنے سویرے کھلی ہی کیوں؟ آدھی رات کے بھی کہیں بعد تو وہ بستر پہ لیٹا تھا، پھر بھی اس کی آنکھ کھل گئی۔ دفتر

کے وقت میں عادت پڑ گئی تھی۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ اور اس کا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ اسے کاش میں یونہی پڑے پڑے مرجاؤں۔ اس نے ایک چڑچڑے بچے کی طرح سوچا اور بے چین ہو کر دلائی کو لات مار کر اپنے اُوپر سے پھینک دیا۔

پھر اسے اپنے منہ کا ذائقہ ترش سے تلخ اور کسیلا ہوتا ہوا معلوم ہوا اور سینے میں جلن محسوس ہوئی۔

"کیا مصیبت ہے یار۔" وہ دل ہی دل میں جھلایا۔ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ اب تو کم بخت ذرا سی بھی سہار نہیں رہی۔ بھلا ایسی بھی کونسی زیادتی ہو گئی تھی۔ لاحول ولا۔۔۔"

اور پھر جم کی بھاری، دھنسی دھنسی اور الکحل خوردہ آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

"FOR HE IS A JOLLY GOOD FELLOW - GOOD BYE to SWEET 30S OLD BOY WELCOME THE GREAT 40S...."

"خبطی، بالکل خبطی۔"

یہ اس کا انتالیسواں برتھ ڈے تھا۔ یعنی آج صبح وہ اپنے چالیسویں سال میں قدم رکھ رہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہا تو آئندہ سال وہ پورے چالیس سال کا ہو جائے گا۔ چالیس سال! چالیسواں!! عبدالباسط کی جھنجھلاہٹ میں تشویش شامل ہو گئی اور وہ سخت کبیدہ خاطر ہو گیا۔

"تو اگلے سال میں واقعی چالیس سال کا ہو جاؤں گا۔ پورے چالیس سال کا

اور شیخ سعدی کی زبان میں کہہ سکوں گا کہ چہل سال از عمرِ عزیزم گزشت . . . .

"حیرت ہے کہ میری زندگی کے پورے چالیس سال گزرنے والے ہیں اور میں ابھی تک وہیں کا وہیں پڑا ہوا ہوں۔ وقت واقعی کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اور یونہی گزرتا رہے گا۔ وقت کے ساتھ ہر چیز گزرتی رہتی ہے اور یونہی گزرتی رہی۔ خود وہ بھی وقت کے ساتھ گزر رہا ہے اور ایک دن گزر جائے گا۔ کسی کا گزر جانا کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے۔"

ایک نامعلوم سا خوف کسی پرانی کیاری میں سے سپنولیا کی طرح گھٹن سے نکل کر اس کے سینے میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بیٹھنے سا لگا۔ اور پیاس کا شدید احساس بدل کر ایک قسم کی گھٹن میں تبدیل ہو گیا اور وہ جیسے گن گن کر سانس لینے لگا۔

گھڑنے والا گھر سے کھلونے، کرئی رنگیلے کوئی سلونے جیسے دامن بھائے
اسے پنچھی بانوریا سونا راگ سنا کے بسرا دو دن کا، ایک جائے ایک آئے۔
رے پنچھی بانوریا

لاحول ولا . . . . یہ آخر اسے ہو گیا رہا تھا! آج تو اس نے بچوں کرامات کر دیا تھا۔ بھولے بسرے، عامیانہ فلمی گانے کی اچانک اس طرح یاد سے وہ جھنجلا سا اٹھا۔ سستا، بھونڈا طفلانہ راگ۔ اسے اپنے بازاری پن پر انتہائی غصہ آنے لگا۔ آخر اسے یہ گانا ہی کیوں یاد آ مارہ گیا تھا؟ کیوں نہ اسے شیکسپئر کی کوئی لائن یاد آ گئی۔

. To be or not to be that is the question - .

مگر یہ سب بھی تو خرافات ہے: ایک حواس باختہ، خود پسند، خود بین اخود غرض اور دیوانے شہزادے کی بڑ۔ ہیملٹ سے تو ویسے بھی اسے ازلی بیر تھا۔ اس کے نزدیک ہیملٹ کا غم بالکل بناوٹی اور نمائشی اور صرف سٹیج کے لیئے موزوں تھا۔ اس میں نہ کوئی اصلیت تھی اور نہ خلوص۔ بس کوری لفاظی تھی گہرائی سے بالکل خالی، نری پوچ اور نکمّ!

ہیملٹ کو بُرا بھلا کہہ کے اس کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔ "اسے کاش ہیملٹ کی تخلیق کر کے شیکسپئر اپنے فکری کھوکھلے پن کا یوں بھانڈا نہ پھوڑتا۔"

Shakespear is a hoax and you are only a bigger hoax

وہ خواہ مخواہ اپنے آپ سے اُلجھنے لگا۔ "تم بالکل فراڈ ہو۔ چالیس سالہ فراڈ۔ تم تو بھی نہیں۔ وہ کم از کم پانچ منٹ خود کلامی اور اداکاری تو کر سکتا تھا۔ خود تم تو اس قابل بھی نہیں۔

"پانچ منٹ بات کرتے ہو تو تمہاری کنپٹیاں بھاری ہونے لگتی ہیں۔ پانچ منٹ لکھتے ہو تو جی بولا اُٹھتا ہے۔ اصل مضمون سے ہٹ کر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتے ہو۔ پانچ منٹ خوش رہتے ہو تو اس غم میں گھلنے لگتے ہو کہ مبادا یہ خوشی پھر میسّر نہ ہو۔ ہر کام میں جھجکتے ہوئے قدم کبھی آگے، کبھی پیچھے اُٹھاتے ہو۔ گھبراتے ہو۔ خود بولا جاتے ہو اور دوسروں کو بولا دیتے ہو۔ البتہ بغیر رکے جئے جاتے ہو اور زندگی کے پورے انتالیس سال گزار سکتے ہو!"

انتالیس سال! پورے انتالیس سال اور ایک دن!! کمال ہے! کما

لگاتار انتالیس سال زندہ رہنا، سانس لیتے رہنا، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، پیشاب پاخانہ کرنا، سونا، ازدواجی اختلاط کے تقاضے کو پورا کرنا، چھوٹے بڑے وسوسوں اور واہموں کا شکار رہنا، موت سے ہر وقت ڈرتے رہنا اور پھر بھی جیسے جانا کمال نہیں تو کیا ہے؟

پھر اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا، ایک لمبی جمائی لی اور ہمت کر کے آخر بستر سے اٹھ ہی گیا۔ فریج کھول کر یخ پانی کی ایک بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر پوری کی پوری گٹا گٹ چڑھانے لگا۔ اس کے سینے میں ایک خوش گوار سی ٹھنڈک اُترنے لگی، مگر ساتھ ہی متلاہٹ کا بھی کچھ احساس ہونے لگا ہے۔ وہ سیدھا غسل خانے کی طرف بھاگا۔ میں منہ جھکا کے اس نے خوب قے کی۔ ابکائی کے جھٹکوں نے اس کا سارا جسم جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ایک قسم کی کمزوری اس کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ البتہ اب اس کی طبیعت ضرور کچھ ہلکی ہلکی ہو گئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ اس کی ٹھوڑی میں کالے بالوں کی نوکوں کے ساتھ سفید بالوں کے سرے صاف جھانک رہے تھے، جیسے کسی نے وہاں نمک چھڑک دیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک قسم کی کلونس یا نیلاہٹ سی پھر گئی تھی۔ آنکھیں لال لال اور بے نور سی تھیں۔ اس نے اپنا دہانہ کھول کر زبان دیکھی۔ "توبہ توبہ! کس قدر بدرنگ ہو گئی ہے!" کہیں سے زرد، کہیں سے سفید۔ بدرنگی تہہ در تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ پھر اسے دو تین زوردار چھینکیں آئیں اور اس کے ساتھ ہی بلغم کا ایک ریلا۔ وہ تھوکنے کے لئے پھر غسل خانے گیا۔

"لاحول ولا۔ لاحول ولا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی!" اس نے کلیاں کیں۔ اور شیشے کے روبرو کھڑے ہو کر ایک بار پھر اپنا جائزہ لینا شروع کیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے گرد باریک لائنوں کا جال گہرا ہوتا ہوا معلوم ہوا اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی وحشت اور ویرانی ٹپکتی ہوئی دکھائی دی۔

"نا بابا نا۔ اب یہ میرے بس کا کھیل نہیں۔ آج سے توبہ، پوری توبہ۔ اب کبھی بھول کر بھی اُدھر کا رخ نہیں کروں گا۔"

مگر پھر جم کی دھنسی دھنسی مردانہ آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ دوسرے تیسرے دوستوں میں بیٹھ کر آدمی ذرا سا ہنگامہ بھی نہ کر سکے۔ آخر ایسی زندگی سے فائدہ بھی کیا۔ اس کو اپنے آپ پر رحم سا آنے لگا۔ بے چارہ عبدالباسط! وہ کس قدر بے بس تھا۔ بے بس پیدا ہوا اور بے بس ہی مر جائے گا۔ اس کی طبیعت پھر ڈرامانگاری پہ مائل ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے میں جلدی ہی مر جاؤں گا۔" اس نے سوچا، "یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ کم بخت ایک دفعہ ہی پاپ کٹ جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ بس ٹائیں ٹائیں فش۔" اس خیال سے پہلے تو کچھ اس کی ہمت بڑھی مگر جیسے ہی اسے اپنے نام کے آگے "مرحوم" لکھا ہوا نظر آیا اس کا دل بیٹھنے سا لگا۔ (عبدالباسط مرحوم، مرحوم مغفور، اللہ بخشے مرنے والا بے چارہ بہت اچھا آدمی تھا) پس ماندگان کے اور عذابِ قبر کے روایتی تصور سے اس کی بندھتی ہوئی ہمت پھر ٹوٹنے لگی۔ پھر

اس نے ایک باشعور انسان کی حیثیت سے اپنے آپ سے پوچھا: "کیا واقعی عذابِ قبر کی کوئی حقیقت ہے؟ نعوذ باللہ مجھے تو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔ پھر عذابِ قبر سے کیا ڈرنا!"

اس کی پریشان خیالی نے اس کے سامنے ایک انسانی پنجر کی تصویر لا کھڑی کی۔ یہ وہی پنجر تھا جو سکول کے زمانے میں اس نے فرسٹ ایڈ کی کتاب میں دیکھا تھا اور جس کو دیکھ کے وہ اس قدر ڈرا تھا کہ دونوں اسے برے برے خواب آتے رہے۔ اور فرسٹ ایڈ کی کتاب کو چھونے سے بھی خوف آتا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ کتاب کھولی اور ڈھانچہ دھم سے اس کے اوراق سے باہر کود کر اس کا ٹینٹوا دبانے لگے گا۔ فرسٹ ایڈ سے پہلے ہی رابطے کے بعد اس نے اپنے ڈاکٹر بننے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا کہ ڈاکٹر بننے کے لئے تو مردے کی تصویر ہی کیا بلکہ اصلی مردے سے بھی سابقہ ضرور ہی پڑتا ہے۔ اس کی ہڈیاں تک ساتھ لے کر سونا پڑتا ہے۔ بھلا یہ سب اس کے بس کا کہاں تھا۔ اس طرح ڈاکٹر بننے کی دیرینہ خواہش اس نے ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں دفن کر دی۔

پھر اس نے سوچا کہ جس پنجر سے میں اتنا ڈرتا ہوں یہ تو خود مجھ میں موجود ہے۔ یہ تو میرا ہر وقت کا۔ سوتے جاگتے کا ساتھی ہے۔ جب میں اٹھتا ہوں تو یہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ بات کرتا ہوں تو دانت کھٹاکھٹ کرتا ہے۔ بھلا اس سے کیا ڈرنا۔ کہیں اپنے آپ سے بھی کوئی ڈرتا ہے؟ اور پھر وہ خود بخود اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی میں سٹھیا گیا ہوں۔ چالیسویں سال کے پہلے دن بھی میرے خیالات قریباً اتنے ہی طفلانہ ہیں جتنے کہ سکول کے زمانے میں تھے

تو پھر زندگی کے اتنے بڑے تجربے سے میں نے حاصل ہی کیا کیا؟ خاک، دھول، بکائن کے پھول؟ پتا نہیں عمر کے ساتھ آدمی آگے کی طرف بڑھتا ہے یا پیچھے کی طرف بھاگتا ہے۔"

ایک بار پھر شیشے میں جھانکا کہ اس نے اپنے چہرے کو دیکھا اور اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کا چہرہ اصل چہرہ نہیں بلکہ خالی ایک نقاب ہے اور اس نقاب کے گرتے ہی وہ فنا ہو جائے گا۔ اس کا چہرہ مہرہ، ہاتھ پاؤں۔ سارا وجود ایک پرانے کرم خوردہ عصا کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا، مگر سامنے رکھا ہوا ڈریسنگ ٹیبل پھر بھی اپنی جگہ جوں کا توں کھڑا رہے گا۔ اس کے اُوپر رکھے ہوئے پاؤڈر کے ڈبے، تیل اور عطر کے کنستر مختلف دوائیوں کی بوتلیں اپنے اپنے رنگ بو باس اور علیحدہ علیحدہ خاصیتوں کے ساتھ اسی طرح قائم رہیں گے۔ صرف وہ نہ ہوگا۔

"آخر میں ہوں کون؟ آخر میں ہوا ہی کیوں؟ جو مجھے نہ ہونے کا خوف اور خطرہ یوں لاحق ہوتا۔ میرے نہ ہوتے ہوئے بھی دنیا کا کاروبار چل رہا تھا، اس میں کونسی کمی تھی۔ میں نہ ہوتا تو بھی دنیا کا کاروبار اسی طرح چلتا رہتا۔ اور اب جب میں ہوں تو بھی دنیا اپنے ڈھرے پر ہی چلی جا رہی ہے اور ابد تک اسی طرح چلتی رہے گی۔ سوال یہ ہے کہ مجھے اس جنجال میں آخر کیوں پھنسایا گیا ہے؟ اگر روح کوئی چیز ہے تو میری پیدائش سے پہلے بھی ہوگی۔ مگر اس وقت تو مجھے اس کی موجودگی کا ذرا بھی احساس نہ تھا، میرے دل میں کوئی وسوسہ نہ، دماغ میں فکر کی کوئی لکیر نہ تھی۔ پھر خبر نہیں کیوں جسم کا اور روح کا ساتھ

کر دیا گیا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا، جیسے بجلی کے مثبت اور منفی تار آپس میں ایک دم سے لڑ جائیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ ہو انہی اندھیرا جس کا نام دنیا ہے اور جس میں جگ جگ اور جیون بھر سارے انسان بھٹکتے اور ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں ہستی سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہستی احساس ہے، شعور ہے، ادراک ہے، اور یہ سب اکٹھے ہو کر انسان اور اس کی کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور کبیدگی کا تانا بانا بنتے ہیں اور تار عنکبوت کی طرح اس کے چاروں طرف پھیلے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہستی ہی کی وجہ سے تو یہ سارا ادبار ہے۔ اس کے باوجود ہر آدمی کو اپنی زندگی میں خوشی کی تلاش رہتی ہے۔ ہستی اور خوشی، اجتماع ضدین ہے، آگ اور پانی، بھلا ان کا ساتھ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ خوشی کا راستہ تو صرف نیستی میں ہے۔

"آخر میں کون ہوں، کیوں ہوں؟"

شیشے میں اس کا گدلا گدلا عکس تھا اور اس پر سے نقاب شاید اب گرا ہی چاہتا تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے اب ہی ڈھیر ہونے والا ہے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس وقت پوری ہستی، پوری کائنات، بلکہ اس کے تصور تک کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا، ہستی کو مٹا دیتا۔

"میں جو ہست ہوتے ہوئے بھی تیزی سے نیستی کے راستے پر چلا جا رہا ہوں؟ میں جو حال میں رہتے ہوئے بھی ماضی کا ایک حصہ ہوں اور اس کی طرف کھلتا جا رہا جو پورے انتیس سال زندہ رہنے کے بعد بھی ابھی تک مستقبل کا انتظار

کر رہا ہوں بغیر اس کی طرف ایک قدم بھی آگے بڑھائے، میرا سارا مستقبل مکھی کی طرح ماضی کے جال میں پھنس کر میرے سامنے تڑپ رہا ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ماضی جو تارِ عنکبوت کی طرح باریک اور پیچ در پیچ ہے اور جس میں بالکل ایک حقیر مکھی طرح پھنسا ہوا ہوں۔ مستقبل کے لئے میرا ہر منصوبہ بالآخر ماضی کا ایک حصہ بن کر مجھے اپنے پرانے مقام پہ اسی طرح کھڑے کا کھڑا حیران اور پریشان چھوڑ کر پتا نہیں کس خلا میں گم ہو جاتا ہے۔

"میری تمام ذات میرا تمام کام میرے تمام خواب میرے تمام منصوبے، میرا نا دل، یکے بعد دیگرے سب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں یا بنتے جا رہے ہیں۔ میں خود ماضی کی طرح ہوں: رواں دواں، اور عنقریب اس کا حصہ بن جاؤں گا۔

"ماضی، ماضی، ماضی جو ایک واحلا بدی حقیقت ہے، ماضی جو خدا ہے۔۔"

پھر اس نے زور سے لاحول پڑھ کر اپنی پراگندہ خیالی کو ختم کرنا چاہا۔

آگسٹ کومٹ نے کہا ہے، "ہم سب اپنے اپنے ماضی میں مدفون ہیں اور مردہ لوگوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

پھر وہی رٹ لگ گئی۔ آگسٹ کومٹ کے خیال سے اُسے یک گونہ تسلی ہوئی۔ آخر اس نے یونہی گھاس نہیں کھودی تھی، پڑھ لکھ کر ڈبو نہیں دیا تھا۔ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کے کسی چھپے ہوئے روزن سے اُمید اور خود اعتمادی کی ایک طلسمی شعاع نکلی اور لمحہ بھر کے لئے اس کی ساری ذات کو منور کر گئی۔ اب اس کا دماغ کچھ صاف ہو چلا تھا، مطلع اتنا تاریک نہ رہا تھا۔ کوئی چاہے کچھ بھی کیوں نہ کہے مگر فلسفہ بگھارنا اکثر دل کی تقویت کا باعث

ہوتا ہے۔ اپنے دل کے نہاں خانے میں پھوٹتی ہوئی امید کی ننھی کرن سے وہ محفوظ ہو ہی رہا تھا کہ اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔

"کہے رات اتنی دیر تک کہاں غائب رہے؟"

'کس قدر ظالم عورت ہے!' اس نے سوچا، 'سب کچھ معلوم ہے مگر کیسی بھولی بن رہی ہے!' وہ چپ رہا مگر سوال کی تکرار پر جھلا کر بولا۔ "غائب کدھر تھا۔ جہنم میں تھا۔ میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں جو رات گئے تک باہر رہنے سے ٹلڑوں یا ڈرایا جاؤں۔"

"بھلا اس میں جھلانے کی کونسی بات ہے۔" بیوی نے خود جھلا کر کہا اور بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

امید کی کرن ذرا کی ذرا بادلوں سے نکل کر پھر کہیں ڈوب گئی۔ عبدالباسط جلدی جلدی اپنا شیو ختم کرنے لگا۔ گھڑی میں ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ دفتر کا وقت قریب آرہا تھا۔ اتنے میں شفیع (گھر کا ملازم) چائے کی پیالی لے کر اندر آگیا اور شفیع کے پیچھے پیچھے اس کا بڑا لڑکا۔ وہ حسب معمول صبح کے سلام کے لئے آیا تھا۔

"ابو۔۔۔ سلام۔"

"وعلیکم السلام۔ بیٹے، کہو کیا حال ہے؟ چھٹیاں کیسی گزر رہی ہیں؟ کچھ پڑھتے وڑھتے بھی ہو یا یونہی کھیل کود میں وقت گزارتے ہو؟"

"نہیں ابو، امی سے خوب پڑھتا ہوں۔" پھر اس نے فر فر دس کا پہاڑہ پڑھنا شروع کر دیا۔ "تین دن نزا تیس، تین ڈزا ٹونٹی، تین تھری زا۔۔۔" اور پھر ایک

دم ریل گاڑی چل پڑی۔

"نہیں بیٹے یہ نہیں چلے گا۔۔۔" عبدالباسط نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو سیلون کا ٹیبل چاہیے۔ ہاں ذرا بتاؤ تو سیلون، سیلون نرا۔۔۔ سیلون، سیلون نرا ہاں شاباش۔۔"

"سیلون، سیلون نرا۔۔۔ سیلون، سیلون نرا۔۔۔"

بچے نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے بہت سوچا مگر جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ کھسیانا ہو کر وہ ایک دم باپ کے گھٹنوں سے لپٹ پڑا!

"نہیں آتا ہم کو، اوں اوں۔۔۔"

عبدالباسط ہنس پڑا "کوئی بات نہیں بیٹے، پھر سہی۔"

باپ کی محبت کا ایک ریلا سا آیا اور اس کو جیسے بہا کر لے گیا۔ ایک فوری جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے لڑکے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے گالوں پر چٹا چٹ پیار کرنے لگا۔

"اے کاش میں بھی دنیا کو اس بچے کی نظروں سے دیکھ سکتا۔ اس کی نظر میں ہر شے کتنی حسین، وسیع اور پائیدار ہے۔ کیا ضروری تھا کہ دنیا میں آ کر ہم بڑے بھی ہوتے۔ زندگی یونہی بچہ رہ کر بھی گزاری جا سکتی تھی۔" اس نے سامنے رکھی ہوئے چائے کی پیالی کو دیکھا اور پوری کی پوری ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ پھر اس نے غسل کیا اور کپڑے بدل کر باہر نکلنے لگا۔ جاتے جاتے اس کی بیوی نے ٹوکا۔

"کیوں خیر تو ہے۔ کیا آج بغیر ناشتہ کئے جانے کا ارادہ ہے؟"

"ارادہ تو بالکل یہی ہے، بشرطیکہ آپ کی اجازت ہو" عبدالباسط نے چڑچڑے پن سے کہا۔

"بھلا میں کیا اور مجھ بے چارے کی اجازت کیا؟ مجھے اپنی اوقات خوب معلوم ہے۔ مگر آج یہ تمہیں سویرے سویرے ہوا کیا ہے؟"

"ہوتا کیا؟ بس نہیں چاہ رہا دل ناشتے کو۔ بھلا اس میں بھی کوئی زبردستی ہے"؟ مزید جواب کا انتظار کئے بغیر وہ جلدی جلدی کمرے سے نکل گیا، گیراج سے موٹر نکالی اور دفتر روانہ ہو گیا۔

اس کے منہ کا مزہ ابھی تک خراب تھا۔ پیٹ میں تیزابیت باقی تھی۔ مگر وہ اپنے خاص نپے تلے انداز میں موٹر چلا رہا تھا۔ اس کے آس پاس، آگے پیچھے کتنی ہی اور چھوٹی بڑی گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ ان میں بھی خود اس کی طرح کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا ان سب کے منہ کا مزہ بھی خراب تھا؟ کیا ان سب کے پیٹ میں بھی تیزابیت کی چھوٹی چھوٹی سوئیاں چبھ رہی تھیں؟ کیا وہ سب اس ہی کی طرح چڑچڑے ہو رہے تھے؟ برابر سے ایک بڑی کار والا سن سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ پیچھے سے جا کر ایک زور کی ٹکر مار دے۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ حادثے کے خیال سے وہ اور بھی سنبھال کر گاڑی چلانے لگا۔ بھلا ابھی وہ کیسے اپنی جان کے لئے کوئی خطرہ مول لے سکتا تھا۔ ابھی تو اسے کئی بڑے بڑے کام کرنا باقی تھے۔ مکان بنوانا تھا، ساری دنیا کی سیر کرنا تھا۔

تنقیدی مضامین کا مجموعہ چھپانا تھا اور ان سب سے بڑھ کر اپنا انگریزی کا ناول مکمل کرنا تھا۔ ان سب کاموں کی تکمیل کے لئے زندگی کی ضرورت تھی، وقت کی ضرورت تھی مستقبل کی ضروری تھی۔ بھلا وہ کیسے اندھا دھند اپنی گاڑی دوسری گاڑی سے لڑا سکتا تھا۔ گاڑی چلاتے چلاتے وہ یونہی اپنے نامکمل ناول کے لئے انگلستان کے مشہور ناشروں کا نام سوچنے لگا: ہیمش ہملٹن، ہوگارتھ، سیکر اینڈ وار برگ۔ اور پھر چھپے ہوئے ناول کا خوبصورت گرد پوش اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگا اور ساتھ شہرت کا ایک انتہائی خوش آئند تصور:

"دنیا خود ہی دیکھ لے گی کہ آخر میں کون ہوں اور کیا ہوں۔" اپنی آئندہ کامیابی کے خیال سے اس کو بہت تقویت پہنچی۔ کامیابی بہترین انتقام ہے۔ ناکامی محض حسرتِ انتقام ہے۔

دفتر پہنچنے پر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی طبیعت ابھی تک سست تھی۔ شاہجہاں (چپڑاسی) کو بلا کر اس نے چائے کا آرڈر دیا اور پھر مختلف خانوں میں پڑے ہوئے فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا (ان ٹرے)، میں وہ فائل کو رہی نظر آیا جس پر لگا کر اس نے اپنا ڈرافٹ (باس) کو بھیجا تھا۔ ڈرافٹ سوالیہ نشانوں، تحت السطور خطوط اور تصحیحات سے پٹا پڑا تھا اور آخر میں (باس) نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا:

باس کا ریمارک۔ دیکھ کردہ

وہ لمبا سا اُٹھا ہو۔ دل ہی دل میں اس کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔" نہ جانے یہ سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ بس جہاں چاہا لکیر کھینچ دی۔ جہاں مرضی آئی نشان لگا دیا، جو جی میں آیا کاٹ دیا۔ میں بھی آج ان حضرت سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ کہ بس جتنا لکھنا آتا تھا لکھ دیا، دوسرے ملاحظے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کم بخت ایک معمولی ڈرافٹ نہ ہوا ادبی شاہکار ہو گیا جو اسے آدھی بار بار لکھے جائے!"

تھوڑی دیر میں شاہجہان کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور چائے بنانے لگا۔ شاہجہان کی وردی آج بہت صاف ستھری تھی۔ وہ باسط کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ چائے کا پیالہ بنا کر شاہجہان نے باسط کے سامنے رکھا اور معمول کے مطابق کہا: "میٹھا دیکھ لیجئے سرکار۔"

"بس ٹھیک ہی ہوگا، مہربانی۔" باسط نے بہت سرپرستی کے انداز میں کہا۔ اس کا دل اس وقت ایک خاص تشکر آمیز جذبے سے معمور ہو رہا تھا۔ "چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو" اس نے سوچا، "مگر سرکاری ملازمت کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں پر معیار ماتحت ہوتے ہوئے بھی، خود اپنی جگہ پر حاکم ہے۔"

موتیا کی بھینی بھینی خوشبو سے اس کا دماغ ایک دم سے معطر ہو گیا۔ "اخاہ! آج تو میز پہ تازہ پھول بھی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ نیا مالی بہت اچھا ہے۔ وہ عنقریب ہی اسے ضرور کچھ نہ کچھ بخشیش دے گا۔ ویسے اب عید میں بھی تو بس تھوڑے ہی دن رہ گئے تھے۔ اچھا ہے وہ ایک دفعہ ہی سب کو اکٹھا انعام دے دے گا۔"

اس نے سگریٹ سلگا کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کمرہ گو معمولی تھا اور اس میں بجائے قالین کے رنگین دھاری والا ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ مگر تھا صاف

ستھرا۔ میز پر قلم دوات، ایش ٹرے، ٹیلی فون ڈائرکٹری، ڈائری، کیلنڈر، پن کشن سب مناسب طریقے سے سجے ہوئے تھے۔ اور وہ کمرے میں تنہا بیٹھا سگریٹ کے مرغولے بنا بنا کر چھوڑ رہا تھا۔ کام بھی کوئی زیادہ نہ تھا اکثر تو صرف دو تین ڈرافٹ تیار کرنے ہی میں پورا وقت نکل جاتا۔ آپس میں بات چیت، چائے کافی پینے کے لئے ہمیشہ کافی وقت رہتا تھا۔ ہر طرح کی آزادی تھی۔ عافیت کا ایک عظیم احساس اس کے دل میں پیدا ہونے لگا۔ یہ کمرہ اس کا دفتر نہیں بلکہ قلعہ تھا اس کا حصار تھا۔ یہاں پر صرف اس کی حکومت تھی۔ ماتحت عملہ گھنٹی بجاتے ہی الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو جاتا اور اس کا ہر حکم بجا لاتا۔

"

پھر اسے اپنے رد کردہ ڈرافٹ اور باس کی فرمائش کا خیال آیا مگر اس بار اس کے دل میں غصہ نہ تھا۔

"آخر اس میں حرج بھی کیا ہے۔" اس نے دل میں کہا، "باس آخر باس ہے۔ میں بھی تو اپنے ماتحتوں کے ساتھ اکثر ایسا ہی سلوک کرتا ہوں۔ اگر میں ایک تازہ ڈرافٹ تیار کر لوں تو میرا بگڑ ہی کیا جائے گا؟ اور کچھ نہیں تو چلو ان کی انا ہی کی تسکین ہو جائے گی۔ کیا ضروری ہے کہ ایک بار جو چیز میرے قلم سے نکل جائے وہ پتھر کی لکیر ہی ہو جائے۔ ہر آدمی کا اپنا اپنا انداز اور طریقہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ میرا انداز اور طریقہ سرے سے باس کی طبیعت کے مطابق ہی نہ ہو۔ آخر وہ مجھ سے نہ صرف عمر میں بلکہ عہدے اور تجربے میں کہیں بڑھے ہیں۔ سرکاری ڈرافٹ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اس کا میری اپنی ذات سے کیا تعلق ہے جو اس کے رد کے

جاننے کا ذاتی طور پر مجھے افسوس ہو؟ وہ کوئی میرے ناول کا حصہ تھوڑا ہی ہے
کہ جس کے بدلے یا رد کئے جانے پر مجھے صدمہ ہو۔"

اس کے دماغ نے اب صحیح خطوط پہ کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کی کوفت
میں کافی کمی ہو گئی تھی۔ دفتری کام اور ادب دو بالکل مختلف اور علیحدہ شعبے ہیں۔
اور ان کے ڈانڈے آپس میں کبھی نہیں مل سکتے۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگائی
اور تازہ ڈرافٹ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے شاید پہلا ہی لفظ لکھا ہو گا۔
کہ وہم سے جم اس کے کمرے میں آگھسا۔

"ہیلو مائی ڈیر بیسٹ!" گزشتہ
رات کی زیادتی اور کم خوابی کا اس کے چہرے پہ ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ روز کی طرح
ہشاش بشاش اور تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ باسط کو اس پر بری طرح رشک آنے لگا۔

"موسال کچھ ڈاؤن ہی ہے یار۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب صحت ہی نہیں۔"
"نان سنس۔ یہ آخر تمہیں ہوتا کیا جا رہا ہے، مائی ڈیر لیڈ ئے! اگر تمہاری یہی کیفیت
رہی تو یقین ہے کہ جلدی مالیخولیا کا شکار ہو جاؤ گے۔

ہر وقت خوش کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست حافظ شیرازی

"اوہ، ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ تو پھر
تمہارے چالیسویں کا آج کا پہلا دن ہے۔ تعجب ہے کہ چالیسویں کے بعد بھی مردہ
زندہ ہے۔ خیر بہت بہت مبارک ہو۔ اب تو واقعی تم بزرگ ہوتے جا رہے ہو۔"

باسط کھسیا کر مسکرا دیا۔ "سچ بات تو ہے یار کہ اب ہم کسی اچھی چیز کے قابل ہی نہیں رہے۔ شراب ہضم نہیں ہوتی، عورت پٹھے پہ ہاتھ رکھنے نہیں دیتی، ناول ہے کہ سالا ختم ہونے میں نہیں آتا۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یقین مانو، صبح سے طبیعت واقعی بہت ڈاؤن ہے۔ کچھ کھایا بھی نہیں۔ صرف چائے کی دو پیالیاں پی ہیں، وہ بھی منہ میں زہر معلوم ہو رہی ہے۔ سگریٹ تک نہیں پی جاتی۔"

"!! میرے خیال میں تو جلد ہی ہم سب کو تمہاری فاتحہ کا بندوبست کرنا ہوگا۔ آخر تم خود ہی کیوں نہیں مرجاتے۔ بھلا ایسی زندگی سے فائدہ ہی کیا ہے۔"

"بات تو تم واقعی ٹھیک کر رہے ہو۔ میں خود اپنے آپ سے تنگ آتا جا رہا ہوں اور اکثر سوچا کرتا ہوں۔۔۔"

"پھر لگے شہید بننے۔" جم نے بے صبری سے کہا، "یہی تو تم میں سب سے بڑا عیب ہے، میری جان! آخر کیوں تم ہر وقت اپنے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دنیا تم سے اور تمہارے پورے تصور سے بے حساب بڑی ہے اور تم اس پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتے۔ اچھا پیارے اب چلے، کچھ تنخواہ بھی حلال کر لیں۔ پھر آؤں گا۔ چائے کے وقت۔"

جم جس طرح دندناتا آیا تھا اسی طرح دندناتا چلا گیا۔ باسط کا خون کھولنے سا لگا۔ "گدھا کہیں کا۔ پتا نہیں میں اسے برداشت ہی کیوں کرتا ہوں۔ اس کے باوجود کہ

ہم میں شاید ہی کوئی قدر مشترک ہو۔

وہ عجیب آدمی ہے۔ آدمی کیا اچھا خاصہ جانور ہے۔ بس ہر وقت کھانے پینے اور سیر تماشے کی بات چیت۔ آخر مجھ سے کتنا چھوٹا ہوگا؟ بہت ہوا ایک سال، مگر حضرت ابھی لونڈے ہی بنے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی تو سنجیدگی نہیں۔ چاہیئے تو یہی کہ میں اس سے کوئی کلام واسطہ نہ رکھوں، مگر یہ بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ دس پندرہ برس کا ساتھ یکا یک یوں، بیٹھے بیٹھے، ختم کر لوں؟ آخر میں نے اسے کیا ہے، اب یوں اچانک کیسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ بات بھی تو کتنی عجیب اور مضحکہ خیز ہوگی کہ جس آدمی کے ساتھ پورے پندرہ برس صبح شام اُٹھا بیٹھا، گھلا ملا اسے ایک دم سے چھوڑ دوں۔

"اس میں شک نہیں کہ اکثر اس کی حرکتیں انتہائی صبر آزما ہو جاتی ہیں، مگر آخر کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟ اچھی صحت اور نامعقولیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور جم بلا شبہ ایک تندرست انسان ہے۔ زندگی اس میں سے گویا پھوٹی پڑتی ہے۔ وہ جو کھاتا پیتا ہے اس کو اچھی طرح ہضم کر لیتا ہے۔ شاید اسی لئے وہ اتنا خوش قسمت ہے۔ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان کرنے میں آخر تک بھی کونسی ہے۔ کسی کو باولے کتے نے کاٹا ہے جو آپ نت نئے ناولوں اور افسانوں کے پلاٹ سوچتا ہے۔ کیوں نہ آدمی خاموشی اور عافیت سے اپنی زندگی گزارے۔"

آپ ہی آپ باسط اپنی بھڑاس نکالتا رہا۔ پھر جب اس کا جی کچھ ہلکا ہوا تو کیونکہ پھر اسے جم پر پیار آنے لگا۔ اس کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا

اور اس بار وہ اس کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ درمیانہ قد، کھلتا ہوا رنگ، لہراتے ہوئے بال، کشادہ پیشانی اور خوب گٹھا جسم۔

"اچھا آدمی ہے، بہت اچھا آدمی!" اس وقت اس کو احساس ہوا کہ جیسے اس نے جم سے، اپنے آپ سے اور ساری دنیا سے صلح کر لی ہو۔ ڈرافٹ کا ایک نیا مضمون آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں اُترنے لگا اور اس کو یقین ہو گیا کہ اس بار اس کا ڈرافٹ ضرور ہو جائے گا۔

ابھی اس نے تھوڑی دیر کام کیا ہو گا کہ اس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی دبا کر شاہجہاں کو بلایا اور اس سے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔

"کم بخت کیا مصیبت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب واقعی میرا وقت قریب آ گیا ہے، ورنہ پھر ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے۔" پانی پی کے ذرا کی ذرا اس کا دل ٹھہرا مگر اس کی کنپٹیاں بہت بھاری بھاری ہو رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی ڈرافٹ ختم کیا اور ٹائپسٹ کے حوالے کر دیا اور پھر فکر میں ڈوب گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ابھی مر گیا تو کیا ہو گا، اس کے چھوٹے سے خاندان کا کیا بنے گا۔ مانا اس کا انشورنس معقول تھا، پراویڈنٹ فنڈ بھی تھا، سرکار کی مدد اور اعانت بھی اس کے پس ماندگان کے لئے موجود تھی، مگر نہ معلوم کیا ہوا؟ اچانک اس کو اپنی بیوی، جس سے وہ روز ذرا ذرا سی بات پر تکرار کرتا تھا، دنیا کی بہترین عورت معلوم ہونے لگی اور اس پر بے اختیار رحم آنے لگا۔ جو کہیں بے چاری بیوہ ہو ہی گئی تو کس قدر ظلم ہو گا! بچوں کا کیا بنے گا؟ خاندان کی کس مپرسی اور

زبوں حالی کی ایک انتہائی تاریک تصویر اس کی نظروں کے سامنے پھر گئی۔
شاہجہان نے اندر آکر کہا: "ڈائرکٹر صاحب سلام بولتے ہیں، سرکار۔"
"ٹھیک ہے، ابھی آتا ہوں۔" اسے یوں لگا جیسے اس میں کرسی سے اٹھنے کی طاقت نہیں۔ چند سیکنڈ اسی طرح بیٹھا رہا، پھر ہمت کر کے اٹھا تو اس کا سارا جسم بھاری بھاری سا ہو رہا تھا اور زبان کا مزہ ابھی تک وہا سا تھا۔
اس نے سوچا کہ وہ دو تین ماہ کی طویل رخصت لے کر مکمل آرام کے لئے کہیں دور چلا جائے۔ پھر اسے ڈائرکٹر کا خیال آیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کی سلوٹیں ٹھیک کیں اور ڈائرکٹر کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے انتہائی ادب سے پوچھا: " "
" " حق صاحب نے فائلوں پر سے سر اٹھاتے ہوئے کہا، "آؤ بھئی، ضرور آؤ، بیٹھو۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان کا موڈ آج اچھا معلوم ہو رہا تھا۔
" " انہوں نے انگریزی میں کہا۔
" " باسط نے جواب دیا۔
"ہاں، اب شاید آپ کو بھی احساس ہو چلا ہو گا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ دراصل اس اسٹیج پر ہم اپنے آپ کو کسی طرح بھی تو نہیں کر سکتے اس لئے ذرا رہنے کی انتہائی ضرورت ہے۔"
انہوں نے باسط کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ دراصل مجھے اس کا احساس کچھ دیر سے ہوا۔"
حق صاحب باسط کے فوری اتفاق رائے سے بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔
"میرے خیال میں تمہارا اپنا ڈرافٹ مناسب ہے۔ بس ایک آدھ جگہ میں نے کچھ اور ردوبدل کر دیا ہے، باقی ٹھیک ہے۔ اب اسے جلدی جلدی ٹائپ کروا کے بھجوا دو۔"
"کچھ اور ردوبدل کر دیا ہے؟" باسط کو جیسے ایک دھکا سا لگا۔ عجیب آدمی ہے۔ غصے کی لہر ایک بار پھر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے سوچا کہ اس آدمی کے ساتھ کام کرنا تو واقعی ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ زہر کے گھونٹوں کی طرح وہ اپنا غصہ پیتا رہا۔
حق صاحب نے سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ نکالی اور پھر ڈبہ بند کرنے ہی کو تھے کہ سوچ کر اسے باسط کے آگے کر دیا۔ باسط نے "نہیں شکریہ" کہا اور ساتھ ہی دایاں ہاتھ اٹھا کر آداب عرض کہا۔ حق صاحب نے خود ایک سگریٹ سلگایا، وہ ایک لمبا سا کش لے کر بولے: "کم بخت کام ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ دس فائل نکالو تو بیس اور آجاتے ہیں صاحب تو واللہ میں بھی گھبرا گیا۔ سوچتا ہوں کہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لئے درخواست دے دوں۔ کام نہ ہوا جی کا جنجال ہو گیا۔"
ایک مکان کا بلو پرنٹ پڑا ہوا تھا۔ باسط نے ذرا غور سے دیکھا تو خود حق صاحب کے زیر تعمیر مکان کا نقشہ تھا۔
سرکاری فائل؟ کام کی زیادتی؟ جی کا جنجال؟

باسط نے دل ہی دل میں کہا، " کس کا فائل، کس کا کام ہے یہ حضرات بھی کتنے بڑے فراڈ ہیں۔ دفتر میں بیٹھ کر تمام وقت اپنا کام کرتے ہیں کبھی سے بات ہو رہی ہے کبھی ٹھیکہ داروں سے بھاؤ تاؤ ہو رہے ہیں اور سرکار بیچاری کو کام کی زیادتی کا الزام دیتے رہتے ہیں۔ مگر اس نے ایک خاص ماتحتانہ انداز میں کہا، " جی ہاں یہ تو بالکل درست ہے۔ کام تو واقعی بڑھ گیا ہے اور اسٹاف اتنا ہی ہے۔ میرے خیال میں تو آپ کو کچھ اور اسٹاف کا مطالبہ کرنا چاہیے۔"

" نہیں باسط صاحب"، حق صاحب بولے، " مسئلہ دراصل اسٹاف کا نہیں، محنت اور لیاقت کا ہے۔

مگر ادھر حالت یہ ہے کہ کم بخت ایک ایک ڈرافٹ پہ پورا پورا دن لگا دیتے ہیں۔ بیچاری انگریزی کا اس ملک میں جو حشر ہو رہا ہے دیکھا نہیں جاتا......"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، حق صاحب نے ریسیور اٹھایا،

" ہیلو، جی میں حق بول رہا ہوں۔ اخاہ، آپ ہیں۔ کہیئے کیسے مزاج ہیں حضور کے۔"

دوسری طرف شاید حق صاحب کے بنک کا مینجر تھا۔ کچھ اوور ڈرافٹ کی بات ہو رہی تھی۔ حق صاحب نے سود کی شرح میں کمی کی درخواست کی تھی۔ بنک والوں کے لئے غالباً یہ ممکن نہ تھا۔ کچھ اس قسم کے سوال جواب ہو رہے تھے۔ مگر بنک کے مینجر پر اس کا کوئی خاص اثر ہوتا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کم از کم ان کے چہرے سے یہی ظاہر تھا۔

" " انھوں نے ریسیور پٹختے ہوئے کہا۔

" جدھر جاؤ ادھر بے ایمانی

اور سفارش حق۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ابھی کل انہوں نے ایک صاحب کو صرف چار فیصد پر قرض دیا ہے اور مجھ سے آٹھ فیصد مانگتے ہیں۔ خدا کا غضب ہے۔"

پھر انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور دوسری سگریٹ سلگائی۔ موضوع بدلتے ہوئے انہوں نے باسط سے پوچھا، "کہیے باسط صاحب آپ نے میرا وہ موسم گرما کی سہولتوں (ٹھنڈے پانی کے لئے صراحیاں، خس کی ٹٹی وغیرہ) والا نوٹ نہیں دیکھا؟ آپ کو معلوم ہے ڈائرکٹر جنرل نے اس کی تعریف کی ہے۔"

"جی ہاں،" باسط صاحب نے جواب دیا، "نوٹ واقعی دلچسپ تھا بالخصوص آپ کا وہ فقرہ: THOU ART THE POT THE POTTER AND THE POTS clay (خود کوزہ، خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ) کیا برمحل استعمال کیا ہے آپ نے اس مصرع کا۔" باسط کے لہجے میں گھلاوٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔ باس پھر باس ہے، حق صاحب باسط کی نکتہ سنجی سے کافی محظوظ معلوم ہوتے تھے۔

"شکریہ، شکریہ۔ کیا کیا جائے، باسط صاحب، ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس دفتر میں سرے سے ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ کہاں میں ایک ادبی مذاق والا مرنجان مرنج قسم کا آدمی اور کہاں یہ دفتری جھک جھک اور الجھنیں ادھر آ کر سچ مچ اب معلوم ہوتا ہے جیسے میری تمام ذہنی صلاحیتوں کو گھن لگ گیا ہو۔ آپ کو تو خیر کیا معلوم ہوگا مگر یہ حقیقت ہے کہ کالج کے زمانے میں مجھے اپنے وقت کا بہترین مزاح نگار شمار کیا جاتا تھا۔ اکثر پروفیسر صاحبان کا خیال تھا کہ آگے چل کر ہو سکتا ہے میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کو بھی پیچھے بٹھا دوں۔ مگر بھائی یہ سب مقدر کے کھیل ہیں

"والی بات ہے۔" پھر حق صاحب خاموش ہو گئے۔

وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے تھے۔ باسط نے موقع غنیمت جانا اور ان سے اجازت چاہی۔

"ہاں، ہاں ضرور۔" حق صاحب چونکتے ہوئے بولے، "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ابھی تک کم بخت کتنا کام پڑا ہوا ہے۔ یہ فائل تو میری جان ہی لے کر چھوڑیں گے۔ آل رائٹ باسط صاحب، شکریہ۔ کبھی ایسے ہی ادھر چلے آیا کیجیے۔ آپ سے بات کر کے ذرا طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔"

باسط نے چلتے چلتے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

"ناممکن، بالکل ناممکن۔" اس نے کرسی پر تقریباً ڈھیر ہوتے ہوئے کہا، "خدا جانے یہ دفتر کی مصیبت کب تک چلے گی۔" ان ٹرے میں کچھ اور فائلیں آ گئے تھے۔ مگر آج اس کا جی بالکل اُچاٹ تھا اور ہر کام ٹالنے کو چاہتا تھا۔ اس نے چند ہی منٹ میں فائلوں کو فارغ کر دیا۔ کسی میں صرف

، کسی میں PL-SPEAK کسی میں

، کسی میں محض سوالیہ نشان لگا کر ایک ایک کو ٹرکا دیا۔ پھر سرکاری کام کے سلسلے میں کچھ لوگ ملنے کو آ گئے، انہیں بھی اس نے ایک ایک کر کے ٹالا۔ گھڑی دیکھی تو گیارہ بج رہے تھے۔ دفتر ختم ہونے میں ابھی پورے تین گھنٹے باقی تھے مگر چائے کا ٹائم ہو چکا تھا۔ جم آیا ہی چاہتا ہوگا۔ اس نے گھنٹی بجا کر شاہجہان کو چائے لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر میں باہر برآمدے سے جم کے بھاری مضبوط قدموں کی آواز آئی۔ وہ حسبِ عادت چلتے چلتے کسی سے قہقہہ لگا کر بات کر رہا تھا۔

"کیوں کیا حال ہے تمہارے مورال کا؟

ارے ابھی تک چائے بھی نہیں آئی۔" اس نے کمرے میں گھستے ہی کہا۔

"بس آتی ہی ہو گی۔ میں ذرا حق صاحب کے پاس چلا گیا تھا۔"

"اللہ رحم کرے تم پر۔ آج صبح ہی صبح کیسے پیشی ہو گئی۔"

"یونہی بور کرتا ہے یار۔ ہر بات میں خواہ مخواہ کی مین میخ نکالتا ہے اور اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کرتا ہے" جم نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، "دفتر کا وقت دراصل ہوتا ہی ہے برباد کرنے کے لئے۔" اتنے میں شاہجہان چائے لے کر آگیا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور چائے بنانے لگا۔

"کیوں پھر آج شام کا کیا پروگرام ہے۔" جم نے پوچھا۔

"پروگرام کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ ابھی تو کل شام کا ہی خمار نہیں اترا۔"

"پھر تو آج پروگرام بننا بہت ہی ضروری ہے، ورنہ تمہارا خمار کیسے اترے گا؟

وہ تم نے سنا نہیں انگریزی میں سعت

خمار اور سرگرانی کا تو بس یہی علاج ہے کہ تھوڑی اور ہو جائے۔ ہم تو ویسے بھی ہمیشہ سے علاج بالمثل کے قائل ہیں، جس کتے نے کاٹا ہے اسی کے بال کھوجتے ہیں۔"

"معاذاللہ تم تو بالکل ناممکن ہو" باسط نے ذرا تیزی مگر خوش مزاجی سے

جواب دیا، "تم بالکل جن ہو جن۔ انسانوں والی تو کوئی بات ہی نہیں تم میں۔ مگر بھلا تمہاری بات ٹال بھی کون کم بخت سکتا ہے۔ آج صبح ہی صبح بیگم صاحبہ سے جھڑپ ہوتے ہوتے بچی۔"

"اس کی تم ذرا بھی فکر نہ کیا کرو۔ وہ بیوی ہی کیا جس سے جھڑپ نہ ہو۔ اپنی ہی کو دیکھ لو۔ تمہاری بھابی روز کچھ نہ کچھ کہتی سنتی رہتی ہیں مگر مجال ہے۔ کہ یاروں کے کان پہ ذرا جوں بھی رینگ جائے۔"

"بھئی تمہارا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔"

"کیوں بھئی مجھ میں کیا کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔"

"ضرور ہو گا۔"

جم ہنس پڑا، "خدا کا شکر ہے تمہارا مزاج تو کچھ درست ہوا۔ اچھا بھئی اب چلے۔ پھر ٹھیک سات بجے کلب پہنچ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارا حکم جو ٹھہرا۔"

باسط کے منہ کا مزہ ابھی تک بڑا ہو رہا تھا۔ ضرور اس کا جگر خراب ہو چکا تھا۔ اگر یہی سلسلہ رہا تو ایک نہ ایک دن اس کا سسٹم بالکل جواب دے دے گا۔ یہ روز روز کی کلبنگ کے متعلق اسے ضرور کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ وہ یونہی اپنے خیالات میں ڈوبتا اور اُبھرتا رہا۔ اے کاش میں یہ سب کچھ چھوڑ کر یک سوئی سے اپنے کام پر لگ سکوں۔ مجھے زندگی میں ضرور کچھ کرنا ہے۔ ہر روز کی طرح اس نے پھر اپنے ناول کا نام اور آگے کا پلاٹ سوچنا شروع کر دیا۔

وہ سوچتا رہا اور اس کے دل میں تخلیق کا دبا ہوا سوتا پھوٹتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کو یقین سا ہو چلا کہ اس کا ناول جلد ہی مکمل ہو جائے گا۔ کل ڈھائی سو صفحے ہی تو لکھنا رہ گئے تھے۔ اگر وہ اتوار کو چھوڑ کر صرف دو صفحے روز لکھے تو پوری کتاب کی تکمیل کے لیے صرف تین چار ماہ درکار تھے اور اس کے بعد وہ ایک بڑا اور مشہور مصنف بن جائے گا۔ ساری دنیا میں اس کی دھوم مچ جائے گی اور اس کو دوام نصیب ہو جائے گا۔ پھر موت بھی اسے شاید کبھی ختم نہ کر سکے۔

خوشی اس کے دل میں بچے کے پنگوڑے کی طرح ہلورے لیتی رہی۔ اُمید اسے میٹھی لوری دیتی رہی مگر پھر اسے شام کے پروگرام اور کلب میں نشست کا اچانک خیال آیا اور اس کو ہول سا آنے لگا۔ اس کی طبیعت چاہی کہ وہ ابھی جم سے جا کر کہہ دے کہ بھائی مجھے معاف کرو یہ سب کچھ میرے بس کا نہیں۔ مگر یہ سوچ کر وہ چپ ہو رہا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔ جم اسے پہلے ہی مار بڈ اور قنوطی کہتا تھا اس کے بعد تو وہ اسے بالکل دیوانہ ہی سمجھنے لگے گا۔

اس کا ذہن پھر پریشان ہو گیا اور ناول سے متعلق خیالات کا جو تار سا بندھا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ دفتر کا وقت روز کی طرح گزر گزر کر ختم ہوا چاہتا تھا۔ پھر اسے اپنے گھر کا، اپنے بیوی بچوں کا خیال آیا۔ اس نے سوچا: وہ روز کی طرح آج بھی اپنی ۱۹۶۰ء ماڈل کی مارس میں گھر جائے گا، سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے گا، بیوی سے کسی بات پر

نوک جھونک اور بچوں سے لاڈ پیار کرے گا۔ پھر دو ڈھائی گھنٹے قیلولہ، پھر چائے، پھر غسل اور پھر کلب۔ معمول کی طرح دور چلے گا۔ گھنٹے دو گھنٹے ہنگامہ رہے گا، پھر گھر واپسی ہوگی۔ اگر دیر ہو گئی تو چوروں کی طرح دبے پاؤں تاکہ بیوی اُٹھ کر خواہ مخواہ کے سوال جواب نہ کرے۔ پھر دوسرے دن کی صبح نمودار ہوگی وہ بیدار ہوگا اور اس کی زبان پر اسی طرح سفیدی کی تہیں جمی ہوں گی اور اس کے منہ کا مزہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہوگا: کبھی تلخ، کبھی ترش اور کبھی کسیلا۔

اس نے سوچا کہ وہ آج شام ضرور جم سے صاف صاف کہہ دے گا۔ کہ بس جو ہوا سو ہوا، آگے ختم۔ پھر اس نے اس روشن اور سہانی صبح کا خواب دیکھا جب وہ بیدار ہوگا تو وہ بالکل ایک نیا انسان بن چکا ہوگا، اس کے منہ کا مزہ ٹھیک ہو چکا ہوگا، پیٹ کی تیزابیت درست ہو چکی ہوگی اور اس کا ناول مکمل ہو چکا ہوگا۔

مگر کیا اس کا یہ خواب واقعی کبھی شرمندہ تعبیر بھی ہو سکے گا؟ کیا واقعی وہ کبھی معمول کے چکر سے نکل سکے گا؟ معمول کا چکر جو آواگون کی طرح ہے، جو کرم کا پھل ہے اور جس سے چھٹکارے کے لئے صدیاں اور قرن چاہئیں۔ معمول جو اس کی زندگی کی اساس ہے اس سے آزادی بھلا کیسے ممکن ہوگی۔ جیسے کانچ کا نازک برتن اچانک ہاتھ سے گر کر چور چور ہو جائے اسی طرح اس کا مختصر سا خواب حقیقت سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اس کے تمام مستقبل میں ماضی کا تاریک اور بھیانک سایہ پھیلتا جا رہا ہے۔

جیسے اُسے گرہن لگا ہو۔ آنے والا کل محض کیلنڈر کی ایک نئی تاریخ ہو گی باقی سب کچھ ویسی ہی ہو گا۔ جو برسوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے: یعنی صبح کسلمندی سے اُٹھنا، ضروریات سے فارغ ہونا، بیوی سے اُلٹی سیدھی بات، بچوں سے تھوڑا بہت پیار کرنا! پھر دفتر روانہ ہو جانا، حق صاحب کے سامنے پیشی، جم کے ساتھ تھوڑی بہت گپ اور پھر شام کا پروگرام۔ بس یونہی وقت گزرتا رہے گا، حال اور مستقبل اُلٹی گنگا کی طرح بہتے ہوئے ماضی کے عظیم دھارے میں مل کر فنا ہوتے رہیں گے مستقبل کے لئے منصوبہ بندی ہوتی رہے گی۔ مگر ہر آنے والی کل مستقبل کا ہر نیا دن کسی نہ کسی طور اور بہانے جانے والی کل اور ماضی کو دہراتا رہے گا

خالدہ اقبال

ایک رپورتاژ

باہر انہونی خاموشی تھی

پھر کہیں کوئی چیز مجھ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اپنے آپ کو مجھ سے الگ نوچ رہی تھی اور میرے سر کا بوجھ ایک جانب جھکا پڑتا تھا۔ میرے ہاتھ کسی چیز کے گرد سختی سے بندھے تھے۔ یہ کیا ہے؟ میں نے سوچا میں دیکھے بغیر جانوں گا کہ میرے ہاتھوں کے درمیان کیا چیز ہے! مگر بہت دیر تک مجھے یاد نہ آیا اور کوئی چیز مجھ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی، اپنے آپ کو مجھ سے الگ نوچ رہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں بھی بہت سوچا کہ یہ کیا ہے۔ میری زبان خشک تھی اور عرصہ سے دانتوں کے درمیان ایک ہی طرح دبی تھی۔ اس کے کناروں پر دانتوں کے نشان کندہ ہو گئے تھے۔ اور مجھے وہ چھپکلی یاد آئی۔ جیسے برسوں برسوں پہلے، بچپن میں، میں اور میری بہن دیوار کی درز میں چھپتے دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی اس کی دم تنکا سی باہر رہ جاتی اور ہم نیم کی تیلی اس درز میں ڈالتے اور محسوس کرتے کہ اس تیلی کا دوسرا سرا چھپکلی کے جسم میں دھنس رہا ہے اور ہمارے تمام جسم میں ایک جھرجھری اٹھتی میری بہن کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور وہ بھاگ جاتی مگر میں وہاں کھڑا رہتا اور اس

کا انتظار کرتا۔ ایک روز ہم بہت دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے اور آخر جب وہ ہولے سے باہر سرکی تو اس کے مٹیالے جسم میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے تھے۔ وہ کچھ دیر دیوار پر رکی رہی اور پھر دھپ سے زمین پر آن گری۔ اس کی آنکھیں پتھر سی ٹھہر گئیں۔ وہ خود بھی پتھر سی ٹھہری رہی۔ ٹھہری رہی۔ گھنٹوں۔ شام تک — اور آخر ہم نے اسے جھاڑو سے اٹھا کر نالے میں پھینک دیا۔

نالہ ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا۔ گہرا۔ ہاں کافی گہرا، کیونکہ جب سال میں ایک آدھ مرتبہ اس کی صفائی ہوتی تو کارپوریشن کے آدمی اس میں شانوں تک اتر جاتے تھے۔ اس نالے میں مٹیالہ، سیاہی مائل، گھنا پانی بہتا تھا اور ہمارے درخت، جو دیوار سے باہر جھک کر اس پر سایہ کرتے تھے، ان درختوں کے پتے اس میں گرتے تھے — اور جھاڑو سے اٹھا کر ہم نے اسے وہاں پھینک دیا تھا اور وہاں بھی وہ پتھر سی ٹھہری رہی تھی۔ اور ہم نے دن میں تین چار مرتبہ آ کر دیکھا: وہ وہیں پڑی تھی۔ پھر ہم اسے بھول گئے۔

مگر آج برسوں بعد وہ مجھے یاد آئی تھی۔ حالانکہ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ میری زبان خشک اور دانتوں کے بیچ بند ہے اور میرے اندر کوئی چیز باہر نکلنا چاہتی ہے۔ شاید مجھے بھوک لگی تھی۔ ہاں ٹھیک ہے، مجھے بھوک لگی تھی۔ شاید کافی دیر سے۔ گھنٹوں سے، دنوں سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا کیونکہ تبھی سے باہر انہونی خاموشی تھی۔ اب بالآخر میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف

دیکھا، ان میں ٹوٹی چارپائی کی پٹی تھی اور میری انگلیاں اس پر جم گئی تھیں۔ میں نے سوچا: اب میں ہاتھ کھولوں گا تو اس لکڑی پر چھوٹے چھوٹے گڑھے ہوں گے میں نے آہستہ سے انگلیاں کھولیں مگر وہ کچھ تھوڑا سا کھل کر رک گئیں۔ لکڑی صاف تھی، صرف نم کے دھبے پنجے کی صورت اس پہ لگے تھے۔ میری انگلیاں سفید پڑ چکی تھیں اور گرفت کے انداز میں اکڑ کر جم گئی تھیں۔ ان میں کہیں کہیں سرخی کی لکیریں تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ میری انگلیوں نے کھلنا شروع کیا، ان کی سخت ٹھنڈک دور ہونے لگی اور ان میں ہلکا ہلکا رنگ پھیل گیا۔

میں نے لکڑی چارپائی پر ڈال دی اور سامنے دیکھا۔ اب تک معلوم نہیں میں کہاں دیکھتا رہا تھا۔ سامنے دیکھنے سے میری آنکھوں میں جلن ہوئی اور پانی بھر آیا۔ ماں اپنی چارپائی پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے سفید چمکتے چاولوں کی رکابی تھی اور وہ اس پر جھکی تھی، اس کے پنجے تیزی سے چاول سمیٹ سمیٹ کر بے دانت کے منہ میں ڈالتے تھے اور وہ منہ ہلا کے نگل رہی تھی اس کے چہرے پر جھریوں کی تہیں جمی تھیں۔ گہری گہری —— بے حد گہری لکیریں، اور ان کے درمیان لٹکنے والی جلد۔ جس سے اس کے چہرے پر طرح طرح کے چوکور اور تکونے نقشے بن گئے تھے اور مجھے یاد آیا۔ ہوائی جہاز سے زمین ایسے ہی چوکور اور تکونے ٹکڑوں میں بٹی نظر آتی ہے۔

مگر باہر اخوفی خاموشی تھی۔

میری بیوی نے چاولوں کا دیگچہ چولہے سے اتار لیا تھا اور اب دونوں بچے اور لڑکی چولہے کے گرد بیٹھے تھے اور ان کے درمیان رکابیوں کا ایک اڑہ

بنا تھا۔ چمکتے چاولوں کی چھوٹی چھوٹی سفید پہاڑیاں جن پر سنہری شکر کے چھینٹے تھے۔ وہ سب بنجوں کو تیز تیز۔ بے حد تیز چلا رہے تھے اور پنجے چاول سمیٹ کر منہ میں لے جاتے تھے اور آنکھیں دوسرے کی رکابی اور منہ پر ہوتی تھیں۔

انہیں بھوک لگی تھی۔

میری بیوی دیگچہ میں بچے کھچے چاول ہاتھ سے سمیٹ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اسی طرح سب سے آخر میں کھاتی تھی۔ میں نے یاد کرنا چاہا: کبھی اس نے رکابی میں کھایا تھا؟ ہاں شاید ان دنوں جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ کیونکہ تب ماں چولہے کے پاس بیٹھتی تھی اور میری بیوی کی سینی الگ نکال کر رکھتی تھی۔

تب ماں بہری نہیں تھی۔

میں نے ماں کے مڑے تڑے، جھول آنے والے کانوں کو دیکھا جن کی لوؤں میں بے شمار چھید تھے اور اب ان میں صرف ایک ایک میلی چاندی کی بالی تھی۔ تب ماں کے کانوں کے تمام چھیدوں میں بھاری بالیاں ہوتی تھیں، جب ہی اس کے کان جھک آئے تھے۔

باہر انوکھی خاموشی سرسرائی۔ کہیں یہ ماں کا سنناٹو نہیں! ہاں ماں اسی طرح سنتی ہے۔ میں نے ماں کو پکارا۔ مگر وہ رکابی میں بچے کھچے چاولوں کا دانہ دانہ چن رہی تھی۔ اور کھردری مڑی تڑی انگلیوں سے رکابی چاٹتی تھی۔

"کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے وہ نہیں سنتی۔" میری بیوی نے حیرانی اور غصے سے کہا۔ اس کی آواز دبی دبی سی تھی۔ وہ اپنی آواز سنانا نہیں چاہتی تھی۔

اور مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ میں نے عرصے سے ماں کو بلانا چھوڑ دیا تھا کیوں کہ وہ بہری تھی۔ مگر آج میں نے ماں کو پکارا تھا۔

"تمہیں کیا کہنا ہے ماں سے؟" میری بیوی نے پوچھا اور رکابیوں کا ڈھیر لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکی بالٹی کے گدلے پانی سے رکابیاں دھونے لگی۔ پانی پچھواڑے کے کنوئیں سے آتا تھا۔ مگر اب پانی پر ہتھیار تانے وہ کھڑے رہتے تھے۔ جب پانی آزاد تھا تب لڑکی ڈول میں پانی بھر کر لاتی تھی۔ اب شام ہونے پر میں جاتا تھا۔ پہلی شام جب میں نے ان بہت سوں کو ہتھیار تانے دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پکارا ماں پانی قید ہو گیا۔ میری شروع کی عادت ہے میں ہر نئی پرانی بات ماں سے کہتا ہوں اس لئے کہ وہ بہری ہے، لفظ نہیں جانتی مگر بات جانتی ہے۔ وہ میری بولی نہ سمجھتے ہوئے ہتھیار تانے میری طرف آئے۔ اگر میں چاہتا تو انہیں دکھاتا، کہ پانی ان کی سنگینوں میں سے رس رس کر میرے ہاتھوں کی جانب لپک رہا ہے۔ اور میں وہ پانی اپنی گود میں بھر لاتا، اور اس پانی میں گدلی مٹی بھری ہوتی اور وہ گدلی مٹی بھرا پانی ہمارے اندر اترتا۔ میرا جی چاہا، کہ وہ گدلا مٹی بھرا پانی میرے اندر اترے۔ اترے اور جم جائے۔ جم جائے اور وہ دیوار ٹوٹ جائے، جس کی دراڑ میں میں پڑا ہوں۔ مگر ایک پانی پر اتنے بہت سوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی، اور میں چلا آیا۔ جب چلا آیا تو وہ آپس میں باتیں کرتے تھے: دیکھو کنوئیں کا پانی سوکھ گیا ہے۔ کنوئیں کا پانی زمین چوس گئی ہے اور میں نے جاتے جاتے دیکھا کہ کنواں ایک اندھا گڑھا ہے،

اس لئے میں نے گھر آکر ماں سے کہا: کنواں ایک گڑھا ہے۔ ماں نے میرے ہلتے ہونٹوں کی طرف دیکھا اور اپنی کانپتی ہوئی آواز میں ایک پرانا گیت گانے لگی۔ یہ سہاگ کا گیت تھا۔ میری بیوی نے یک دم کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"ماں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کیوں؟ ماں ٹھیک ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں ہنسا... اور پھر میں نے ماں سے کہا:

"ماں پانی بند ہو گیا ہے؟" میں شروع سے ہر بات ماں سے کہتا چلا آیا ہوں۔

"تم ماں سے کیا باتیں کرتے ہو؟ جس طرح ماں کو پکارتے ہو، مجھے کیوں نہیں پکارتے؟" میری بیوی ہمیشہ یہی کہتی چلی آئی تھی۔

"تم تو بہری ہو۔" میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"میں!" اس کی آنکھیں تعجب اور دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں مگر وہ خاموش سی ہو گئی۔

"کیا معلوم؟" اس نے آہستہ سے کہا، "اور تم؟"

"کیا معلوم؟" میں ہنس دیا۔

"اور یہ سب؟" اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا معلوم؟" جب کوئی سنتا ہے مٹی بن جاتا ہے، ماں کی طرح۔" میں نے دل میں بات پوری کی۔ اور میرے پیٹ میں اوپر تلے بہت کچھ ہوا۔

"مجھے چاول دو؟" میں چارپائی سے اتر کر بیوی کے قریب آن بیٹھا۔ دونوں بچے کچھ الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے دیکھا ان کے چہرے چھوٹے ہو گئے تھے، اور آنکھیں بڑی۔ میری لڑکی کی پشت میری طرف تھی اور اس کے بال بکھر تک آتے تھے۔ اس کی پشت بالکل میری بیوی کی سی لگتی تھی۔

"برتن کیوں دھوتی ہے؟" میں نے بیوی سے پوچھا۔

"ساتھ نہیں لے جاؤگے؟" میری بیوی نے چاولوں کی رکابی میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ بھی جھریوں بھرا تھا اور آنکھوں کے گرد نیلے نیلے دائرے کھچے تھے۔ اور ڈھیلے کرتے میں اس کے جسم کا کہیں نشان نہ تھا۔

"ساتھ نہیں لے جاؤگے؟ کچھ بھی نہیں لے جاؤگے؟" اس نے مجھ سے پوچھا اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا: وہ سفر جو ہمیں کرنا تھا، اور مجھے یاد آیا کہ کس طرح بالآخر میں وہ لکڑی پکڑے اس چارپائی پہ بیٹھا رہ گیا تھا۔ میں نے کہا:

"شاید ہم نہیں جائیں گے۔"

"نہیں؟" میری بیوی کی سرگوشی پر دونوں بچوں کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔ اور لڑکی نے منہ موڑ کر دیکھا۔ بال اس کی آنکھوں اور منہ میں چلے آئے تھے۔ اور ان میں سے اس کے زرد چہرے کی ابھری ابھری ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ اس وقت وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے، سوائے ماں کے، کیونکہ وہ سنتی نہیں تھی۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا: اس کی

آنکھوں پر اب سفید سا پردہ بھی اترتا آرہا تھا۔ اور ان کی آنکھوں کے سامنے وہ ہم سب کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف منہ کر کے زور سے کہا: "نہیں۔"

مگر وہ پلک جھپکے بنا بیٹھی رہی اور میں نے ہاتھ سے چاولوں کا نوالہ بنایا نوالے بنا کر کھانا بڑا لبا اجد مشکل کام ہے۔ مجھے یاد آیا برسوں برسوں پہلے ماں نوالہ بنانا سکھاتی تھی اور میں اپنی بہن سے بہت پہلے نوالہ بنانا سیکھ گیا تھا۔ حالانکہ میں اس سے کہیں چھوٹا تھا اور ماں بہت خوش ہوئی تھی۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سب چاول بغیر کھائے میرے اندر چلے جائیں اور میرے پیٹ میں بوجھ بن جائیں تو بہت اچھا ہو۔ مگر مجھے نوالے تو بنانے ہی تھے۔ میرے سر کا بوجھ ایک جانب کو گرا پڑتا تھا۔

"کیوں؟" میری بیوی نے پوچھا اور دونوں بچوں اور لڑکی نے سانس روک لی مگر ماں اسی طرح بیٹھی رہی۔

پھر اس نے پہلو بدلا۔

"بہو ذرا آنا۔" وہ چارپائی سے نیچے اپنی جوتی ٹٹولنے لگی۔

"مجھے بتاؤ، کیوں؟" میری بیوی نے ماں کی طرف جاتے ہوئے پھر کہا۔ چلتے پر بھی اس کے ڈھیلے کرتے میں کہیں دور دور اس کے جسم کا پتا نہ تھا اور مجھے حیرانی ہوئی آخر اس کا جسم کہاں گھل گیا؟ جب وہ کو ماں کو گلیارے میں لے جا رہی تھی تو میں نے کہا:

"ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے۔" مجھے معلوم نہیں میں نے یہ کیوں کہا، کیونکہ اب سے پہلے میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم کسی بھی

وقت چلنا شروع کر دیں گے، رات کے اندھیرے ہیں، مگر اب باہر انہونی خاموشی تھی اور اس میں چلا نہیں جا سکتا تھا۔

میری بیوی ماں کو غسل خانے میں بٹھلا کے آگئی۔

"کیوں نہیں پہنچ سکتے؟" اس نے قریب آکر پوچھا، اور اس کی آواز کے ساتھ مٹی اور کافور کی بو لپٹی تھی۔ اس نے بچوں سے اپنی آواز چھپا کے کہا تھا۔ وہ اپنی آواز چھپانا چاہتی تھی۔ اور بچے بہت دنوں سے نہیں بولے تھے۔ میں ان کی آواز بھی بھول گیا تھا۔ اب وہاں کوئی بھی بولنے والا نہیں تھا۔ انہوں نے بولنے والی زبانیں کاٹ ڈالی تھیں اور کھنڈ یکنویں ان بولتی کٹی زبانوں سے بھر گئے تھے اور وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے: دیکھو کنوئیں کا پانی زمین چوس گئی ہے اور اب یہاں پتھر بھرے پڑے ہیں۔ مگر پتھر ملتے ہیں اپنے آپ۔

کہیں سے لکڑیوں کے چٹخ کے گرنے کی آواز آئی اور بند کھڑکی کی درزیں سُرخ روشنی میں چمکیں۔

"یہ کیا ہے؟" میری بیوی نے اچانک بند کھڑکی کی طرف لپک کے کہا۔

"کھڑکی کے قریب مت جاؤ۔" میں نے نوالہ نگل کے کہا۔

گلیارے سے ماں کی آواز آئی، وہ میری بیوی کو بلا رہی تھی۔

"جاؤ ماں کو لے آؤ۔" میں نے کھڑکی کے قریب کھڑی اپنی بیوی سے کہا۔ اب میرے گھٹنے ایک ٹھنڈی گیلی لپکپاہٹ سے چھو گئے۔ میں نے دیکھا بچہ ہولے سے کھسک کر میرے گھٹنے کے ساتھ آن لگا تھا اور کانپتا تھا اور آگ کی روشنی میں اس کا رنگ ہلدی کی طرح تھا اور آنکھیں پھیل کر

باہر تک آگئی تھیں، کرتے پر جگہ جگہ پسینے کے دھبے تھے۔ میں نے اپنا گھٹنا پرے کرنا چاہا مگر اس کے ٹھنڈے ہاتھوں نے میرا گھٹنا جکڑ لیا اور اس کے گلے میں سے ایک آواز نکلی۔

میری بیوی ماں کو سہارا دے کے لے آئی۔

"میں کہتی ہوں بہت دنوں سے گھروں میں روشنی نہیں ہوئی۔ ختم ہو گئی کیا؟ آج بھی نہیں ہے!" اس نے چارپائی پر بیٹھ کر کہا۔

"... گھر بھی نہیں ہیں۔" میں نے اس کی طرف منہ کرکے جواب دیا مگر اس نے کچھ نہیں سنا، وہ جب سے جوان ہوئی تھی صرف سوال کرتی تھی جواب نہیں سنتی تھی۔

"دوسرے کس طرح پہنچ گئے؟" میری بیوی نے پوچھا۔ دوسرا بچہ اور لڑکی اس کے ساتھ لگے کانپتے تھے۔

باہر انہونی خاموشی اب گھل رہی تھی، اور آوازیں ہم تک آرہی تھیں۔

"تم کیسے جانتی ہو وہ پہنچ گئے؟ وہ گئے ہی نہیں تھے۔" میں نے اکتا کر بات چھوڑ دی۔

"مگر وہ یہاں نہیں ہیں۔ میں نے انہیں خود جاتے دیکھا ہے۔" میری بیوی نے اصرار کیا۔

"ہاں وہ یہاں نہیں ہیں مگر وہ کہیں پہنچنے کے لئے گئے تھے۔" میں نے بات ختم کرنا چاہی۔ کیونکہ باہر انہونی خاموشی تیزی سے گھلتی جا رہی تھی۔

میری بیوی میرے قریب آن بیٹھی۔ اس کی سانس سے مٹی اور کافور کی بو اُڑتی تھی اور ڈھیلے کرتے بس دور دور تک اس کا نشان نہیں تھا۔ اس کے لمس پر میرے جسم میں جھرجھری اُٹھی۔

"دیکھو، انہیں دیکھو۔" اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت وہ سب زرد مٹی کے بنے تھے۔ ماں بھی زرد مٹی کی تھی اور اس کی آنکھوں پر سفید پرچھ اتر رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ سیاہ کھردری جلد پہ رگوں کی رسیاں ابھری تھیں۔ پھر میرے سر میں وہ گرم گرم چیز اُبلنے لگی اور میری کنپٹیاں دھڑک اٹھیں، سانس میرے سینے میں پھٹنے لگی۔

"دروازہ کھول دو۔" میں نے بمشکل اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا کیونکہ اس وقت شاید میں چلاتا جیسے ایک بار پہلے چلایا تھا اور دروازہ کھول کر باہر کھڑا ہوگیا تھا، ہتھیار تانے . . . . اور اس وقت تک چلاتا اور لڑتا رہا تھا جب تک کہ وہ سب کے سب میرے ہتھیار چھین کر اور سر توڑ کے چلے نہیں گئے تھے۔ اور میں ٹوٹی چارپائی کی پٹی پکڑے رہ گیا تھا۔۔ رہ گیا تھا اور اس کو تھامے رہا تھا۔

"خاموش رہو۔" میری بیوی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر اس کے ہاتھ ٹھنڈی مٹی کے تھے، جن سے کافور کی بو اُڑتی تھی

"ہمیں خاموشی سے چلنا ہے۔" اس نے میرے ہاتھ سے چارپائی کی پٹی لیتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" مجھے اس کی ہٹ دھرمی پر غصہ آگیا۔

"کہیں نہیں۔" بالآخر وہ مان گئی، "صرف یہاں سے یہاں تک۔" اس نے جلدی سے جلدی کمبل لپیٹے اور چمڑے کا پھٹا سوٹ کیس بند کیا۔

"چلو، چلو۔" اس نے بچوں سے کہا مگر پہلا بچہ اس کی طرح زمین پر پڑا کانپتا رہا اور باہر چیخ کر گرنے والی ہر گھڑی پر اس کے گلے سے ایک آواز نکلتی تھی۔

"اسے تم اٹھاؤ۔" میری بیوی نے دوسرے بچے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جھک کر اسے پشت پر لاد لیا۔ اس کی کپکپاہٹ میری جلد کے ساتھ سرسراتی تھی۔

"چپ ہو جاؤ، کانپو مت۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ اس پر وہ اور زیادہ کانپنے لگا۔ "تم کیا کر رہے ہو۔" ماں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کے کہا۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ہم سب نے ماں کے مڑے تڑے جھول آنے والے کانوں کو دیکھا۔ وہ آنکھیں پھیر پھیر کے ہماری طرف دیکھ رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ ہم اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں اور سننے اور دیکھنے کی کوشش کرتی تھی جب کہ ہم باہر کی انہونی خاموشی کو گھلتے دیکھتے اور سنتے تھے۔ جو پہلے دور تھی اور اب قریب۔ میں ایک قدم ماں کی طرف گیا کوئی چیز میرے پاؤں سے ٹکرائی۔ میں نے جھک کر دیکھا، کتاب تھی۔ پھر اور بھی کئی کتابیں میرے پاؤں سے ٹکرائیں جو ہم نے جمع کی تھیں اور پڑھی تھیں مگر ٹھنڈے گرم جسم کا بوجھ میری پشت پر تھا اور اس کے گلے سے ایک آواز نکلتی تھی۔ لڑکی نے خود سے آ کر میری انگلی تھام لی۔ اس کی ہتھیلی ٹھنڈی اور کھردری تھی اور پسینے میں بھیگی کانپتی تھی۔ دروازے تک قدم بڑھا کر میں پھر رک گیا۔

"چلو۔" میری بیوی نے کہا۔ ان سب کی طرف دیکھ کر۔ پھر وہ گرم گرم چیز میرے سر میں اُبلنے لگی جو خاموش ہو گئی تھی۔ میرے گلے میں سانس پھول گئی۔ باہر کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔ بالکل قریب۔۔ دروازے کے باہر۔ میں نے چلّا کے کہا:

"دروازہ کھول دو۔"

مگر میری بیوی دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" اس نے اچانک چلّا کے پوچھا اور چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ "میں دیکھ رہی تھی، دیکھ رہی تھی کمروں میں روشنیاں نہیں ہوتیں، یہ دروازہ بند رہتا ہے۔ کھلتا ہے تو تم مجھے گلیارے میں چھپا دیتے ہو، اب تم بچے کو پیٹھ پر لادے ہو اور وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔" میری دانتوں میں بھنچی خاموش زبان نے کہا۔ پھر میں نے ان چاروں کو دیکھا جو زرد مٹی سے بنے تھے اور کافور کی بو اُڑاتے تھے اور میں نے اپنے کو دیکھا: میرے مٹیالے جسم پر گڑھے پڑ چکے تھے۔

"دروازہ کھول دو۔" میں نے اپنی بیوی کو ہاتھ سے ایک طرف دھکیل دیا اور پھر کھلے دروازے کے سامنے کھڑا رہا، کھڑا رہا، یہاں تک کہ بالآخر وہ سب کے سب دروازہ دھکیل کر اندر آ گئے اور ہتھیار تانے ہمارے پیچھے ہو لئے۔

"تم انہیں کہاں لے جا رہے ہو؟" ماں نے چلّا کے کہا۔

مگر وہ ہمیں دھکیلتے ہوئے دروازے سے باہر لے گئے۔ باہر میں نے ان سب کو دیکھا جو جا چکے تھے، اور اندھے کنوئیں جن میں پتھر پڑے تھے، اور انہوں نے میرے ہاتھ میں بھی زبانوں کے پتھر تھما دیئے اور ہم خالی اندھے منہ کے ساتھ چلتے رہے۔ میری پشت پر کا ٹھنڈے گرم جسم پر کا بوجھ مٹ گیا اور میرے ہاتھوں میں ننھے پتھر بولے اور صدیوں کے فاصلے پر میری ماں نے سُن لیا "اچھا۔" وہ اطمینان سے دہلیز میں بیٹھی سہاگ گیت گانے لگی۔ جب کہ وہ ہتھیار تانے ہمارے پیچھے تھے اور کہتے تھے: دیکھو زمین پانی چوس گئی ہے۔ دیکھو اندھے کنوئیں میں پتھر بھرے ہیں۔"

انور سجّاد

پرندے کی کہانی

،،بلو بلڈی باسٹک۔،،

دربان نے زمین پر زہر تھوکا، آستین سے منہ پونچھا اور نوٹ والی مٹھی جیب میں ڈال لی۔ اس کی نظریں باہر دالان کی طرف کھلتے دروازے پر تھیں جاتے جاتے سفید فام سیاح 'یا' س ف س نے گھوم کر ہاتھ ہلا کے الوداع کہا دربان کی زبان سے پھر زہر ٹپکا، اس نے آستین سے دوبارہ منہ صاف کیا، بجور آنکھوں سے لوگوں کو دیکھا، مسکرا کے جواب میں ہاتھ ہلایا اور جیب میں نوٹ کو ملتا مقبرے کی محراب کے نیچے اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ گیا۔ وہ مسرور تھا اور نہیں بھی۔

س ف س بہت مسرور تھا۔ نیلے کانچ میں اس زمین کا سارا اسرار محصور تھا۔ اس نے مڑ کے محراب کی تصویر لی، جوتوں پہ چڑھے خول اتارے اور صحن میں آگیا۔ کچے فرش پر سوندھی سوندھی باس اٹھ رہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر باس کو سینے میں — بھرا۔ دوسرے ہی لمحے سانس کے ساتھ ہی یہ باس پھر ہوا میں بکھر گئی۔

میں اس خوشبو کو کیمرے میں قید نہیں کر سکتا۔

س ف س نے مایوسی میں سر ہلایا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے جوتوں کے نیچے صحن میں بکھرے دانے چرچرا رہے تھے۔ اسے پاس ہی دانہ چگتے پرندوں کے غول میں کوئی غیر فطری بات نظر نہ آئی۔ حسبِ معمول پرندوں کی دنیا وہ دانہ تھی جو چونچ کے نیچے تھا؟ اس دانے کے علاوہ ہر شے معلوم۔ یہ دانے کس نے پھینکے تھے؟ پرندوں کو معلوم تھا کہ یہ دانے کہاں سے آگئے ہیں! انہیں یہ یقین تھا کہ ان دانوں کی تہ میں کوئی جال نہیں؟

یہ معمولی اور غیر اہم سوال ہیں۔ مجھے کیا؟ یہ پرندوں کے ذاتی مسائل ہیں۔ ظاہر ہے کسی سخی ہاتھ ہی نے یہ دانے بکھیرے ہوں گے۔

س ف س نے سر کی ایک جنبش کے ساتھ ہی سارے سوال جھٹک دیئے۔ وہ تھم تھم کے قدم اٹھاتا پرندوں کے قریب سے گزر کے باہر کے دروازے سے نکلنے ہی والا تھا کہ پرندوں کے غول میں ایک پتھر آکے گرا۔ پرندوں نے لمحہ بھر کے لئے پر تولے اور پھر دانہ چگنے لگے۔ لیکن اب ان میں پہلا سا اطمینان نہیں تھا۔ وہ بار بار گردنیں اٹھا کے اس اور دیکھتے تھے جس سمت سے پتھر آیا تھا: س ف س نے اس طرف دیکھا۔ منڈیر پر ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ بہت معصوم۔ اس کی مسیں ابھی نہیں پھوٹی تھیں، س ف س کے ذہن میں جانے کیوں حضرت عیسیٰ کے بچپن کے کئی نقش گزر گئے، لیکن وہ سب کے سب چہرے اوپرے اوپرے، اجنبی سے تھے۔ وہ معصوم چہرہ وہاں کی زمین تھا: سوندھی سوندھی باس، گندمی گندمی مٹی، نصف کرۂ ارض پر محیط۔

اگر میں مصوّر ہوتا تو اسے فوراً اپنے سٹوڈیو میں لے جاتا۔

اس نے اپنے کیمرے کو تھاما۔

نہیں، یہ مشین کا کام نہیں۔ دماغ میں اس لڑکے کے بھڑکائے ہوئے شعلے سلولائیڈ کو راکھ کر دبی گئے۔

لڑکے نے اپنی قمیص کے دامن سے بہتی ہوئی ناک کو پونچھا اور غول کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے دوسرے پتھر کو اچھالنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ وہ غول میں دوسرا پتھر پھینکتا۔ س ف س یکدم چلایا: "او۔ یو۔ جیوڈاس۔" لڑکا اس کے تیور دیکھ کر منڈیر سے اتر کر بھاگ گیا۔ س ف س نے خشک گلے کو تھوک سے تر کر کے اطمینان کا سانس لیا

میں خواہ مخواہ زمین کے رنگ اور خوشبو کے جھانسے میں آکر جذباتی ہو گیا تھا جیوڈاس ہی تو تھا، بالکل جیوڈاس

اس نے غول کی طرف دیکھا پرندوں میں اب بھی کسی حد تک اضطراب تھا اس نے جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ نیلے کانچ میں محصور سارا اسرار جلیول میں پھیل گیا۔ غول سے ایک عجیب و غریب پرندہ نمایاں نکل کر زمین کو سونگھتی آگے بڑھی اس کی کھال پروں سے مبرا تھی۔ صرف رُوئیں تھے جو کہ پر نچنے کے بعد رہ جاتے ہیں۔ بے ڈھنگے جسم کے دونوں طرف ٹنڈمنڈ بازو لٹک رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کے سارے رنگ اس کی کھال سے پھسل کر لوم رنگ کی طرح واپس سورج کے حلق میں ٹپک رہے تھے، صرف پیلا زی رنگ تھا کہ کھال سے چپکا تھا۔ لمبی گردن کے آخر میں بڑا سا سر جس میں گول گول آنکھیں رتھ کے پہیے تھے۔ چونچ اوپر نیچے رکھی دو کرکیوں سے بنی تھی۔ وہ اپنے سوکھے ہوئے پنجے ناپ تول کے زمین میں گاڑ کر چلتا تھا اس کی چونچ زمین کے ہر دانے کو پرکھتی، اٹھاتی، پھر اسے وہیں چھوڑ کر اگلے دانے کی طرف بڑھ جاتی۔ قدم اٹھانے اٹھاتے اس کا ٹنڈمنڈ بازو اس کے سامنے آجاتا: اس کی طرف گردن جھکتی، بازو کے سرے کو چونچ میں لینے کی

غرض سے وہ اپنے پنجوں پر گھومتا گھومتا لٹو بن جاتا، پھر اس سعیٔ لاحاصل سے اکتا کر اگلے دانے کی طرف چیچخ بڑھ جاتا۔ غول کے پرندے اس سے بے تعلق جلدی جلدی اپنے پوٹے بھر رہے تھے اور اپنے اپنے بسیروں کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ پرندہ دانوں کی پرکھ میں معروف تھا۔

س ن س کا منہ حیرت میں کھلا تھا۔

اس نے اس قسم کا پرندہ، گروہ پرندوں سے نکل کر آیا تھا، آج تک نہیں دیکھا تھا۔ تاریکیٔ خنک، سرخ پھولوں سے لدے دھاڑتے ہوئے جنگلوں کے سیاہ آسمان پر اڑتا ہوا وہ پسینے، دھواں اور بارود کی بو میں رچے، سبز غلاف میں لپٹے پہاڑی آسمان پر آیا تھا۔ اس کے سوٹ کیس پر بہ رنگ ہر ڈیزائن کے لیبل چسپاں تھے۔ لیکن آسمان کی کسی وسعت میں اس کو یہ پرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا ہاتھ فوراً اپنے کیمرے کی طرف بڑھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ رول تو ختم ہو گیا ہے اور اس کے پاس اور فلم نہیں۔

تو پھر، تو پھر۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

تو پھر میں اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ شہری پنجرے میں ڈال کر اسے اپنی ماں کے جنم کے دن پر تحفہ دوں گا۔ یہ پرندہ بولتا بھی ہو گا۔ اس کے جسم کی طرح اس کی آواز بھی عجیب و غریب ہو گی۔ میری ماں یقیناً اس تحفے کو پسند کرے گی۔

پھر اسے لطیفہ یاد آیا کہ کس طرح ایک امیر نے بے بہا رقم خرچ کر کے ایک گانے والا پرندہ کسی دوسرے ملک سے اپنے گھر تحفے کے طور پر بھیجا۔ اگلے روز یہ جاننے کے لئے کہ پرندہ بحفاظت پہنچ گیا ہے یا نہیں ٹیلیفون پر اپنی بیوی سے پوچھا کہ پرندہ کیسا رہا۔ دوسری طرف سے چٹخارے دار آواز آئی: "نہایت لذیذ!" س ن س مسکرا دیا۔

اوّل تو یہ پرندہ میں خود لے کر جاؤں گا اور اگر ایسا موقع آ بھی گیا کہ ماں اپنے کانوں کے

ذائقے پر زبان کے ذائقے کو ترجیح دے تو میں بھی اس ضیافت میں شریک ہو سکوں گا۔

وہ ذرا ہٹ کر، عین پرندے کے سامنے آکے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا پرندے نے رک کر اسے بغور دیکھا، پھر گردن گھما کر غول کے پرندوں پر نگاہ ڈالی۔ پرندے ایک ایک کر کے زمین چھوڑ رہے تھے۔ کچھ درختوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور کچھ محرابوں کی طرف۔ کرن اس پرندے کی کھال کو پیازی رنگ کا آخری چھینٹا دے کر بجھ گئی۔ پرندے کی آنکھیں پھر سس ٹ س کی آنکھوں میں تھیں۔ درختوں سے تاریکی اترنے لگی تھی۔ س ٹ س اپنے اس خزانے کو جلد از جلد قابو میں کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے زمین سے چند دانے اٹھا کر اس کے آگے بڑھائے۔ پرندہ چند قدم چل کر بالکل اس کے قریب آگیا۔ غور سے ہاتھ میں پڑے دانوں کو دیکھا، پھر چونچ پرے کر کے آسمان پر پھیلی سرخی دیکھنے لگا۔

بیمار ہے کیا۔ اگر اس نے دانہ نہ کھایا تو پہلے اس کے پیازی گوشت میں دھان کا پانی سوکھے گا اور پھر...... لیکن اگر اس نے یہ دانا نہ لیا تو اسے میرا اعتماد کیسے حاصل ہوگا اور میں اسے پکڑوں گا کیسے اور......

س ٹ س نے بے صبری سے ہاتھ پھر اس کی چونچ کے آگے کر دیا۔ ننگے ٹنڈ منڈ پرندے نے گردن گھمائی، اور گول گول آنکھوں سے پھر ہاتھ پر پڑے دانوں کو دیکھا۔ گردن ذرا اور آگے بڑھائی، پھر

یک دم جھٹکے سے کرکی ماری:

"ای - ی - ی"

اور س ف س کی چھنگلی سے گوشت نوچ کر ایک طرف ہو گیا۔

س ف س ہاتھ جھٹکتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پرندے کو غصے اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا، اپنی چھنگلی منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔ پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر خون میں بھیگتی چھنگلی پر لپیٹ لیا۔ پرندہ پھر زمین پر اپنی پرکھ میں مصروف تھا۔ صحن میں اور کوئی نہیں تھا۔ س ف س کی چیخ سن کر دربان صحن کے دروازے میں آگیا۔ س ف س نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس پرندے کو پکڑنا چاہتا ہے۔ دربان نے پلٹ کر دیکھا۔ لوگ تھے۔ دروازے کے سامنے سے وہی معصوم سا لڑکا ان دونوں کو غور سے دیکھتا۔ گرد جس کی مسیں ابھی نہیں پھوٹی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پتھر تھا۔ دربان اس لڑکے کو دیکھ کر جھینپ گیا۔ اس نے بے بسی کے اظہار میں کندھے جھٹک کے س ف س کو اشاروں میں سمجھایا، کہ وہ اس پرندے کو کیسے پکڑ سکتا ہے اور واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔

س ف س نے بازو بڑھا کر کہنیاں باہر نکالیں، پرندے پہ اپنے ہاتھوں کا یا، یہ دیکھنے کے لئے کہ پرندہ بڑھتے ہاتھ دیکھ کر نیچے سے نکل بھاگتا ہے یا پرندہ اپنی غذا کی تلاش میں سرگرداں پھر اپنے پنجوں پر گھومتا اپنے بازو لرز رہا تھا۔ س ف س نے موقع غنیمت جانا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن کو پکڑ کے فوراً چونچ کو قابو کیا پھر دوسرے ہاتھ سے اس نے پنجے پکڑ لئے۔

میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں میں تمہیں اچھی اچھی غذا کھلاؤں گا۔ تمہارے جسم پر پر نکلیں گے، تم سنہری پنجرے میں بیٹھ کر بہاروں کے گیت گاؤ گے اور ماں کو خوش کرو گے۔

پرندہ اس کے بازوؤں میں لحظہ بھر کے لئے تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

س ف س نے دربان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مڑ کر دیکھا لیکن دربان کمرے کی چھتوں سے پھیلتی تاریکی میں نظر نہ آیا۔ وہ اس کو دوسری مرتبہ دیکھنے کی کوشش کئے بغیر پرندے کو بغل میں دابے لمبے لمبے ڈگ، بھرتا باہر گیا۔

اس کے شوفر نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ س ف س اچھلتے دل سے کار میں بیٹھ گیا۔ شوفر کار کا دروازہ بند کرنے ہی والا تھا۔ کہ کار کے اندر جلتی روشنی میں اس کی نظریں س ف س کی گود میں جا پڑیں۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے قریب پہنچتے ہوئے پوچھا۔ "صاحب یہ کیا ہے؟"

"پرندہ مقبرے سے لایا ہوں۔" شوفر نے س ف س کا جواب سننے کے

بجائے اس کی چھنگلی پر بندھے سرخ ہوتے رومال کو دیکھ رہا تھا۔

"ہائیں۔۔ آپ کی انگلی کو کیا ہوا۔؟"

"کچھ نہیں۔" س ف س مسکرایا، "دوست نے کاٹ کھایا۔ چھنگلی کے عوض یہ مہنگا نہیں۔"

"صاب چھوڑ دیں اسے۔ یہ بہت خطرناک جانور معلوم ہوتا ہے۔"

"جانور؟ یہ پرندہ ہے بے وقوف۔ یہیں سے ہے۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا تم نے؟"

"نہیں صاب، آج تک نہیں دیکھا۔ کیا بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ اس کی ان میں اپنا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اس کی تلوار سی چونچ۔ توبہ، مجھے تو خوف آتا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں، اب یہ کچھ نہیں کہے گا۔ تم باتیں نہ بناؤ، ہوٹل چلو۔" س ف س نے بے صبری سے کہا۔

"پہلے ہسپتال نہ چلیں؟ آپ کی انگلی!"

"نہیں، معمولی زخم ہے، تم فوراً چلو۔"

"صاب میری مانیں تو۔۔"، شوفر اگلا دروازہ کھول کر اپنی سیٹ پر آ گیا۔

"او، بکو مت۔ تم چلو گے یا نہیں؟"

شوفر نے چابی گھمائی اور کچھ سوچ کر کہا: "صاحب آپ کے ملک میں چڑیا گھر والے تو اس کی بڑی قیمت دیں گے۔"

اس نے پیار سے پرندے کو دیکھا: "ہوں — فی الحال میں اسے گھر لے جا

کر کھلاؤں پلاؤں گا اور پھر۔ معلوم ہوتا ہے صدیوں سے بھوکا ہے۔"

شوفر نے کار سٹارٹ کی۔ پرندہ س ف س کو غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ کار چلنے لگی تو پرندے نے یک دم سر اُچک کر اس کے ہونٹوں پر وار کیا۔ کر کی ہونٹوں سے پھسل کر گال کو چیر گئی۔

"رکنا ذرا — یہ پھر شروع ہو گیا ہے۔"

شوفر انجن بند کر کے فوراً کار سے اترا اور پچھلا دروازہ کھولا۔ "صاحب اسے فوراً پھینک دیجیے۔"

پرندہ س ف س کی گود میں بے طرح پنجے مار رہا تھا۔ اسے قابو کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ بری طرح زخمی ہو گئے۔

"میری مدد کرو شوفر — بس — بس — قابو۔"

"میں اسے نہیں چھوؤں گا۔ اسے پھینک دیجیے۔ دیکھیے آپ کس طرح لہولہان ہو رہے ہیں۔"

"کیسے چھوڑ دوں — یہی تو میرے اتنے طویل سفر کا انعام ہے۔"

پرندہ دیوانہ وار تلوار چلا رہا تھا۔ پہلے زخم سے رومال کھل گیا تھا، چھنگلی باریک ریشے کے ساتھ ہاتھ سے لٹک رہی تھی۔

"بس — بس — میں تمہیں بہت کچھ کھلاؤں گا۔"

پرندے کے کان نہیں تھے۔ وہ چیختا ہوا اس کے بازوؤں پر وار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ پیازی کھال کے نیچے سرخ لہو میں مدوجزر تھا۔

"مدد —"

س ف س نے شوفر کو پکارا۔ شوفر نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھائے اور س ف س کی گود سے پرندے کو اٹھا کر پوری قوت سے باہر فٹ پاتھ پر پٹک دیا پرندہ پیٹھ کے سہارے گرا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے پنجے ہوا میں لرزے اور وہ پھر پلٹ کے پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ شوفر نے اسے ٹھوکر مارنے کے لئے پیر اُٹھایا۔ پرندہ ٹنڈ منڈ بازو اٹھا کر اپنے نئے مدِ مقابل کی طرف بڑھا شوفر بھاگ کر کار کی اوٹ میں ہو گیا۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ پرندہ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا اُچک کے کھلے دروازے سے کار پر چڑھ گیا۔ س ف س کی آنکھوں میں تاریک، خنک سرخ پھولوں سے لدے دھار تے جنگل اور پسینے، دھان اور بارود کی بو میں رچے رنگ ناچنے لگے۔

س ف س نے اپنے ہاتھوں سے وار کو روکنا چاہا لیکن پرندے نے اپنی گردن جھکا کر ہاتھوں کے نیچے سے اس کے سینے کو نوچ لیا اور نوچتا رہا۔ بڑی مشکل سے س ف س نے اُٹھ کر اسے ٹھوکر ماری اور ہانپتا ہوا لہو سے تر سیٹ پر گر گیا۔

اس نے نیلے کانچ سے بہتے اسرار پر پڑتے پردوں کی اوٹ سے دیکھا۔ شوفر پرندے کو ٹانگوں سے پکڑ کے فٹ پاتھ پر پٹک رہا تھا۔ پھر یک لخت کسی نے پتھر مارا۔ شوفر کا ماتھا پھٹ گیا اور وہ معصوم لڑکا، جس کی مسیں ابھی نہیں بھوٹی تھیں، جس کا چہرہ وہاں کی زمین تھا: سوندھی سوندھی باس، گندمی گندمی مٹی، نصف کرۂ ارض پر محیط، آگے بڑھا۔ اس نے شوفر سے پرندے کو چھین کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے سر کو چومتا ہوا ایک طرف کو ہو لیا

"جیو ڈاس۔" س ف س کے ہونٹ نقاہت میں لرزے۔ "سو ڈاکٹر۔ یہ ہے سارا قصہ۔"

"یو بلڈی باسٹرڈ۔"

ڈاکٹر نے زیر لب کہا اور مقامی خون سے بھری بوتل کی نالی کا کلیمپ کھول دیا۔

سیّدہ عفرا بخاری

پابہ جولاں

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس رات اندھیرے میں کسی پرچھائیں نے بڑھ کر اس کا گلا نہیں گھونٹا۔

گاڑھے اندھیرے میں وہ ٹٹول ٹٹول کر بستر تک گئی اور ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ لئے نرم تکئے کے گرد بازو لپیٹ کر کسی تھکے ہارے بچّے کی طرح اطمینان سے سو گئی۔

صبح اُٹھ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ابّا میاں کو بڑی سعادت مندی سے خط لکھ ڈالا اور لفافے کے اندر ایک عدد خاص طور پر منگوائی ہوئی تصویر بھی ڈال دی۔

ابّا میاں کو جب یہ خط ملا اور انہوں نے تصویر دیکھی تو مارے طیش کے انہوں نے خط اور تصویر کے پرزے کر کے انہیں چولھے میں جھونک دیا اور ہمیشہ کی طرح بگڑی تگڑی اولاد کا سارا الزام اماں کے سر تھوپ دیا۔ ابّا صحن میں چکر پھیریاں لیتے گرجتے رہے۔ کڑکتے رہے اور ماں سر جھکائے سوچتی رہیں۔ "آج ان کی گرج میں پسپائی ہے وہ پچھلے والی چمک کیوں نہیں۔"

"اب اگر اس گھر میں کسی نے اس کا نام لیا تو میں اس سے بھی نپٹ لوں گا!" ابّا بل کھاتے کمرے کے اندر چلے گئے۔

امّاں نے چولھے کے گرد بکھرے ہوئے پرزوں کو جوڑا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بڑے

اور زیادہ ٹکڑے تو آگ میں جل رہے تھے اور ان کے ساتھ مہندی کی خوشبو اور گلاب کے مسلے کچلے پھولوں کی مہک بھی بھسم ہوتی جا رہی تھی، اور ایک بوڑھا ہاتھ بیٹی کے ماتھے پر جھومر سجانے کی آرزو میں جھلس کر رہ گیا تھا۔

اماں کی جالا کھائی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ انھوں نے آنکھوں پہ پلو رکھا تو انہیں آنسوؤں کی دھندلاہٹ کے پیچھے یاسمین کی صورت دکھائی دی۔ جو خاموش دم سادھے کھڑی تھی۔ مگر اس کی کاجل بھری لمبی لمبی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"کیسی بے حیا دلہن ہے" اماں نے بے اختیار سر جھٹک لیا۔ اس کی تو سات پشتوں میں کسی لڑکی نے "قبول ہے" میں سر بھی اتنی بے شرمی سے نہ ہلایا ہوگا۔ جتنی بے حیائی سے یہ ڈائن اپنی شادی کا اعلان کر رہی تھی۔

رات ابا کسی زخمی چیتے کی طرح کمرے میں چکر لگاتے رہے۔ ان کے قدموں کی دھمک نے اماں کے آنسوؤں کا گلا گھونٹے رکھا اور وہ آواز دبا دبا کر ناک سنکتی رہیں — پھر رات رہے ابا میاں نے قلم دوات اٹھائی اور اسے خاندان کی لمبی ناک کا واسطہ دے کر لکھا۔

"مجھے سب کچھ منظور ہے۔ مگر تم گھر آجاؤ۔ تاکہ جو کچھ ہو سب کے سامنے ہو اور مجھے کل کو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہونا پڑے۔"

ابا میاں کا یہ خط مس یاسمین کو کوئٹہ میں ملا۔ تو خط کی طرف اس کا رویہ بظاہر سرد رہا۔ کئی روز تک یہ خط سربند ہی اس کے بڑے سے بیگ میں پڑا رہا اور وہ بڑی بے نیازی سے بیگ کو کندھے پہ جھلاتی سکول آتی جاتی رہی۔

ان دنوں ایک طویل کشمکش کے بعد اسے اپنی شخصیت میں سکون اور ٹھہراؤ

کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی تبدیلی کو سکول میں بھی محسوس کیا گیا تھا۔

ایک دن جب غالب کے ایک دلچسپ شعر کی تشریح کرتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ تو لڑکیاں جو اس کی سخت مزاجی کی عادی تھیں حیرت سے دم بخود ہو کر رہ گئیں۔

"سنا ہے مس یاسمین کی شادی ہو رہی ہے۔" اس کے جانے کے بعد ایک لڑکی نے انکشاف کیا۔

"تبھی مس یاسمین آج کل خوش نظر آتی ہیں۔" دوسری لڑکی بولی۔

"مسکراتے ہیں مس یاسمین کتنی پیاری لگتی ہیں۔" ایک اور لڑکی نے رائے ظاہر کی۔

لیکن اس دن اتنا خوش ہونے کے باوجود یاسمین نے ابامیاں کا خط نہیں کھولا۔

سعادت آپا ایک لمبا سفر طے کر کے اسے منانے آئیں تو وہ استعفےٰ لکھ چکی تھی۔ سعادت آپا اُلجھ گئیں۔ "ارے بھئی اگر سروس چھوڑنی اور بیاہ کرنا تھا تو بھلا ابامیاں کی بات کیوں نہ مان لی کیسے اچھے اچھے پیغام آئے تھے۔ امجد کیا بُرا تھا اور حامد اس وقت انگلستان میں بیٹھی عیش کر رہی ہوتیں۔ آخر اس بڈھے کھوسٹ ڈاکٹر میں تمہیں کیا نظر آیا ہے۔"

"ہشت" وہ غصے میں آگئی "خبردار جو اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا" آپا بھی اسے بال کاڑھنے اور ساڑھی باندھنے سے پہلے جانتی تھیں۔ اس لئے اس کے رعب میں آنے کو تیار نہ تھیں۔ فوراً برا مان گئیں اور لمبے سفر کی تھکان اتارے بغیر شام کی گاڑی سے واپس ہو گئیں۔

"سعادت آپا نے ٹھیک ہی کہا تھا" اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں

گھماتے ہوئے اس نے سوچا ——— آخر شادی ہی کرنی تھی تو نجم سے وہ کیوں ڈر کر بھاگ گئی تھی۔

لاہور میں مسز ہاشم کی وساطت سے وہ نجم سے ملی تھی اور پہلی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہو گئے تھے۔

نجم ایک دل کش اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا ماضی بھی اس کے حال اور مستقبل کی طرح درخشاں رہا تھا اور اس کا اپنا ماضی کیسا تاریک تھا۔ نجم سے اسے محبت تھی۔ مگر شادی کی بات نے اسے بدکا دیا تھا۔

جب مسز ہاشم نے نجم کی سفارش کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا تھا۔ تو اس نے پس وپیش کے بعد جواب دیا تھا۔

"شادی ایک رسک ہے" اور آج کل کے جوانوں کے پاس "ایٹی کیٹ" کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔"

"کیا مطلب" ——— مسز ہاشم نے چونک کر پوچھا ———

اور اس کی نظروں میں پچھلے دنوں کا ایک واقعہ گھوم گیا تھا ——— وہ نجم کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی ——— پکچر ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے "رش" سے فائدہ اٹھا کر ایک نوجوان نے کہنی کے ٹھوکے سے اسے گرا دیا تھا ——— نجم نے لپک کر اسے اٹھایا اور اپنے خوشبودار رومال سے اس کے کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہوئے وہ منہ سے "ایٹی کیٹ۔ ایٹی کیٹ" کہتا رہ گیا تھا ——— اسے نجم کے ردِ عمل پر مایوسی ہوئی تھی۔ یہ دوسرا امر تھا۔ اس سے پہلے وہ اباکے ساتھ سکول جایا کرتی تھی۔ اور ابا پاس سے گزرنے والے نوجوانوں کو عقاب کی نظروں سے گھورتے اور

انہیں پیٹنے کا بہانہ ڈھونڈا کرتے تھے کتنے ہی نوجوانوں کو انہوں نے پیٹا ہوگا۔ دبے پٹتے وقت نوجوان کیسے قابل رحم بلکہ قابلِ نفرت نظر آتے تھے) لیکن وہ کیوں اتنا آگے بڑھنے کی کوشش میں پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتی تھی کیا وہ چاہتی تھی کہ بھرے مجمع میں نجم اس نوجوان سے دست بگریباں ہو جاتا اور اپنے اعلیٰ درجے کے سلے ہوئے امریکن سوٹ کا ناس مار لیتا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ تو پھر کس بات نے اسے مایوس کر دیا تھا کہ اگلے دن اس نے نجم سے ملنے سے انکار کر دیا۔

"مطلب کچھ نہیں میں نے شادی نہ کرنے کا عہد رکھا ہے" مسز ہاشم خاموش ہو گئی تھیں۔ اب کل اسے مسز ہاشم کا خط ملا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس دن کی خاموشی آگ بن کر اس خط کے ایک ایک لفظ میں آ چھپی تھی۔ مسز ہاشم نے اس کی شادی کی خبر سن لی تھی اور اسے بڑے کڑے الفاظ میں لکھا تھا۔

"میں تمہارے اس ڈھونگ کو اسی وقت سمجھ گئی تھی۔ مگر میں اس وقت نہیں بولی تھی۔ لیکن اب صاف صاف کہتی ہوں کہ تم اپنے آپ سے خوف زدہ ہو۔ تم نے نجم کو اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ تم سے ہر لحاظ سے بہتر تھا اور تم خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ حالانکہ وہ تمہارے لئے بہت کچھ قربان کر سکتا تھا۔"

مسز ہاشم کا خط پڑھ کر وہ سناٹے میں آ گئی۔

یہ بات خود اس کے لئے بھی الجھی ہی ہوئی تھی۔ نجم سے محبت کرنے کے باوجود وہ اس کے قرب سے خوش نہ ہوتی تھی۔

ان دنوں اس کی ذہنی اور روحانی پریشانیوں کی انتہا نہ رہی تھی۔ رات رات بھر وہ برآمدے میں پریشان اور بے ترتیب قدموں سے گھومتی رہتی۔ اور جب بھی چین نہ پڑتا تو کمرے میں آ کر اباّ میاں کو بے حد اوٹ پٹانگ خط لکھتی۔

"میں نے پردہ ترک کر دیا ہے —"

"میں نے اپنے بال کٹوا دیئے ہیں۔ میں ساڑھی باندھتی ہوں۔

میں نے ایک کلب "جوائن" کر لی ہے۔ میں آپ کی مرضی سے کبھی شادی نہ کروں گی۔ آپ ایک مجرم ہیں۔ مجھے آپ سے نفرت ہے" —— یہ خط جب تک پوسٹ نہ ہو جاتے وہ بے چین رہتی۔ لیکن خط پوسٹ کرنے کے بعد بھی اسے سکون نہ ملتا اور اس کے دل کی اداسیاں کچھ اور بڑھ جاتیں۔

یہ خط پڑھ کر ابا میاں گھر میں چیختے اور گرجتے پھر رہے ہوں گے اور ایک کچے پکے بالوں والا اُترا ہوا چہرہ دھواں دیتی لکڑیوں پہ کچھ اور جھک جائے گا۔

ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا تھا اس نے بچپن سے لے کر اب تک گھر کے کونے کونے سے ابا کی تنہا اور اکیلی آواز کو گونجتے گرجتے چیختے اور چلاتے سنا تھا۔ اکیلی اور تنہا آواز جس کی گرج میں گھر کی ساری آوازیں سہمی پڑی تھیں۔

صبح جب وہ برقع میں لپٹی لپٹائی سکول جاتی تو یہ آواز کسی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتی اور جب وہ سکول میں اپنی بے حد "نیٹ" کاپی اُستانی کو دکھاتی تو یہ آواز بدستور اس کے ساتھ ہوتی اور وہ یوں سہمی ہوتی کہ استانی کو کئی بار کہنا پڑتا۔ "وہاٹ آ ریو سوشائی" —— اور وہ ساری لڑکیوں میں کسی حقیر اور

چھوٹی بچے کی طرح کھوئی ہوئی اپنی جگہ پہ آ کر بیٹھ جاتی۔

امتحان کے دوران بھی یہ آواز اس کے ذہن کو جکڑے رکھتی اور کلاس میں سب سے زیادہ ذہین ہونے کے باوجود وہ کبھی کوئی درجہ حاصل نہ کر سکی جب سالانہ امتحان کے بعد لڑکیوں کو انعامات دئیے جاتے اور اس سے کہیں کمتر درجہ کی لڑکیاں فخر سے سر بلند کئے انعام وصول کرتیں تو وہ پچھلی سیٹوں پہ بیٹھی حیرت بھری بے تعلقی سے ان کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔

اور یہ آواز اب بھی اس گھر میں اپنی اس گونج اور گرج کے ساتھ موجود تھی۔ اور اس گرج کے سامنے اب بھی ایک ستا ہوا چہرہ دھیمے دھیمے جلتی ہوئی لکڑیوں پر جھک جاتا تھا۔ اداس ہو جاتا تھا۔ یہ سوچ اس کا دم گھونٹ دیتی وہ اس آواز اور اس چہرے کے درمیان کسی پہاڑ کی طرح حائل ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ گھر سے دور تھی اور کئی سالوں سے گھر نہیں گئی تھی اور یوں گویا اپنے زعم میں اس نے اپنے ابا کی ہر پیش بینی کو غلط ثابت کر دیا تھا اور ان کی اپنے بارے میں ہر خوش فہمی کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

ابا۔۔ جنہوں نے اس کے گرد حفاظت کا ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار کھینچ دیا تھا اور اس یقین کی جڑیں اس کے اندر گہری اور پختہ کر دی تھیں۔ کہ اس کی ہر مشکل کا حل صرف ابا جانتے ہیں۔ وہ بیس برس تک ابا کی انگلی تھامے قدم قدم چلتی رہی اور اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی رہی۔ لیکن پھر شعور کی پختگی اور علم کی روشنی اس کے کھلم کھلا اعتراف میں مانع ہو گئی اور وہ اوپرے دل سے ان لغویات پہ ہنسنے لگی۔

ابا تو ایک مجرم تھے جنہوں نے اس کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اسے اپاہج اور مفلوج بنا دیا تھا وہ اپنی اس کچلی ہوئی شخصیت کو نئے سرے سے تعمیر کرے گی۔

اور ایک دن جب اس نے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپاتے ہوئے۔ "اپائنٹمنٹ لیٹر" ابا کے سامنے رکھا تو ابا کی گھورتی اور پسپا کر دینے والی نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے سر جھکا دیا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ کبھی نہیں ہو گا۔" ابا نے "اپائنٹمنٹ لیٹر" زمین پر دے مارا تھا۔

"تم تنہا اتنی دور کیسے رہو گی — تمہیں اس دنیا کا کیا تجربہ ہے۔ تم اس دنیا کو کیا سمجھ سکتی ہو، جسے آج تک تم نے دیکھا بھی نہیں — چین سے گھر بیٹھو۔" — سچ مچ وہ تو کنوئیں کا مینڈک ہی تھی — مگر ابا کے ان الفاظ نے اس کے اندر سوئے ہوئے جذبہ حمیت پر چوٹ لگا دی تھی۔ وہ بلبلا اٹھی اور اس نے اسی لمحہ ابا کی ہر بات کو جھٹلا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آخر ایک دن اس نے ابا کے کھینچے ہوئے حصار کو پار کر لیا — لیکن گھر سے نکل کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ مدتوں اپنے آپ کو ڈانواڈول اور بے سہارا محسوس کرتی رہی۔ انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی بچہ بغیر سہارے کے ڈول رہا تھا۔ گر رہا تھا۔ ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ وہ بار بار دل چھوڑ بیٹھی۔ یہ ساری دنیا اس کی بیری کیوں ہو گئی تھی۔ سٹاف ممبر اس کے خلاف تھیں ہیڈ مسٹرس اس کی دشمن تھیں۔ اور لڑکیاں جو اسے ہمیشہ اپنے سے بہتر خوبصورت اور پر اعتماد نظر آتی تھیں وہ بھی اس کی پرواہ کرتی تھیں۔ یہ دنیا اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود اس کے لئے بے مہار اور تنگ ہوتی جا رہی

تھی۔ اسے آپا یاد آتے رہے اور وہ ان کی ہمہ گیر قوتوں کی نئے سرے سے قائل ہونے لگی اور وہ سوچتی ـــــ گھر جن کے دروازوں پہ آپا پہرہ دے رہے ہوں کتنے محفوظ ہوتے ہیں۔

پھر ایک دن اچانک اسے سعادت آپا مل گئیں۔

"ارے یہاں ہوسٹل میں کیوں پڑی ہو۔ چلو گھر" آپا نے اپنائیت سے کہا۔ تو وہ بے اختیار آپا کے گلے میں جھول کر رو پڑی۔ جیسے کسی کھوئے ہوئے بچے کو گھر کی راہ مل جائے اور وہ موجودہ خوشی اور پچھلے غم کو یاد کرکے رو پڑے۔

"حد ہے بچپنے کی" آپا نے بڑے مربیانہ انداز میں اسے تھپکا۔

پھر وہ کسی کی حفاظت میں جا رہی تھی۔ سامان باندھتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔

"اب ان کو تم ہی نے سنبھالنا ہے" اپنے آدھے درجن بچوں سے بڑا بے ڈھنگا سا تعارف کروا کے آپا نے کہا اور وہ اتنے سارے بچوں میں گھری گھبرا گئی تھی۔ کوئی اس کے بالوں کو تھپک رہا تھا۔ کوئی اس کے لباس کو چھو رہا تھا اور کسی نے اس کی چیزوں کی تلاشی شروع کر دی تھی اور مارے مروت کے مسکراتے مسکراتے اس کے جبڑے دکھنے لگے تھے۔

"آنٹی کہانی سنائیے" بچوں کے نئے مطالبے نے اسے بالکل بوکھلا دیا۔ بھلا اس نے کب کسی سے کوئی کہانی سنی تھی۔ اماں کو بچوں میں گھر کر بیٹھنے کی کبھی فرصت ہی نہ ملی۔

رات کو سارے بچوں کے ساتھ اماں کی چارپائی بچھی تھی۔ جب تک اماں نہ آتیں۔ وہ جاگتی نانی اماں کام نپٹا کر آتیں تو اسے کتنی خوشی محسوس ہوتی۔

کہانی کی تو کبھی نوبت نہ آئی۔ مگر وہ اتنی سی بات اور اتنی ذرا سی دیر کے لئے خوش ہو جاتی۔

پھر ابّا بیٹھک سے اُٹھ کر باورچی خانہ میں آتے اور ان کے کھانسنے کھنکھارنے کی آواز سنتے ہی چپکے سے بتی بجھا دی جاتی۔ تب بہت سی آڑی ترچھی بچھی ہوئی چارپائیوں کے درمیان بچھی ہوئی چارپائی کی پٹی سے چمٹی وہ تنہا رہ جاتی۔ اماں کی چارپائی بھی اندھیرے میں غوطہ لگا جاتی اور اندھیرے کمرے کی خاموشی اور سکوت میں اس کا دل خوف سے بھاپ اڑاتے انجن کی طرح دھک دھک کرنے لگتا۔ جانے کب تک وہ بنا پلک جھپکے جاگتی رہتی۔ پھر ہولے ہولے کمرے میں آوازیں جاگنے لگتیں۔ پُراسرار دبی دبی آوازیں جانے کون تھا وہ کمرے میں یہاں سے وہاں ہر چارپائی پر منڈلاتا پھرتا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی مگر اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا اور کوئی بے آواز چلتا اس کی چارپائی کے قریب رکتا اور اسے سر سے پاؤں تک کپڑے سے ڈھانپ دیتا —— کیا وہ مر چکی ہے؟ —— خوف سے اس کا جی چاہتا ایک لمبی چیخ مار کر باہر بھاگ جائے۔ مگر ابّا کا خوف اس کے قدم روک لیتا اور وہ پٹی سے چمٹی لمبی آنکھیں بازوؤں میں چھپا لیتی۔

بس یہی ایک پُراسرار آہٹوں کی ناقابلِ فہم کہانی تھی جو اس نے سنی نہیں بلکہ محسوس کی تھی اور جو آج تک اس کے ذہن پہ چھائی ہوئی تھی۔

"مجھے کوئی کہانی نہیں آتی"، اس نے شکست خوردہ ہو کر کہا تھا —— اور آپا بچوں کی کمک کو فوراً پہنچ گئیں ——

"واہ یہ کیسے ممکن ہے اتنی ساری کتابیں پڑھتی ہو اور کہانی نہیں آتی۔"

"ان کتابوں میں لکھی ہوئی کہانیاں سب کی سمجھ میں نہیں آسکتیں" اس نے آپا پر برتری جتانے کی کمزور سی کوشش کی۔ مگر آپا ذرا بھی مرعوب نہ ہوئیں اور اس کے بیان کو غلط گردان کر ڈانٹا رسید کرنے کے انداز میں بولیں۔

"چلو بچو آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ دل ہی دل میں اپنی نااہلی پر افسوس کرتی رہ گئی۔

رات کو اس کا بستر بچوں کے کمرے میں لگا یا گیا (آپا کی نظر میں وہ بچوں کی طرح غیر اہم تھی)

"بچے اکیلے سوتے تھے اور ڈرتے تھے۔ چلو اچھا ہوا تم آگئیں۔" آپا کھسک گئیں اور وہ حیرت زدہ سی کئی سالوں کے بعد خود کو کئی آڑی ترچھی چارپائیوں کے درمیان تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ والا کمرہ "کھٹک" کی آواز کے ساتھ اندھیرے میں ڈوب چکا تھا اور اس کی سماعت میں کہیں چھپ کر سوئی پر اسرار اور مبہم آوازیں مدتوں بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے اس کے عقب میں کوئی کھڑا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر وہ پھر مطمئن نہ ہو سکی۔ کسی کے موجود ہونے کا جیتا جاگتا احساس برقرار تھا پھر جیسے کسی نے دبے قدموں آگے بڑھ کر اسے کپڑے میں لپیٹ دیا۔ ایک جھٹکا مار کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بچے سو رہے تھے اور بتی جل رہی تھی۔ اس نے بغیر آواز پیدا کئے اپنی چیزیں سمیٹ کر بکس میں بند کیں۔ اگلی صبح وہ واپس ہوسٹل آگئی۔

ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے۔ جانے کتنے شہر گھومتی پھری۔ کئی سالوں بعد جب وہ لاہور آئی تو اس کی شخصیت میں ذرا بھر تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہ اب بھی ویسی ہی کمزور شخصیت کی مالک تھی۔ اب بھی لڑکیاں اسے اپنے سے بہتر نظر آتی تھیں اور سٹاف ممبران اس سے نفرت کرتی تھیں ہیڈ مسٹرس اس کی دشمن تھی وہ اپنے خول میں سہمی سکڑی بیٹھی تھی۔

لاہور میں مسز ہاشم اس کی روم میٹ بنی۔ اس کا خاوند ایک سال سے لندن میں مقیم تھا اور وہ ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔

پہلی ہی رات اس نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ مسز ہاشم سے کہا۔

"مجھے اندھیرے میں نیند نہیں آتی۔ اگر آپ کو روشنی پر اعتراض ہو تو میں برآمدے میں چارپائی بچھا لوں۔" مسز ہاشم اس کی بات سن کر مسکرا دی تھی۔ اور اسے اس وقت احساس ہوا تھا کہ اس نے مسز ہاشم پر اپنا پہلا اثر غلط چھوڑا ہے لیکن مسز ہاشم اس کی بڑی اچھی دوست ثابت ہوئی۔

سکول ختم ہونے کے بعد وہ اکثر کمرے کے اندر کرسی میں دھنسی کوئی کتاب پڑھتی رہتی شام کو مسز ہاشم اور وہ دونوں لان میں چائے پیتیں۔ چائے کے بعد مسز ہاشم کسی نہ کسی بہانے ہیڈ مسٹرس کے کوارٹر کا ایک چکر ضرور لگاتی۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دوسری استانیاں بھی شام کو ہیڈ مسٹرس کے کوارٹر پر حاضری دیتی ہیں لیکن خود اس کی کبھی ہمت نہ پڑتی۔ کہ ہیڈ مسٹرس کے کوارٹر تک جاتی آفس میں ہیڈ مسٹرس کا رویہ بڑا روکھا اور حوصلہ شکن ہوتا تھا۔ مگر وہ مطمئن تھی۔ وہ کام پورے خلوص سے کر رہی تھی۔ مگر اس کی پہلی رپورٹ

خراب گئی۔ اور آئندہ انسپکشن میں جب انسپکٹرس نے اسے وارننگ دی تو وہ بے حد مایوس اور شکستہ خاطر ہو گئی۔

اس دن مسز ہاشم نے اسے اداس دیکھ کر پہلی بار مشورہ دیا۔

"اپنی شخصیت میں لچک پیدا کرو۔ یوں زندگی میں الگ تھلگ رہ کر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔"

"میں خوشامد نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر دوسروں کی زیادتیوں کو سہہ جانے کی ہمت اور حوصلہ اپنے اندر پیدا کرو۔"

مسز ہاشم کی یہ بات بہت دنوں اس کے ذہن پر چھائی رہی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ترڑی مڑی شخصیت میں توازن اور ہمواری پیدا کرے گی لیکن اس کے لئے اپنی ذات پر بھروسے اور اعتماد کی ضرورت تھی۔

ایک دن جب وہ لیڈیز سیلون سے بال کٹوا آئی تو اس کے خلاف سکول میں خوب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ مگر اس دن مسز ہاشم اس کی جرأت پر بہت خوش تھی۔ اور شام کو چائے پیتے ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے فقروں کے درمیان "بہت اچھے، بہت اچھے" کہتی رہی۔ اس پہلے قدم کے بعد وہ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھاتی چلی گئی۔ جھجکتی جھجکتی مگر بغیر رکے۔ . . . پردہ چھوڑا۔ کلب جوائن کی۔ امریکن فلمیں دیکھیں۔ اونچے بلاؤز پہنے۔ اور نفیس ساڑھیاں باندھیں۔

سکول میں اس کے خلاف چہ میگوئیاں ہوتی رہیں مگر وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھتی گئی۔

اب وہ ہر شام مسز ہاشم کے ساتھ ہیڈ مسٹرس کے کوارٹر میں حاضری بھی دیتی۔ اور اس کے بچوں کے لئے روزانہ کوئی چیز بھی لے کر جاتی۔ اب ہیڈ مسٹرس اس سے خوش تھی۔ اور اس کے خوش ہونے سے باقی سٹاف اس سے دبنے لگا تھا۔ لڑکیاں بھی اب اس سے دبنے لگی تھیں۔ کیونکہ اب جب وہ کلاس میں جاتی اس کے ہاتھ میں موٹا رول ہوتا۔ اور وہ ذرا ذرا سی غلطیوں پہ انہیں بے دردی سے پیٹتی۔ خوبصورت چنچل اور حسین لڑکیاں جب اس کے سامنے خوف سے کانپتیں تو اس کی شخصیت کی جھولیں جیسے کستی چلی جاتیں۔

لیکن کسی دن یوں بھی ہوتا کہ اس کی گرفت اپنی ہی شخصیت پہ ڈھیلی پڑ جاتی۔ اس دن اچانک کلاس کی لڑکیاں پھیل کر بڑھ کر اس پر چھا جاتیں اور وہ بورڈ پر ایک لفظ لکھ کر اس پر چاک سے تکرار کئے جاتی اور مڑ کر لڑکیوں کا سامنا کرنے سے گھبراتی۔

اس دن پچھلے ڈسکوں پر بیٹھی لڑکیاں ایک دوسرے کو ٹھوکا دے کر منہ ہی منہ میں ہنستیں۔

"آج پھر مس کو دورہ پڑا ہے۔ آج سب کی خلاصی ہو جائے گی۔"

اور اس دن سچ مچ کسی لڑکی کو سزا نہ ملتی اور وہ عموماً سبق ادھورا چھوڑ کر کلاس سے چلی جاتی۔ اور جاتے دروازے میں کھڑے ہو کر یہ بھی نہ دیکھتی کہ اس کے احترام میں سب لڑکیاں کھڑی ہوئیں یا نہیں۔ یونہی دن گذر گئے اور وہ لوٹ کر گھر نہ گئی۔ ابا اسے التجاؤں بھرے خط لکھتے رہے اس کے اوٹ پٹانگ خطوں کے جواب دیتے رہے۔ اور وہ ابا کے ان خطوں میں کچھ ڈھونڈتی رہتی اور

مایوس ہوتی رہی۔ پھر نجم اسے ملا۔ اور اُسے یقین ہو گیا کہ لمبے رنگے ہوئے ناخن۔ کٹے بال۔ اونچے بلاؤز اور نفیس ساڑیاں شخصیت کے جھول ڈھانک تو سکتی ہیں مٹا نہیں سکتیں۔ اور وہ قطعی مایوس ہو گئی۔

"آخر تم شادی کیوں نہیں کر ڈالتیں۔" ایک دن چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مسز ہاشم نے کہا۔

"شادی ایک بڑی آزمائش ہے۔" اس نے چہرے کی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے چائے کے پیالے میں منہ چھپا لیا۔ آج کل کے جوان اپنی عورت کی حفاظت کے ضامن نہیں ہوتے۔

"تمہارے ابا اس پر پورے اترتے ہیں۔" مسز ہاشم نے رسانیت سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے چمک کر پیالی میز پر ٹیک دی۔ ایک یہی بات تو اسے ابا کی پسند تھی۔

ابا جن کی آواز کی گونج سے اس کا دل دہل جاتا تھا۔ جن کی پُر رعب شکل دیکھ کر بچے کونوں میں دبک جاتے تھے اور جن کی شخصیت کا دبدبہ سارے محلے پر چھایا ہوا تھا۔ ابا۔ جنہیں رات کو سوتے میں اس نے مارے نفرت کے کئی بار گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ لیکن صبح کو صرف اس خیال سے ہی دہل جاتی تھی کہ اگر ابا سچ مچ مر گئے تو ان کی حفاظت کون کرے گا۔ ابا کی چھپی ہوئی قوتوں کا اسے شدید احساس تھا۔

"تو پھر"، مسز ہاشم نے پوچھا تھا۔

"تو پھر آج کل کے نوجوانوں میں ارادے کی پختگی۔ شخصیت کی مضبوطی، کردار کی بلندی اور دل کا اعتماد و حوصلہ کہاں موجود ہے؟ ان کے پاس تو صرف تہذیب کی چھچھوندر رہ گئی ہے۔"

"یہ صرف ڈھکوسلے ہیں۔" مسز ہاشم اکتا گئی تھی۔ "تجھ میں کیا کمی ہے۔"

اور اس نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اور مسز ہاشم ہوسٹل میں تنہا رہ گئیں۔ ایک دن چپ چپاتے ابا آدھمکے۔ کتنے سال گذر چکے تھے۔ مگر ابا کا خوف اب بھی اس کے دل میں دبکا پڑا تھا۔ ابا کی خونناک آنکھوں کی زد میں وہ کسی زخمی چڑیا کی طرح ڈر کر سمٹ گئی۔

ابا کا جسم اتنے سالوں میں ڈھل گیا تھا۔ وہ پہلا سا دم خم باقی نہ تھا۔ لیکن شاندار عمارت کے کھنڈر بھی شاندار تھے۔

اس نے چپکے سے ابا کا جائزہ لیا۔ اور اس کا جی چاہا۔ اتنے سالوں کی حکم عدولی کی بنا پر ابا اس کے منہ پر تڑاک سے ایک تھپڑ کھینچ ماریں۔ ایک سرشاری میں اس کا دل کانوں کے پاس آکر دھڑکنے لگا۔ جیسے اسی ایک لمحے کے انتظار میں اس نے اتنے سال تنہائی اور اداسی میں ڈانواں ڈول گزارے تھے۔

"تم اس بار بھی چھٹیوں میں گھر نہیں آئی ہو۔" ابا ٹھنڈے روپ میں بول رہے تھے۔ "طاہرہ کی شادی ہو رہی ہے، تم بھی دو چار دن کے لئے آجانا۔"

اس نے عمر میں پہلی بار نظر بھر کر ابا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ بچپن میں کتنی بار اس کا جی چاہا تھا کہ کسی طرح اپنے آپ کو ابا کے وجود میں جما کر ناقابل تسخیر قلعہ

کی مانند تھا گم کر دے تاکہ اسے زندگی کے ہر دکھ اور خوف سے ہمیشہ کے لئے
نجات مل جائے۔ لیکن یہ ابّا وہ ابّا تو نہیں تھے۔ ان کی آواز ایسی پست تو کبھی نہ تھی
اس کے یقین کی دنیا ڈول سی گئی تھی۔

بستر پہ اوندھے منہ لیٹی ہوئی وہ سارا دن روتی رہی۔ یوں اچانک طور پر
بے سروسامان ہو جانے کا احساس اسے کچوکے دیتا رہا۔ مسز ہاشم اسے چپ کراتے
کراتے تھک کر چلی گئی۔ آدھی رات کو تیز بلب کے نیچے جانے وہ کب سو گئی
پھر ایک دم دل کی ہوک کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔ تنہائی کے ٹھاٹھیں مارتے
سمندر میں وہ کسی وزنی شے کی طرح ڈوبی جا رہی تھی۔

اسی مایوسی اور بددلی میں وہ لاہور چھوڑ کر کوئٹے چلی گئی۔ لیکن جس چیز کو وہ
جگہ جگہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی وہ چیز تو یہاں بھی نہ تھی۔ یہاں ہوسٹل کے بجائے
اس نے مس اختر کے ساتھ الگ کرائے کے کوارٹر میں رہنا شروع کر دیا۔

پہلے ہی دن سامان ٹھکانے لگا کر غسل خانے میں نہانے کے لئے گئی۔ ابھی
اس نے نل کھولا ہی تھا۔ کہ برابر والے کوارٹر کے ملحقہ غسل خانہ سے کسی نے
بھدی سی گرج دار آواز میں اسے ڈانٹا۔

"نل بند کرو۔" اس نے فی الفور نل بند کر دیا۔ مگر خود سر سے پیر تک لرز گئی۔

دونوں غسل خانوں کے درمیان صرف ایک پتلی سی دیوار حائل تھی۔ کوئی چاہے
تو دیوار سے جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے ننگے جسم کو سمیٹ کر گھبرائی ہوئی
نظروں سے اوپر دیکھا۔

اب کسی نے دوسری طرف چھپ کے اڑا اڑا کر نہانا شروع کر دیا تھا ایک

بار جو جھاگ ملے پانی کے قطرے اس کے دہکتے سنہرے جسم پر آ کر پڑے تو کراہیت محسوس کرتے ہوئے وہ چونک پڑی۔ جلدی سے وہ ساری لپیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔

ساتھ والے کوارٹر میں کوئی کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ کسی چیز کے زور سے پٹکنے کی آواز آئی۔ یہ آوازیں تو وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی ان آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایک طوفان برپا تھا اور جذبات کی دنیا تہ و بالا ہو رہی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ یہ کیا ہونے والا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

ایک دن۔ دو دن۔ تین دن گزر گئے وہ کھوئی کھوئی اداس اور منتظر تھی۔ کئی بار مس اختر نے اس سے یوں چپ رہنے کی وجہ پوچھی مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔

دن میں خلافِ عادت وہ کئی کئی بار اپنا جائزہ لیتی۔ کبھی برآمدے میں ساکت بیٹھی منہ کے سامنے رسالہ پھیلائے بیرونی دروازہ کی طرف دیکھتی رہتی۔ اور اس کا دل دھڑکتا رہتا۔ کئی دن گزر گئے۔ اور وہ مایوس سی ہو گئی۔ پھر ایک دن سکول سے آتے ہوئے وہ بلاوجہ ساتھ والے کوارٹر کے دروازے پر ٹھٹک گئی۔ دروازہ کھلا تھا ایک لڑکا برآمدے میں کھڑا مہر بھجا رہا تھا۔

"اے ذرا بات سن" اس نے بڑی ہمت سے آواز دی۔ اسے دیکھ کر لڑکا آگے آیا۔ وہ گھبرا گئی مگر پھر سنبھل گئی۔

"اس کوارٹر میں کون رہتا ہے!"

"ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں۔"

"آج یہاں نہیں ہیں!"

"وطن گئے ہوئے ہیں۔"

"اور ان کے بیوی بچے؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"بیوی بچے نہیں ہیں" وہ لوٹ آئی اور دیر تک پریشان ہوتی رہی۔ بھلا وہ وہاں کیوں گئی تھی۔ اور یہ سب پوچھنے سے اس کا کیا مطلب تھا؟

کئی دن گذر گئے ایک دن کچن میں کھانا کھاتے ہوئے۔ اس کا انتظار جاتا رہا۔ کوئی زور زور سے اپنی بے ہنگم آواز میں چیخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ آواز بند ہو گئی اور ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھا گیا۔ اور اس سناٹے میں اس کا دل سائیں سائیں کرنے لگا

"ارے کیا سو گئی ہو، کھانا تو کھا لو" مس اختر نے اسے جھنجھوڑا تو وہ چونک پڑی "کیسی بھدی اور مکروہ آواز تھی" اس سے مس اختر سے زیادہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

"پورا شیطان ہے یہ کمبخت ڈاکٹر بھی" وہ چپ سنتی رہی اور بے توجہی سے نوالہ نوالہ کھاتی رہی۔ اس رات تیز بلب کے نیچے سوتے ہوئے اچانک وہ بیدار ہو گئی آدھی رات کو ڈاکٹر غالباً اپنی لیبارٹری میں مگن کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے مس اختر کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی۔ وہ پولے سے اٹھی اور ننگے پاؤں صحن میں نکل کر دیوار کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

رات اپنا سیاہ لبادہ تانے ایستادہ تھی۔ جب وہ سنبھلی تو اسے اپنے آپ سے خوف آیا۔ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کیوں ننھی بنتی جا رہی ہے۔ وہ جھلا گئی اور دیوار کی طرف نفرت سے تھوک کر اندر آ کر سو گئی۔

اس شام اچانک اس کے کان میں درد شروع ہو گیا۔
کان کو سینک کر اور لپیٹ کر وہ سرِ شام بستر میں پڑ گئی۔ مگر درد بڑھتا جا رہا تھا۔ اور برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔
"ڈاکٹر کو دکھا دو۔" مس اختر نے مشورہ دیا تو وہ ایک دم بھڑ سی گئی
"میں تو اس کے پاس کبھی بھی نہ جاؤں" اس نے تنک کر کہا۔
"کیوں۔" مس اختر نے "پوسٹ" کا ورق اُلٹتے اُلٹتے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور وہ گھبرا گئی۔ "وہ بس یہی۔"
"تو پھر چلی جاؤ رات کو تنگ ہو گی۔"
وہ دہلیز پر ٹھٹک گئی اور اس کا جی چاہا وہ فوراً الٹے پاؤں بھاگ کھڑی ہو۔ سامنے ہی ادھیڑ عمر اور مضبوط قد کاٹھ کا ڈاکٹر کھڑا اسے سوالیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔
"میرے کان میں درد ہے۔" اس نے بمشکل گلے کو تھوک سے تر کیا۔
اس کا جسم سرد پڑتا جا رہا تھا۔ اور نبض کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔
اسے اپنی اس بوکھلاہٹ پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ تو آدمیوں کے ساتھ بڑے ٹھنڈے جذبات کے ساتھ ملنے کی عادی تھی۔ پھر اس وقت ڈاکٹر کی تیز اور گہری نظروں کے سامنے وہ کیوں پگھلتی جا رہی تھی۔
"ادھر تشریف لے آیئے۔" ڈاکٹر نے نرمی سے لہجے میں کہا۔ وہ ٹیوب میں کوئی محلول ڈالے اسے ٹسٹ کر رہا تھا۔ موٹے شیشے کی عینک اس کے چہرے کو بارعب بنا رہی تھی۔ جب تک ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس آتا وہ چپکے چپکے ڈاکٹر کا جائزہ لیتی رہی۔

"کس کان میں درد ہے" ڈاکٹر ایراسکوپ (EAR SCOPE) لئے اس کے پاس آیا تو وہ چونکی۔ ڈاکٹر ایرسکوپ لئے اس کے کان پہ جھکا ہی تھا، کہ اچانک بجلی کی لائن خراب ہو گئی۔ اور کمرہ اندھیرے میں گویا غوطہ کھا گیا۔

"یہ کیا ہوا۔" اس نے گھبرا کر ڈاکٹر کا بازو پکڑ لیا کئی سالوں بعد آج وہ پھر ایک بار اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اور اس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔

"آپ تو بچوں کی طرح ڈر گئیں۔" بجرد لپسند ڈاکٹر نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک عورت کا لمس اس کے لئے بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا

"مجھے چھوڑیئے میں موم بتی جلائے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

مگر وہ تو اس وقت بہت سی آڑی ترچھی چارپائیوں کے درمیان تنہا اور اکیلی اپنی چارپائی کی پٹی سے چمٹی ہوئی تھی۔

ایک رات ابا نے اسے اماں کی چارپائی سے اٹھا کر دوسری چارپائی پہ دے پٹکا تھا۔ غم اور خوف سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ چیخ کر رو نہ سکی تھی۔ اور وہ چیخ اب تک اس کے سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کیسے بولتی۔ اس کی انگلیاں تیز پنجوں کی طرح ڈاکٹر کے بازو میں گڑی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر کچھ دیر بوکھلاہٹ اور پریشانی میں ساکت کھڑا رہا۔ پھر جیسے اس کی قوتِ مدافعت بھی اس عجیب و غریب ماحول سے شکست کھا گئی تھی۔ اجالا ہوتے ہی دونوں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ وہ کان کی درد کو بھول کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی، تو ڈاکٹر

نے اس کا راستہ روک لیا۔

میری عمر اڑتالیس سال ہے۔ آج تک میں نے عورت کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ میں اسے ہمیشہ ایک ناکارہ بنا دینے والا نشہ سمجھتا تھا۔ لیکن آج اس آزمائش میں میری ہمت جواب دے گئی۔ اور میں ایک عورت کے ہاتھوں، شکست کھا گیا۔ کیا تم میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

فلزیں جھکائے سر پر ساڑھی کا پلو درست کرتے وہ ہلکی سی مسکرائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

بہت دنوں بعد ابا کے اس خط کو اس نے اپنے بڑے سے بیگ میں سے نکال کر پڑھا۔ اس کا خیال تھا۔ ابا نے اسے خوب پھٹکارا ہو گا۔ لیکن یہ تو وہی پرانی التجائیں تھیں۔ اس دن ابا اسے ایک سات پردوں والی گیند کی مانند نظر آئے جس کا ایک ایک پردہ چوٹ کھاتے کھاتے ادھڑ گیا تھا۔ اور اندر کا خلاء صاف نظر آ رہا تھا۔ حفاظت کا وہ کھنچا ہوا حصار جانے کب کا کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس انکشاف نے اسے نہ مایوس کیا نہ مدِ دل۔

بڑی بے نیازی سے اس نے ابا کے خط کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

ڈاکٹر عبدالرحیم عجمی

خون کا داغ

آج سے اٹھارہ سال پہلے جب میں نے پشاور میں وکالت شروع کی تو مجھے دفتر کے لئے بازار قصہ خوانی یا اس کے باہر کابلی دروازہ کے پاس کوئی جگہ نہ ملی۔ یہ مشہور و معروف بازار اپنی دیگر بے شمار خصوصیتوں کے علاوہ اب وکالت کا بھی مرکز بن گیا ہے۔ کئی مہینوں کی کوشش کے بعد ایک بے حد بوسیدہ لکڑی کا بالاخانہ جو قریباً کھنڈر تھا۔ اور مدّت سے غیر آباد پڑا تھا، ملا۔ یہ بالاخانہ قصہ خوانی بازار کی ایک ٹوٹی پھوٹی چائے کی دوکان کی بالائی منزل پر واقع تھا مگر اس کا راستہ بغل کی گلی میں ہے، جسے اب بازارِ گل فروشاں کہتے ہیں۔ یہ بازار کبھی بازارِ حسن تھا۔ جو اب مدّت سے ٹھنڈا پڑا تھا۔ رفتار زمانہ نے یہاں کے حسینوں کو صدیوں کے بعد بے گھر اور در بدر کر دیا۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھنؤ کے چوک بازار اور وہاں کے بازار حسن کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر حق بات یہ ہے کہ پشاور کا بازار حسن بھی اپنے زمانے میں بے مثل تھا۔ اور وہاں پر ہر عمر اور ہر ولایت کے حسین

پائے جاتے تھے اور اسے کئی لحاظ سے بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ سکھوں کے زمانے میں ایک انگریز سیاح لکھتا ہے۔ کہ اس بازار میں قریباً چار ہزار سے زیادہ عورتیں تھیں۔ اور قریباً ہر ملک کی عورت، وہاں پائی جاتی تھی۔ اس داستان کا کچھ تعلق پشاور کے بازارِ حسن اور لکھنؤ سے ضرور ہے۔ مگر دراصل یہ ایک عجیب و غریب سرگزشت ہے۔ اس میں آپ تاریخ لکھنؤ کے ایک از حد دردناک اور خونین دور کی جھلک پائیں گے۔

جب میں نے اس بالاخانہ میں اپنا دفتر کھولا۔ تو اس کی بری حالت تھی۔ بوسیدگی کے علاوہ یوں لگتا تھا کہ صدیوں کی گرد اور میل اس کے در و دیوار پر جمی ہوئی ہے۔ کئی دن تک مزدور اس کے فرش اور در و دیوار کو دھوتے رہے۔ چاروں طرف دیواروں میں لکڑی کی الماریاں تھیں، جن پر بہت خوبصورت نقش و نگار تھے جو میل اور گرد میں چھپے ہوئے تھے، اور دھونے سے نکل آئے تھے۔ کھڑکیوں کی بجائے لکڑی کے تختے تھے۔ جنہیں پشاور میں "عروسیاں" کہتے ہیں۔ شائد یہ عروس کے جھانکنے سے کچھ تعلق رکھتی ہوں۔ کسی زمانے میں پشاور اس نفیس لکڑی کے کام کے لئے مشہور تھا۔ بالاخانے کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔ جو دھونے سے چمک پڑا۔ مگر اس کے عین وسط میں بڑا سرخ داغ تھا۔ جو باوجود کئی بار دھونے کے نہ چھٹا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خون کا پرانا داغ ہے جو فرش کی لکڑی میں رچ کر اس کا جزو بن گیا۔ کس کا خون؟ یہ ایک معمہ تھا، جس کے متعلق میں نے بہت دریافت کی۔ مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ بجلی کی روشنی بھی چھت کے عین وسط میں آویزاں تھی۔ اور سیدھی اس پُراسرار داغ پر پڑتی تھی، جس سے

وہ چمکنے لگتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ تازہ خون ہے۔ اسے چھپانے کے لئے میں نے اس پر ایک چھوٹا سا پرانا قالین ڈال دیا۔ مگر یہ چند دن کے بعد چوری ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے وہاں ایک کرسی ڈال دی۔ ساتھ ہی میری میز تھی۔ جس پر میرے کاغذات اور چند قانونی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ داغ کو چھپانے والی کرسی کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ جو کوئی اس پر بیٹھتا تو وہ میز کی دوسری طرف میرے آمنے سامنے ہوتا۔ اور اس کی پشت کی طرف اور میرے سامنے دیوار میں ایک نہایت ہی خوبصورت کشمیری ساخت کی لکڑی کی الماری تھی جس میں ایک قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ جو اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ اس الماری میں میرے منشی صاحب اپنے کاغذات و بستہ رکھتے تھے۔ بالاخانہ کی طرح میرے منشی صاحب بھی از حد خلیق تھے۔ اور رک رک کر قدرے لکنت سے باتیں کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شائد کبھی ان کے دشمنوں کی زبان پر خفیف سا فالج کا دورہ پڑا ہو۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ان کی چرب زبانی بے مثال ہوتی۔ ایک دفعہ اگر مقدمے والا ان کے ہاتھوں میں چڑھ جائے، تو پھر اس کم بخت کی زندگی بھر نجات مشکل تھی۔ ہتھیلی پر سرسوں اگانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مگر ان کی ہکلائی ہوئی باتیں نہایت ہی دلچسپ ہوتی تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں قصہ خواں تھے۔ پشاور شہر اور خاص کر قصہ خوانی بازار کے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ وہ ہر روز آہستہ آہستہ اپنے مخصوص انداز میں ایک نہ ایک پرانی کہانی چھیڑ دیتے۔ جس سے میری معلومات میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا۔ مگر جب کبھی میں ان سے بالاخانے کے ماضی یا خون کے داغ کے متعلق دریافت کرتا تو وہ ہمیشہ بات ٹال جاتے۔

اور خواہ میں کتنا ہی اصرار کروں جواب نہ دیتے۔ منشی صاحب کی دو کمزوریاں میں ضرور بھانپ گیا۔ ایک تو وہ خون کے داغ کی طرف کبھی نہ آتے۔ دوسری یہ کہ شام کے بعد کسی قیمت پر بالاخانے میں کبھی اکیلے نہ بیٹھتے۔ اور مجھے بھی ہر وقت نصیحت کرتے "ڈاکٹر صاحب کوئی اور دفتر تلاش کریں۔ یہ جگہ از حد خطرناک اور بوسیدہ ہے۔ میری مانیں اور شام کے بعد کبھی یہاں نہ بیٹھیں" مگر میں ان کی باتوں پر ہنستا۔ مجھے اب اس پرانے بالاخانے سے انس ہو گیا تھا۔ اور کبھی میں نے ڈر محسوس نہ کیا۔ اس زمانے میں مجھے بے خوابی کی شکایت تھی۔ شام کے بعد اندھیرے میں مجھے دفتر میں عجیب سا سکون محسوس ہوتا۔ اور عموماً کچھ دیر کے لئے نیند بھی آجاتی۔ میں بجلی نہ جلاتا۔ کیونکہ بازار کی وجہ سے بالاخانے میں کبھی مکمل اندھیرا نہ ہوتا۔ جب مجھے نیند آجاتی تو میں خواب میں محسوس کرتا کہ ایک نوجوان اور حسین عورت جس کے جسم سے ایک عجیب سی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی میرے قریب کھڑی ہے، اُٹھتے ہی مجھے چند منٹ میں یہ خواب بھول جاتا، اور کبھی بالاخانے کے باہر مجھے کوئی خیال اس کے متعلق نہ آتا۔ جب میں باہر سے وہاں آتا تو میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا کہ میں کسی دوسری دنیا میں آگیا ہوں۔ جو وقت اور فاصلے کی پابندی سے آزاد ہے۔

مجھے اس بات کا بھی احساس ہوتا۔ کہ میں وہاں اکیلا نہیں ہوں۔ کوئی ان دیکھی نامعلوم شخصیت ہر وقت وہاں موجود رہتی ہے۔ جو گو دیکھنے میں نہیں آتی۔ مگر اس سے ایک عجیب و غریب بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ یہ پُر اسرار خوشبو کبھی بڑھ جاتی اور کبھی کم ہو جاتی۔ اور کبھی تھوڑی دیر کے لئے اچانک بالکل غائب

ہو جاتی۔ پہلے تو خیال ہوا کہ یہ خوشبو نیچے سے پھولوں کی دکانوں سے آتی ہے۔ اور ہوا کے رُخ کی وجہ سے کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ مگر بعد ازاں میں نے محسوس کیا۔ کہ یہ خوشبو پھولوں کی نہیں بلکہ نرالی ہے۔ ایک شام میرے پاس ایک بزرگ قانونی مشورہ کے لئے تشریف لائے۔ آتے ہی وہ بول اُٹھے کہ یہ خوشبو تو مشک و عنبر کی ملی جلی خوشبو معلوم ہوتی ہے۔ مجھے رفتہ رفتہ اس نامعلوم عورت سے عشق ہو گیا۔ اور جب میں دفتر میں فارغ بیٹھتا تو عموماً شعر لکھتا یا گنگناتا رہتا اس بالاخانے نے مجھ میں شاعری کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ میں اچھے خاصے عشقیہ شعر کہنے لگا۔

اپنے زمانے میں یہ بالا خانہ پشاور کے لکڑی کے کام کا شاہکار ہو گا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ کسی عاشق نے اسے بڑی محنت سے اپنی معشوقہ کے لئے بنوایا تھا۔ اور یہ ضرور کسی بے مثال محبوبہ کا مسکن تھا۔ اس کے در و دیوار اور خوشبوئے دوام اس امر کی شہادت دیتے تھے۔

ایک شام میرے سر میں قدرے درد تھا اور میں آنکھیں بند کر کے نیم خوابی کی حالت میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے آنکھ کھولی تو نگاہ سیدھی خون کے داغ پر پڑی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ وہاں تازہ خون پڑا ہے۔ میں نے ہنس کر اس نامعلوم اور پراسرار شخصیت کو مخاطب کر کے کہا:۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا!

مجھے ایسا لگا کہ کوئی ہنسا۔ اسی وقت سامنے سے ڈھکی نعل بندی کے کسی

مکان میں کسی عورت نے نہایت ہی شیریں اور درد بھری آواز سے مرزا داغ کی مشہور غزل:

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

گانی شروع کر دی

اچانک قریب کی مسجد سے شام کی اذان سنائی دی۔ اور غزالہ بھی چپ ہو گئی۔ میں اس از حد شیریں آواز کو کبھی نہ بھولوں گا۔ میں نے تمام عمر میں ایسی دردناک اور دلکش آواز نہیں سنی۔ میں نے بہتیرا دریافت کیا۔ مگر کسی نے وہ آواز نہیں سنی تھی۔ ہاں ایک بہت بوڑھے گل فروش نے مجھ سے صرف کہا "ڈاکٹر صاحب آپ اس بالاخانے میں شام کو نہ بیٹھا کریں۔ ورنہ آپ بیمار ہو جائیں گے۔" مگر اب مجھ پر اس کی نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اور میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ مجھے اب خیال ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن اسی بالاخانے کی پُر اسرار معشوقہ ضرور پردۂ راز سے خود بخود باہر آئے گی۔ مجھے اس سے کچھ بھی ڈر محسوس نہ ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کوئی مظلوم اور ستم رسیدہ رُوح ہے، جو مجھ تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتی ہے۔ مگر اس کے لئے ابھی وقت نہیں آیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی دن کوئی غیر معمولی واقع پیش نہ آیا۔ ہاں میں نے ہر روز بعد از نماز اس پُر اسرار شخصیت کی مغفرت کے لئے دعا کرنی شروع کر دی۔ اور ہر جمعرات کو کچھ نہ کچھ اس کی بخشش کے لئے خیرات بھی کرتا۔

دن کے وقت یہ بالاخانہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر نظر آتا تھا جسے دیکھ کر ذہن

بھی اتنا تھا۔ کہ اس نے بھی کبھی شان و شوکت کے دن دیکھے تھے۔ رات کی تاریکی میں اس کی سب خامیاں چھپ جاتی تھیں۔ اور خوبیاں جاگ اٹھتی تھیں۔ اس کی حالتِ زار بھی ایک بوڑھی طوائف کی طرح تھی جو رات کو اپنے چہرے کی جھریاں پوڈر اور سرخی میں چھپا کر جوان نظر آنے کی کوشش کرتی ہے اور دن بھر چھپی رہتی ہے۔

ایک دفعہ پہلی جنوری کے روز کئی دنوں کی تعطیل کے بعد میں پہلی بار بالاخانے پر آیا۔ آتے ہی میں نے محسوس کیا۔ کہ وہ خصوصی خوشبو آج کچھ معمول سے زیادہ ہے۔ منشی صاحب نے کئی لفافے میز پر رکھے ہوئے تھے اور کہا کہ کل کام بہت ہے۔ شام ہوتے ہی منشی صاحب تو چل دیئے اور میں دیر تک کام کرتا رہا۔ اس سال پشاور میں غضب کی سردی تھی۔ میرا چپڑاسی ایک شنواری قبائلی ہے۔ جس کا نام حبیب اللہ خان ہے مگر لوگ اسے "چرسی" کہتے ہیں۔ اس نے شام سے پہلے انگیٹھی میں آگ جلائی اور خود گھر چلا گیا۔ بالاخانہ خوب گرم تھا۔ باہر تھوڑی تھوڑی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ مجھے کام کرتے کرتے نیند سی آگئی۔ معلوم نہیں کہ کیسے میرا ہاتھ ٹیبل لیمپ کے بٹن پر پڑا اور وہ بجھ گیا اب میں نہیں کہہ سکتا کہ لیمپ کیسے بجھا، ہاں مجھے خوب یاد ہے کہ نیند آنے سے پہلے وہ جل رہا تھا۔ اور میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر میں یوں کرسی میں بیٹھے میز پر سر دھرے سوتا رہا۔ اچانک مجھے نیم خوابی میں قریب سے پستول کے چلنے کی آواز آئی۔ اور میں جاگ اٹھا۔ بجلی کا لیمپ بجھ چکا تھا۔ مگر انگیٹھی میں آگ خوب جل رہی تھی، جس سے مدہم سی خوشگوار روشنی پھیلی تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ سامنے والی کرسی پر

ایک نہایت حسین اور جمیل نوجوان عورت بیٹھی ہے۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اتنے لمبے تھے۔ کہ زمین سے لگ رہے تھے۔ اس مدھم روشنی میں ان کا رنگ سرخی مائل تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بہت سفید تھا۔ اور آنکھیں نہایت ہی خوبصورت اور بڑی تھیں۔ مگر ان کا رنگ سبز تھا اور وہ چمک رہی تھیں۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اور وہاں سے بہت خون نکل رہا تھا۔ اور فرش والے داغ پر گر رہا تھا۔ وہ انگلی سے سامنے والی الماری کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ہونٹوں سے آواز نہ نکلتی تھی۔ گو وہ ہل رہے تھے۔

پھر اچانک مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ مسکرائی۔ کرسی سے اٹھی، اور الماری کے پاس کھڑی ہو گئی اور اپنا داہنا ہاتھ اس پر رکھ دیا۔ بایاں ہاتھ اس نے زخم پر رکھا ہوا تھا۔ جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ گو وہ الماری کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر شیشے میں اس کا عکس نہیں تھا۔ میرا عکس اس میں بالکل صاف تھا۔ میرا ہاتھ لیمپ کے بٹن پر پڑا۔ اور بالاخانہ روشن ہو گیا۔ اور وہ اچانک غائب ہو گئی ہاں شیشے کے تڑخنے کی زور کی آواز آئی۔ اور اس میں ایک بڑا بال پڑ گیا۔ کچھ ایسا لگا کہ وہ الماری میں غائب ہو گئی۔ مگر الماری کا دروازہ ویسا ہی بند تھا۔ کمرے میں اس رات خصوصی خوشبو کی مہک معمول سے بدرجہا زیادہ تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ مگر اس میں سوائے کاغذات کے اور

اور کچھ نہ تھا۔ میں نے خون کے پرانے داغ پر انگلی لگائی۔ تو میری انگلی پر تازہ خون لگ گیا۔ میں ازحد حیران ضرور تھا۔ مگر میں نے کچھ ڈر یا خوف بالکل محسوس نہ کیا بلکہ میرے دل میں حسرت سی رہ گئی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

میں نے الماری بالکل خالی کر دی۔ مجھے اب مکمل طور پر یقین ہو گیا کہ اس لاثانی اور پُراسرار حسینہ کا راز اس الماری میں ہی مخفی ہے۔ میرے پاس اوورکوٹ میں ٹارچ تھی۔ جو میں نے فوراً نکالی۔ اور اس کی روشنی الماری میں ہر جگہ کئی دفعہ ڈالی۔ الماری کی لکڑی پر ہر طرف اندر بھی نقش و نگار تھے۔ تیسری یا چوتھی بار ایک پھول کے عین وسط میں کچھ چمکا۔ جب میں نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ لوہے کے پیچ کا سر تھا۔ میں نیچے گیا اور اپنی موٹر سے پیچ کس لے آیا۔ جس کی مدد سے اُسے کھولا۔ پیچ نکلنے سے الماری میں ایک چور دروازہ کھل گیا۔ جس کے پیچھے ایک آہنی سیف تھی، میں نے جب سیف کا دستہ گھمایا تو وہ کھل گئی۔ وہ مقفل نہ تھی۔ اس کے اندر کشمیری ساخت کا ایک نہایت ہی خوبصورت چاندی کا بکس اور ایک کالے رنگ کا ولایتی نقدی رکھنے کا بکس تھا۔ چند کاغذات اور تصویروں کے دو البم تھے۔ ان سب چیزوں سے وہی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، جس نے مجھے کئی مہینوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ میں نے سب چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ اور سیف بالکل خالی کر دی۔ چاندی کا نفیس

اور خوب صورت بکس دراصل ایک بڑا سنگھار دان تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں کئی بیش بہا چمکتے ہوئے رنگین جواہرات سے جڑاؤ زیورات تھے۔ سیف اور کیش بکس کی چابیاں بھی رکھی تھیں۔ ایک نہایت ہی خوب صورت سونے کے فریم میں لگی ہوئی اس پری رو حسینہ کی رنگین دستی تصویر تھی۔ فریم پر رنگین جواہرات میں بنا ہوا اودھ کے شاہی خاندان کا نشان (مونوگرام) تھا۔ یہ تصویر اسی حسینہ کی تھی، جسے میں نے چند منٹ ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔ تصویر میں وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ اور بال تانبے سے سرخ تھے۔ وہی بے پناہ اور لازوال حسن ہے دیکھ کر میرا دل اب تک دھڑک رہا تھا۔ میں نے تصویر اٹھا کر سامنے انگیٹھی پر کھڑی کر دی۔ تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔ اور وہ مجھے دیکھ سکے۔ میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ جیسے وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے مسکرا رہی ہو۔ اور اسے یقین ہے۔ کہ میں اس کی دولت میں بالکل خیانت نہیں کروں گا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ چاندی کے بکس میں ایک بند لفافہ پڑا تھا۔ جس پر نہایت ہی خوش خط اور نفیس عبارت میں یہ تحریر تھا:۔

"میرے اس مہربان اور کرم فرما محسن کی خدمت اقدس
میں جن کے ہاتھوں تقدیر یہ سیف پہلی بار میرے
بعد کھلوائے۔"

میں نے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط بہت لمبا تھا بلکہ یوں

کہیں کہ ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ یہاں میں صرف اس کا لبِ لباب پیش کر رہا ہوں۔ کسی فرصت کے وقت مکمل خط آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ خط یوں شروع ہوتا تھا:-

"عیش منزل
قصہ خوانی بازار
یکم جنوری ۱۸۷۵ء

"روز جزا چھپاؤں محبت کا راز کیا
سب جانتا ہے داورِ محشر کہے بغیر
وہ جان جائیں میں نہ کہوں حالِ دل مگر
ان پر ہو آشکار یہ کیوں کر کہے بغیر"

میرے مہربان و کرم فرما محسن۔ السلام علیکم۔
تقدیر نے آپکو اس سیف کے میری مرگ کے بعد پہلی بار کھولنے کے لئے چن لیا ہے۔ اس کا راز سوائے میرے کسی اور کو معلوم نہیں۔ اس سیف میں مجھ ناچیز ستم رسیدہ کی درد بھری مختصر زندگی کا راز مخفی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے میری آخری دعا ہے۔ اس کام کے لئے ایسا انسان معین کرے جو شریف اور دیانت دار ہو اور چشم بصیرت اور ہمدردی بھی رکھتا ہو۔ اور دوسری یہ دعا ہے کہ وہ ظالم انگریز کی حکومت جلد ختم کر دے اور جب اس کے کھولنے کا وقت آئے تو ان کا اقتدار ختم ہو چکا ہو۔ آج میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ یہ وقت کب آئے گا۔ ممکن ہے یہ امانت ہمیشہ کے لئے

کے لئے چھپی ہے، یا نذرِ آتش ہو جائے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ خداوند کریم مجھ مظلوم کی آخری دعا ضرور قبول فرمائیں گے۔ اور کبھی نہ کبھی یہ امانت حقدار کو پہنچ جائے گی۔ میرا اصلی نام ، . . . . . مگر پشاور میں شہزادی یا شہزادو گلے کے نام سے کافی مشہور ہوں۔ آج میری ــــ آخری سالگرہ ہے۔ میں اس وقت پورے ۹۷ سال کی ہوں۔ میں واقعی شہزادی ہوں۔ مگر اس کا علم یہاں کسی کو نہیں۔ میرے والدِ مرحوم اودھ کے شاہی خاندان کے ایک رکن تھے۔ میری ماں۔ دادی۔ اور نانی سب فرنگی النسل تھیں۔ فرانس کے انقلاب کے بعد وہاں کے چند رئیسوں نے دربار اودھ میں آکر پناہ لی۔ اور لکھنؤ میں آباد ہو گئے۔ اس میں ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی نے اودھ کے ایک شہزادے سے شادی کر لی۔ جو میرے دادا تھے۔ میری والدہ بھی فرنگی تھی۔ میرے نانا صاحب نے لکھنؤ سے چند میل دور دریا کے کنارے ایک فرنگی طرز کا محل اور باغ بنوایا تھا۔ جو اپنے وقت میں خوبصورتی کے لئے تمام اودھ میں مشہور تھا۔ میری والدہ صاحبہ میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئیں۔ میری اور میرے بھائی کی پرورش میری نانی صاحبہ نے کی۔ جو پکی مسلمان تھیں۔ مفصل حالات آپ میری ڈائری میں پائیں گے، جو کالے کیش بکس میں ہے۔ میرے والدِ مرحوم اور ہمارا سب خاندان انگریزوں کے سخت مخالف تھا۔ اس لئے غدر کی جنگ آزادی میں اگلی صفوں میں تھے۔ میرے والد صاحب شہید ہو گئے۔ لکھنؤ لینے کے بعد انگریزوں نے ہمارا محل لوٹ لیا۔ میرا بھائی اور چچا زاد پہلے تو اودھ میں کئی مہینوں

تک لڑتے رہے۔ مگر بعد ازاں وہ بیگم حضرت محل اور نوجوان بادشاہ اودھ کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ مجھے چند سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ اور کئی مصیبتوں کے بعد پشاور کے بازارِ حسن میں لے آئے۔ اور یہاں کی مشہور طوائف "اشرفی" نے مجھے خرید لیا۔ اس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا۔ مگر اس بازار میں اس نام سے مشہور تھی۔ یہاں پٹھان طوائفوں میں یہ نام بہت مقبول ہے۔ اور یہاں اس طرح کئی اشرفیاں ہیں۔ میری مالکہ بھی دراصل ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتی تھی مگر چرخ ستم گر کے ہاتھوں آخر میں اُسے یہاں ہی آکر پناہ ملی۔ یہ بازار بھی ایک طرح کی عجیب جگہ ہے۔ یورپ کی کانونٹوں کی طرح بدنصیب عورتوں کے لئے چھپنے اور گمنام زندگی بسر کرنے کے لئے اس سے ہمارے بدنصیب ملک میں موجودہ حالات میں کوئی اور بہتر ادارہ نہیں۔ ایک دفعہ جب عورت اس زندگی میں داخل ہو گئی تو پھر کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ کون تھی، اور کہاں سے آئی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے بھائی اور چچازاد دونوں کو انگریزوں کی فوجی عدالت نے ان کی غیر موجودگی میں سزائے موت کا حکم دیا تھا۔ اور ان کے سر پر بھاری انعام ہے۔ میں مظلوم اور بے کس بھی اشتہاری مجرمہ ہوں۔ اور میرے سر کا بھی انعام رکھا گیا ہے۔ مصیبتوں کی جھڑک۔ بدسلوکی، بے رحمی، بےحیائی کے بعد مجھے یہیں یہاں آکر سکون ملا۔ اشرفی مجھ پر پہلے دن سے ہی بہت مہربان تھی۔ اور مجھ سے اپنی لڑکی کی طرح شفقت کرنے لگی۔ کیونکہ اس کی اولاد نہ تھی۔ اس نے مجھے ناچ اور گانے کی تربیت دینی شروع کی۔ مگر اس کو حیرت ہوئی کہ میں پہلے سے ہی رقص و موسیقی میں ماہر تھی۔

اور ان فنونِ لطیفہ میں پشاور کے استادوں سے آگے تھی۔ اودھ کے رئیس گھرانوں میں ان فنون کی بچپن سے ہی تربیت دی جاتی ہے اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے فرنگی راگ اور رقص بھی سکھایا گیا تھا۔ میں پیانو اور سارنگی بھی خوب بجا سکتی ہوں۔ اُردو۔ انگریزی اور فارسی خوب بول اور لکھ سکتی ہوں۔ عربی اور اطالوی بھی جانتی ہوں۔ لکھنؤ میں ہمارا محل میں اس بازارِ حسن کی طرح ایک بین الاقوامی ادارہ تھا۔ میں نے اب یہاں پشتو اور پنجابی بھی سیکھ لی ہے۔ عموماً ہر طوائف چار پانچ زبانیں جانتی ہے۔ یہ بازار گرد و نواح کے ممالک کی خبروں کا بھی مرکز ہے اور یہاں کی کئی عورتیں جاسوسی کا کام بھی کرتی ہیں۔ اس لئے مجھے ہر وقت بہت محتاط رہنا پڑتا ہے کہ کہیں میرا راز افشا نہ ہو جائے۔

یہ بالاخانہ میرے لئے سیٹھ جناب لشن نے بڑی محبت اور کثیر لاگت کے بعد بنوایا۔ اور مجھے "زلف کشائی" کے موقع پر بخش دیا۔ سیٹھ صاحب پشاور کے بہت مشہور رئیس ہیں۔ اور نہایت ہی حلیم الطبع انسان واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے میری زلف کشائی بہت دھوم دھام سے کی۔ شہر کے بڑے بڑے رؤسا اور حکام وقت کو مدعو کیا۔ اور ایک شاندار دعوت دی۔ جہاں انہوں میرا رقص دیکھا اور گانا سنا۔ مجھ پر ان اصحاب نے سینکڑوں اشرفیاں برسائیں۔ "اشرفی" اور سیٹھ صاحب بہت خوش تھے۔

یہ زلف کشائی دراصل فرضی تھی مجھ پکڑنے والے اُن درندوں نے بہت ظلم اور دردناک طریقے سے میری عصمت دری کی تھی۔ مگر اس کا

علم کسی کو یہاں نہ تھا۔

اشرفی بھی میری طرح شیعہ ہے۔ میری عمر جب پندرہ سال کی تھی۔ تو وہ مجھے اپنے ساتھ محرم دکھانے لکھنؤ لے گئی۔ ہم وہاں بھی بازار حسن میں ایک مشہور طوائف جس کا نام حسن بانو ہے اور ایک راجہ صاحب کی منظور نظر ہے۔ اور "حسنو" کہلاتی ہے کے ہاں نہمان رہے۔ مجھے کوئی اب وہاں نہ پہچانتا تھا وہاں کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھے اپنے خاندان کی بربادی کے سب حالات معلوم ہوگئے۔ محرم کے دوران ایک دن چپکے سے میں اپنے محل کی طرف بھیس بدل کر چلی گئی۔ اسے پہلی بار جلا ہوا اور برباد دیکھ کر مجھے بہت رونا آیا۔ باغ اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ اصطبل کو ترمیم کرکے انگریزوں نے دفتر بنائے تھے۔ محل کا ایک حصہ جو جلنے سے بچ گیا۔ اس میں چند انگریز افسروں کے خاندان رہتے تھے۔ میں برقعہ پوش بھکارن بن کر سارا دن وہاں بھیک مانگتی رہی۔ ہمارے نوکروں اور لواحقین میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مجھے اپنی پٹھان دایا کی تلاش تھی۔ اس کا خاوند ہمارا پرانا مالی تھا۔ یہ دونوں باجوڑی تھے۔ اور انہوں نے بچپن سے ہمارے ہاں پرورش پائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی لکھنؤ میں ہیں اور اپنے وطن واپس نہیں گئے۔ جہاں ان کا گھر ہوتا تھا۔ وہ گرا کر انگریزوں نے وہاں ٹینس کھیلنے کا میدان بنا دیا تھا۔

کئی دن کی تلاش کے بعد وہ مجھے مل گئی مجھے دیکھ کر بہت گھبرائی اور کہنے لگی کہ اگر انگریزوں کو پتہ چل گیا تو مجھے فوراً پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں گے اور ساتھ ہی اس کا بھی برا حشر ہوگا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ کوئی بھی غریب

پردہ پوش بھکارن کو اب نہیں پہچان سکتا۔ میری شکل اور قد بھی بدل چکے تھے۔ صرف سبز آنکھیں میں کسی طرح نہ چھپا سکتی تھی۔

میں نے اُسے بہت اطمینان دلایا۔ ساتھ ہی بیس اشرفیاں بھی دیں۔ کیونکہ میرے سر پر بھی بہت سا انعام تھا۔ اس لئے ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال اس کے خاوند کو راز میں نہ لیا جائے۔ رفتہ رفتہ میری دایا اسے راز میں لے گئی گردش زمانہ نے مجھے بھی کافی ہوشیار کر دیا تھا۔ اور میں نے اپنی موجودہ زندگی کے متعلق اسے کچھ نہ بتایا، اور نہ ہی اپنا پتہ دیا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ چھپنے کے لئے میری موجودہ زندگی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

میرے والد صاحب نے غدر کے دوران اپنا تمام خزانہ و جواہرات قریب کے جنگل میں ایک خفیہ تہہ خانہ میں چھپا دیئے تھے۔ یہ تہہ خانہ ایک پرانی باؤلی کے نیچے ہے۔ اور اس کے چور دروازے کا کسی کو علم نہیں۔ صرف مجھے اور میرے بھائی کو انہوں نے یہ راستہ دکھایا۔ محل کے قریب دریا گومتی کے کنارے بھی خفیہ تہہ خانہ ہے۔ جس میں محل کے سب سونے چاندی کے برتن اور کچھ نقدی اور زیورات بھی چھپا دیئے تھے۔ اس کا بھی سوائے ہم تینوں کے کسی کو علم نہ تھا۔ میں نے ایک اندھیری رات کو ان جگہوں کو جا کر دیکھا۔ تو سب کچھ وہاں ویسا ہی پڑا تھا۔ جس سے مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یا تو میرا بھائی مر چکا ہے۔ یا اب تک لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ میں نے لکھنؤ میں یہ افواہ بھی سنی۔ کہ وہ نیپال سے ہمارے چچا زاد کے ساتھ افغانستان بھاگ گئے ہیں۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں حکومت نیپال انہیں انگریزوں

کے حوالے نہ کرتے۔

میں نے اپنے خفیہ خزانے سے چند جواہرات اور کچھ نقدی نکال لی۔ تاکہ میرے پاس کچھ حلال کی کمائی بھی موجود ہو۔ جو آڑے وقت کام آسکے۔

میں شاعرہ بھی ہوں۔ اور بچپن سے مجھے شاعری کا شوق ہے۔ میں صرف اُردو اور فارسی میں شعر کہتی ہوں۔ حالانکہ مجھے بچپن سے انگریزی فرانسیسی مادری زبان کی طرح آتی ہیں۔ مگر اس کا یہاں کسی کو علم نہیں۔ لکھنؤ میں ہمارے ہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور دُور دُور کے شعراء ہمارے ہاں مہمان ہوتے تھے۔ میرے والد مرحوم اور بھائی بھی اچھے خاصے شعر کہتے تھے۔ میں اپنے مہمان شاعروں سے کھلم کھلا ملتی تھی۔ اور کئی دفعہ مرزا غالب اور داغ سے بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ لکھنؤ کے شاعر تو ہر وقت تقریباً ابا جان کے پاس ہوتے تھے۔ اور مجھے خوب جانتے تھے۔ میرے کلام کا مجموعہ بھی کالے بکس میں ایک قلمی کتاب کی صورت میں موجود ہے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو اور آپ کو شاعری سے بھی لگاؤ ہو۔ تو ممکن ہے آپ میرے کلام کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں اس میں آپ ضرور کہیں نہ کہیں عریانی پائیں گے۔ جس کے لیے آپ سے دست بستہ معافی چاہتی ہوں۔ مگر کیا کروں، میں اپنے ماحول اور زندگی سے مجبور ہوں۔ میں اب شریف زادی نہیں ہوں، بلکہ پشاور کی ایک مشہور طوائف ہوں۔ میرا ضمیر اب مر چکا ہے۔ مجھے اب اس پیشے سے بھی نفرت نہیں رہی۔

مجھے کئی بار با وقار اور امیر نوجوانوں نے ازدواج کی پیش کش کی مگر میں نے ہر دفعہ انکار کیا۔ جس سے "اشرفی" کو بھی تعجب ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ہی میرا نکاح اور منگنی بڑی دھوم دھام سے میرے چچا زاد کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ مگر کم عمری کی وجہ سے رخصتی نہ ہوئی مجھے اب تک صرف ان سے ہی محبت ہے۔ میرے نکاح کے متعلق یہاں کسی کو علم نہیں۔ بدقسمتی نے ہر طرف سے مجھے گھیرا ہے۔ کوئی راستہ نجات کا سوائے موت کے نظر نہیں آتا۔

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مجھے دولت سے بالکل محبت نہیں۔ میں نے تھوڑے عرصے میں بہت دولت کمائی۔ مگر حرام کی کمائی۔ ہمیشہ کارِ خیر میں صرف کر دی۔ حال ہی میں میں نے ایک ٹھنڈا کنواں اپنے بالاخانے کی پشت میں بنوایا ہے۔ قریب ہی ایک مسجد بھی تعمیر کروائی ہے۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک باغ اور مکان بھی تعمیر کروایا ہے۔ یہاں میرا خیال تھا کہ لکھنؤ کی طرح کا ایک امام باڑہ بنواؤں۔ مگر حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اب میں نے اپنا مقبرہ وہاں تعمیر کروایا ہے۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ میری لاش کو عام قبرستان میں دفن کرنے کی شاید اجازت نہ ملے۔

میرے محسن اور کرم فرما۔ میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت لیا۔ براہِ کرم تھوڑی دیر اور بھی تحمل فرما دیں۔ تاکہ میں آپ کو بتا سکوں کہ میری موت کہاں اور کیسے آ رہی ہے۔

اس بازار کے رواج کے مطابق ہر شام میرے ہاں ناچ اور گانے کی محفل ہوتی ہے رواج کے مطابق اس محفل میں ہر خاص و عام آ سکتا ہے۔ مگر وہ اس قابل ہو کہ کم از کم ایک دفعہ مجھے "ویل" دے سکے۔ میری "ویل" ایک اشرفی ہے۔ بالاخانے کے نیچے دو مضبوط اور توانا دربان ہر وقت کھڑے رہتے ہیں۔ جو کبھی کسی مشکوک آدمی کو اوپر چڑھنے نہیں دیتے۔ صرف رؤسا اور حکام وقت ہی عموماً میری محفل میں شریک ہوتے ہیں جب محفل ختم ہوتی ہے تو کسی کو حق نہیں کہ وہ ٹھہرنے پر مصر ہو۔ جو رات میرے ساتھ گزارنا چاہے وہ پہلے سے دن کو اشرفی سے میری موجودگی میں طے کرے گا۔ کئی دفعہ اگر میں کسی وجہ سے نہ چاہوں تو میں دوران بات چیت آنکھیں نیچی کر دیتی ہوں۔ جس سے اشرفی سمجھ جاتی ہے اور وہ اس مرد سے اتنی زیادہ رقم مانگتی ہے۔ کہ وہ ادا نہ کر سکتا ہو۔ اس بازار کے دیرینہ رواج کے مطابق ہمیں سوائے بیماری کے بلاوجہ انکار کرنے کی اجازت نہیں۔

کل رات میری محفل میں دو نوجوان اجنبی آئے۔ انہوں نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ ایک نے سیاہ عینک شاید آنکھیں چھپانے کے لئے پہنی ہوئی تھی۔ جب وہ کمرے داخل ہوئے تو میں ناچ رہی تھی۔ میں مہمانوں کے لئے ساقی بھی بنی ہوئی تھی۔ سیٹھ صاحب کئی رؤسائے شہر و اعلیٰ حکام وہاں موجود تھے۔ چائے پان اور شراب کے دور چل رہے تھے۔ اور مجھ پر اشرفیاں برس رہی تھیں۔ میں نے اجنبیوں کی طرف پورا دیکھا ہی نہ تھا۔ کہ میرا خون جوش میں آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے ایک میرا خاوند اور دوسرا میرا گمشدہ بھائی ہے۔ وہ غدر کے اشتہاری ملزم تھے۔ ان کے سر پر سرکار انگریزی نے کئی ہزار روپے کا انعام رکھا تھا۔ میری مجلس

میں سرکار کے کئی اعلیٰ افسر بھی تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔ اور انہوں نے دیدہ دانستہ میری تلاش میں یوں کیا۔ وہ چپکے سے وہاں آکر بیٹھ گئے اور آتے ہی مجھ پر اشرفیاں برسانی شروع کر دیں۔ حسن اتفاق سے اسی دن میں نے ایک غزل اپنے حالِ زار پر لکھی تھی۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ اس محفل کے لئے کتنی برمحل ثابت ہوگی۔

بے ساختہ میں نے وہ گانی شروع کر دی اس غزل سے مجلس پر کچھ سناٹا سا چھا گیا۔ جب عینک والے اجنبی نے فرمائش کی کہ میں مرزا داغ کی مشہور غزل

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے

اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

ان کو گا کر سناؤں۔ تو مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہ اجنبی میرا عزیز بھائی ہے۔ یہ غزل ان کو از حد پسند تھی۔ اور میں یہ ہمیشہ بچپن میں صرف ان کی فرمائش اور اصرار پر ہی گایا کرتی تھی۔ میرا اور ان کا عہد تھا کہ یہ غزل میں صرف ان کے لئے ہی مخصوص رکھوں گی اور ان کی اجازت کے بغیر کبھی نہ گاؤں گی۔ میں نے ان سے مخاطب کر کے عرض کی:۔

"جناب میں آپ کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔"

تو وہ بولے۔

"کیوں جناب کیا آپ کو یہ غزل اب یاد نہیں؟"

"جی یاد تو ہے۔ مگر میں نے دل سے عہد کیا ہے۔ کہ کبھی یہ غزل اب نہ گاؤں گی۔"

"جناب کس لئے" یہ کہہ کر انھوں نے ایک لمحے کے لئے عینک اتار دی۔ میری سبز آنکھیں ۱۸ سال کے بعد پہلی بار ان کی سبز آنکھوں سے دو چار ہوئیں۔ میری آنکھوں میں اس وقت آنسو تھے۔ ان کی آنکھوں میں سخت حقارت و نفرت تھی۔ میں کانپ پڑی۔ مجھے اس وقت یقین ہو گیا۔ کہ وہ دونوں مجھے قتل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس وقت ان دونوں کی جان میرے ہاتھوں میں تھی۔ میرے اشارے پر وہ دونوں اسی وقت پھانسی کے تختے پر لٹک جاتے۔ مگر اسی وقت میں نے فیصلہ کیا۔ کہ اپنی جان خود ان پر قربان کر دوں گی اور انہیں ہاتھ اٹھانے کا موقعہ نہیں دوں گی۔

وہ پھر بولے

"جناب اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں۔"

تمام حاضرین نے بھی اصرار کیا۔ میں بھائی کے حکم پر رقص الموت کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اور ایسی ناچی اور گائی۔ کہ پہلے کبھی نہ ایسا ناچا نہ ایسا گایا۔ حاضرین نے مجھ پر اتنی اشرفیاں برسائیں کہ "اشرفی" اور میرے سازوالے ہمیشہ کے لئے مالدار ہو گئے۔ آخر جب میں تھک کر چور ہو گئی تو مجھے غش آگیا جس سے میں گر پڑی۔ اور مجلس اچانک برخاست ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو سب لوگ جا چکے تھے۔ اور میں دوسرے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ سیٹھ صاحب اور اشرفی میرے سرہانے میرا سر دبا رہے تھے۔ جب سیٹھ صاحب تشریف لے گئے تو اشرفی نے مجھے مخاطب ہو کر کہا "کہ اجنبی نوجوان کل دن کو پھر آئیں گے۔" میں اس خبر سے چونک پڑی۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔

صبح کو میرے بھائی اور شوہر آئے۔ اور سیدھے اشرفی کے پاس گئے۔ اور عام گاہکوں کی طرح اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ میرے سینے میں اس وقت ایک طوفان برپا تھا۔ میں ان کو اپنا منہ دکھانے کے ہرگز قابل نہ تھی۔ انہوں نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھ سے یہ دردناک منظر نہ دیکھا گیا اور میں نے شدتِ اضطراب کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کر دیں۔ اشرفی سمجھی کہ یہ انکار کا اشارہ ہے۔ اس نے میرے شوہر سے کہا۔

"شہزادی ایک رات کے لئے ۱۰۰ اشرفیاں لیتی ہے۔ میرے شوہر نے ۱۰۰ اشرفیاں گن کر اشرفی کے حوالے کیں۔ اور اٹھ کر میری طرف حقارت سے اشارہ کیا۔" میں ۹ بجے شام کو آؤں گا۔ امید ہے کہ تم اس وقت اکیلی ہو گی" اور یہ کہہ کر دونوں چل دیئے۔

اس وقت میری حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ شب عروس جس کا ہمیشہ آغازِ جوانی میں خواب دیکھا کرتی تھی۔ آج اٹھارہ سال کے بعد ممکن ہوئی۔ مگر اس زمانے میں ہماری دنیا ہی پلٹ چکی تھی۔ میرے دولہا جو شاہی خاندان کے ممتاز فرد تھے آج اشتہاری مجرم ہیں۔ اور کم بخت انگریزوں کی فوجی عدالت نے ان کو سزائے موت دی تھی۔ اور وہ کئی سالوں سے مفرور تھے۔ میں شہزادی سے مکمل طور پر ایک حقیر بازاری عورت بن چکی تھی۔ میں نے اس وقت فیصلہ کیا کہ شام کو جب وہ تشریف لائیں گے، تو دنیا سے رخصت ہو چکی ہوں گی ہائے میری قسمت

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

میں نے سارا دن عبادت اور نہانے دھونے میں گذارا۔ کئی دفعہ نہائی اور بار بار گسل کیا اور پھر نہائی مگر ضمیر پر گناہوں کے دھبّے کبھی دھونے سے چھُٹتے ہیں؟ ان کو تو صرف اللہ کی بخشش ہی مٹا سکتی ہے۔ میرے کرم فرما قریباً سات بجے آنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے اپنے آخری سفر کی تیاری کرنی ہے۔ اس لئے وقت بہت کم ہے اور میں سیدھی التجا کی طرف آتی ہوں۔ میری ایک لڑکی ہے جو میری دایا کے پاس باجوڑ میں ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں میں کئی بار لکھنؤ گئی اور وہ جواہرات جو صرف میرے ذاتی تھے، اور کچھ نقدی ہر دفعہ لے آئی۔ ایک دفعہ جب میں حاملہ تھی۔ تو وہاں گئی۔ اور میری لڑکی پیدا ہوئی۔ میں نے اُسے اپنی دایا کے حوالے کر دیا۔ اب اس کا خاوند بھی راز میں ہے۔ میں نے ان کو بہت سی رقم اس پرورش کے لئے دی ہے۔ اب وہ اپنے وطن باجوڑ میں آباد ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے . . . . . میری لڑکی کی پیدائش کے متعلق یہاں کسی کو علم نہیں۔ نہ ہی میری دایا یا اس کے خاوند کو پتہ ہے کہ میں پشاور کے بازارِ حسن کی زینت ہوں۔ اشرفی کو بھی میری لڑکی کے متعلق کچھ علم نہیں۔ یہ جواہرات اور دو ہزار اشرفی جو آپ کالے بکس میں پائیں گے میری لڑکی کے لئے ہیں۔ آپ اس میں سے جتنا معاوضہ اپنی تکلیف کے لئے مناسب سمجھیں لے سکتے ہیں۔ ہاں جواہرات میں ایک لاجواب نیلم کی انگوٹھی پائیں گے۔ یہ نیلم تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ انگوٹھی میرے چچا صاحب مرحوم نے پیرس میں خریدی تھی۔ اور مجھے منگنی کے موقعہ پر دی تھی۔ جب سے یہ نیلم ہمارے گھر آیا۔ اس دن سے ہماری بربادی شروع ہوئی ہے۔ یورپ میں

اس نے کئی خاندان تباہ کئے ہیں۔ آپ اس کے متعلق مزید معلومات میری ڈائری میں پا جائیں گے۔ مگر اس نیلم میں بے حد کشش ہے۔ اس سے مجھے بے حد محبت ہے کئی دفعہ میں نے اسے دریا میں پھینکنے کا ارادہ کیا۔ مگر کسی نامعلوم کشش نے میرا ہاتھ آخری وقت روک لیا۔ آپ یہ انگوٹھی لے سکتے ہیں۔ میں ہرگز نہیں، چاہتی کہ میری لڑکی کی نظر کبھی اس پر پڑے۔ یہ اب آپ کی ہے۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے اپنے پاس نہ رکھیں اور فوراً فروخت کر ڈالیں۔ یہ بہت قیمتی ہے لکھنؤ میں ایک جوہری نے اس کی قیمت پانچ ہزار اشرفی لگائی تھی۔ مگر اس کی قیمت بہت زیادہ ہے مجھے اس وقت سمجھ نہیں آتا۔ کہ یہ چیزیں میں لڑکی تک کیسے پہنچاؤں۔ اس لئے میں انہیں قسمت پر چھوڑ دیتی ہوں مجھے قبر میں اس وقت تک چین نہ آئیگا، جب تک یہ امانت میری لڑکی تک نہ پہنچ جائے۔ آپ کو قسمت نے اب ان کا امین بنایا ہے۔ خدا کے واسطے میری آخری وصیت پر عمل فرما کر ثواب حاصل کریں۔ ورنہ قیامت کے دن میرا ہاتھ آپ کے گریبان میں ہوگا۔ خدا حافظ۔

آپ کی تابعدار

بدنصیب شہزادی

خط پڑھ کر میں بہت دیر تک روتا رہا۔ رات بہت گزر چکی تھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ سردی کی وجہ سے قصہ خوانی بازار بھی سرد پڑا تھا۔ میں نے سب چیزوں کو ویسے ہی سیف میں پھر رکھدیا۔ سیف میں چابی لگا کر چوبی دروازہ بھی بند کر دیا۔ صرف نیلم کی انگوٹھی اب بجلی کی روشنی میں میری انگلی پر چمک رہی تھی

جب میں بالاخانہ بند کر کے نیچے اترا۔ تو ٹھنڈ کی وجہ سے موٹر مشکل سے سٹارٹ ہوئی۔ راستے میں ایک دوکان پر گرم چائے پی۔ میرے خیالات اس وقت از حد پریشان تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آج بھی یکم جنوری کی رات تھی اور شہزادی کی مرگ کو پورے ۵۰ سال گزر چکے تھے۔ اگر اس کی لڑکی زندہ ہے تو اس کی عمر اب ۸۰ سال ہو گی۔ اس کا بھائی اور خاوند یقیناً فوت ہو چکے ہوں گے۔ ہاں شہزادی کی ایک مراد تو اب بر آئی تھی۔ انگریزوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور پاکستان اور ہندوستان آزاد ہو چکے تھے۔ میں چائے پی رہا تھا۔ کہ میں نے یکایک محسوس کیا کہ لوگوں کی نظریں نیلم کی انگوٹھی پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ بجلی کی روشنی میں بہت چمک رہی تھی۔ نیلم کے چاروں طرف ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ایک شناسائی نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب خدا کرے کہ یہ نیلم آپ کو مبارک ہو۔ نیلم بھی عجیب چیز ہے۔ کسی کے لئے تو یہ بہت مبارک اور کسی کے لئے نہایت ہی منحوس ثابت ہوتا ہے۔" میں نے کہا آمین۔ آپ کی زبان مبارک ہو۔ مگر میرا دل پہلی دفعہ خوف سے کانپا۔ نیلم کی نحوست کی داستان تو ابھی پڑھ کر آیا تھا۔ اور اس کی یاد تازہ تھی۔ خدا کرے کہ اب اس کا مبارک دور شروع ہو۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی میں اس باغ میں گیا۔ جہاں شہزادی نے اپنے مزار کا پتہ اپنے خط میں دیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ مزار کے قریب اس نے چنار کا ایک درخت لگایا ہے۔ جب میں وہاں گیا تو چنار کا درخت اب بہت بڑھ گیا تھا۔ مگر سردی میں اس کے پتے بالکل جھڑ چکے تھے۔ مزار کے قریب ایک خوب صورت چھوٹی سی مسجد تھی۔ باغ میں ایک مکان بھی تھا۔

جو آباد معلوم ہو رہا تھا۔ مزار سنگِ مرمر کا تھا۔ اس کے چاروں طرف رانگ دار جھنڈے لٹک رہے تھے۔ اور کچھ پھول پڑے تھے۔ سنگِ مرمر پر یہ الفاظ کندہ تھے اور یہ شعر بھی تھا:-

شہزادی
تاریخ وفات یکم جنوری ۱۸۵۷ء
بے کس رہیں گے حشر میں کب مجرمانِ عشق
رحمت کہے گی ہم ہیں گنہگار کی طرف

میں نے فاتحہ پڑھی اور دیر تک وہاں بیٹھ کر شہزادی کی مغفرت کے لئے دعا کرتا رہا۔ اور اللہ تعالےٰ سے یہ بھی دعا مانگی کہ وہ امداد فرمائے کہ میں امانت حقدار تک پہنچا دوں۔ جب میں اٹھا تو سامنے ایک عورت قریباً ۵۰ سال کی کھڑی تھی۔ میں نے اس سے سلسلہ سوال وجواب یوں شروع کیا:-

یہ مزار کس کا ہے؟

شہید کا۔

کِس شہید کا؟

شہزادی کا!

یہ کہاں کی شہزادی تھی؟

"اودھ کی"

وہ کیسے شہید ہوئی؟

"وہ انگریز کے ہاتھوں"

کہاں؟

"پشاور میں"

یہاں کیسے؟

"شہزادی کے والد اور چچا غدر کی جنگ آزادی میں شہید ہوئے۔ اور اس کا خاندان تباہ ہوا۔ اور محل جلا دیا گیا۔ اس کو آخر پشاور میں پناہ ملی۔ اور وہ یہاں چھپی رہی۔ مگر انگریز نے آخر اس کا کھوج لگا کر ایک رات اسے مروا ڈالا۔"

آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

"وہ میری نانی تھی۔"

آپ کی والدہ کہاں ہے؟

"وہ فوت ہو چکی ہیں۔"

آپ کا کوئی بھائی بہن ہے؟

"نہیں اکیلی ہوں۔"

کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

"جی ہاں مگر میرا خاوند اس وقت گاؤں میں ہے۔"

وہ کہاں ہے؟

"بابوڑ میں۔"

آپ کی کوئی اولاد ہے؟

"جی ہاں، میری ایک لڑکی ہے"۔

کیا میں اُن سے مل سکتا ہوں؟

عورت کی نظر نیلم کی انگوٹھی پر پڑی۔ پھر اس نے میرے لباس اور موٹر کی طرف دیکھا جو قریب ہی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور وہ مکان کی طرف چل پڑی۔ اور پکارنا شروع کیا۔

"شہزادی، شہزادی اِدھر آؤ"۔

عورت تو چلی گئی مگر ایک دو منٹ بعد ایک نوجوان بیس سالہ لڑکی نے آکر مجھے سلام کیا۔

میرے سامنے وہی حسینہ جسے میں نے رات الماری کے پاس کھڑا دیکھا تھا۔ مسکرا رہی تھی۔ وہی سبز آنکھیں۔ وہی سرخی مائل گھنگریالے بال، وہی گورا رنگ، وہی سڈول جسم، وہی بے پناہ دلربا حسن، میں نے دیکھا کہ اس کی نظریں نیلم کی انگوٹھی پر جمی ہوئی ہیں۔ میں نے انگوٹھی والا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ بے دھڑک پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے دبایا۔

"کتنی خوبصورت انگوٹھی ہے"!

میں نے انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی پر پہنا دی۔

"کیا یہ اب میری ہے"!

میں نے کہا جی ہاں۔ یہ انگوٹھی اور بہت سے جواہرات.... سب آپکے ہیں۔

وہ مسکرائی اور میری طرف آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی پرانی ازلی کہانی تھی۔ میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور کہا .... حق بحقدار رسید۔



☆ ''شفیق الرحمان موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کا بانی ہے۔''

— ادب لطیف

☆ ''شفیق الرحمان صاحب کو کون نہیں جانتا۔ شاید وہ نہ جانتے ہوں جو مسکرانا نہیں جانتے۔''

— اردو ڈائجسٹ

☆ ''شفیق الرحمان کے شوخ و شنگ قلم سے نکلے ہوئے ہنستے، مسکراتے بلکہ قہقہے لگاتے افسانوں اور خاکوں کے مجموعے:

لہریں	میری لائبریری میں	2.50
	سفید کاغذ مجلد	5.00
پرواز	میری لائبریری میں	2.50
	سفید کاغذ مجلد	5.00
حماقتیں	میری لائبریری میں	4.50
	سفید کاغذ مجلد	7.00
مزید حماقتیں	میری لائبریری میں	2.50
	سفید کاغذ مجلد	8.00

مکتبہ میری لائبریری لاہور-۲